मासिक [illegible] पत्रिका

मुअल्लिम-ए-उर्दू

معلم اردو

لکھنؤ

MARCH
1983

ماہنامہ

مُعلّم اردو

لکھنؤ

منیجنگ ایڈیٹر

افضال احمد انصاری

ایڈیٹر

اظہار احمد

تاریخ اشاعت

مارچ ۱۹۸۳ء

جلد (۲)

شمارہ (۴)

قیمت

سالانہ: ۱۵ روپے

فی پرچہ: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

جرنلسٹس پبلیکیشنس۔ ۵۰، رامادھین سنگھ روڈ لکھنؤ ۷

اظہار احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و مالک نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر ۱۹/۵۰ رامادھین سنگھ روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اِس شُمارہ میں

اداریہ:

مضامین:

افسانے:

مزاحیہ:

منظومات:

ضمیمہ:

اداریہ:

دو باتیں

گذشتہ ۱۸ فروری کو صدر جمہوریہ ہند نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جو خطبہ دیا اس میں میرٹھ، بڑودہ، حیدرآباد، الٰہی کے شرمناک فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا صرف یہی نہیں بلکہ ملک میں آج فرقہ واریت اور علاقائیت کا جو رجحان بڑھ رہا ہے اور اسی کے ساتھ ملک کے سامنے جو دیگر اہم و پیچیدہ سوالات آج درپیش ہیں ان سے مرکزی سرکار کیسے نپٹے گی اس کی جانب بھی کوئی واضح نشاندہی اس خطبہ میں ندارت ہے۔

حالانکہ اس کے لیے صدر جمہوریہ کو مورد الزام نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ انھوں نے تو محض اس ملک کے حقیقی حکمرانوں، "بیوروکریٹس" کا ، اور مسز گاندھی کی کابینہ کا رسمی طور پر پاس شدہ "نوٹ" اپنی زبان (ہندی) میں پڑھ دیا۔ حالانکہ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ابتک تو "بیورو کریٹس" کی زبان (انگریزی) میں ہی یہ خطبہ پڑھا جاتا تھا، اور ہندی ترجمہ پڑھنے کا کام عموماً نائب صدر جمہوریہ کو ادا کرنا پڑتا تھا، اس بار معاملہ الٹ گیا، اور نائب صدر جمہوریہ مسٹر ہدایت اللہ کو اصل خطبہ بعد میں پڑھنا پڑا اور اس کا ترجمہ گیانی جی کو پہلے۔

آج جبکہ آسام جل رہا ہے ہزاروں معصوم شہری قتل کیے جا رہے ہیں، جلائے جارہے ہیں، انسانیت سوز مظالم انتہا کو پہونچ گئے ہیں، گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر آگ کی نذر کیے جا رہے ہیں [illegible] کا بھی رسمی ذکر ہی اس خطبہ میں کیا گیا ہے، ہماری مرکزی سرکار اس سوال کو کیسے حل کرے گی اس کی کوئی واضح

نشاندہی تو دور رہی کوئی مبہم اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔
کچھ مخالف پارٹیوں نے بجٹ سیشن کے اس مشترکہ افتتاحی، اجلاس کا بائیکاٹ کیا یہ حزب مخالف ان حالات کیلئے ذمہ دار نہیں ہے؟ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تنگ نظر آسامیوں کی لگائی گئی آگ کو پٹرول وہی فراہم کررہا ہے تو بیجا نہ ہوگا اس کی ساکھ کا بھی یہ عالم ہے کہ علاقائی پارٹیوں کے سامنے کہیں ٹک نہیں پا رہا ہے، کرناٹک اور آندھرا میں جس طرح سبھی قومی پارٹیوں کو منھ کی کھانی پڑی وہ ان کے لیے شرمناک ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہے لیکن اس سے بھی وہ کوئی سبق لے سکیں اس کی کوئی اُمید نہیں ہے۔
اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہوگی کہ آگ لگی ہے شمال (آسام) میں اور چندر شیکھر کی پد یاترا ہو رہی ہے جنوب میں اور جمعیۃ العلماء تحریک چلانے جا رہا ہے دہلی میں (اب یہ تحریک بھی واپس لے لی گئی)
اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں ہے کہ آسام کا مسئلہ بھی مکمل طور پر لسانی و مذہبی مسئلہ بن چکا ہے۔ آسام آسامیوں کے لیے اور پنجاب پنجابیوں کے لیے ہے یہ بات اگر مان لی جائے تو ملک کا شیرازہ بکھرتے دیر نہ لگے گی، اور اسی لیے مسز گاندھی ان مسائل کا جس دلیری سے مقابلہ کر رہی ہیں وہ قابل تحسین ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب ان پر اتنے رکیک حملے ہونے لگے ہیں کہ وہ "جے ہند" کے بجائے "خدا حافظ" کہتی ہیں۔
ان پر آج چوطرفہ یلغار ہے اور اس سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ کچھ انقلابی اقدامات کریں۔
پچھلے دنوں ملک کے سیاسی حالات نے جو کروٹیں بدلی ہیں ان سے مسز گاندھی میں تذبذب بڑھا ہے اور اسی کے ساتھ مسائل پر ان کی گرفت ڈھیلی بھی پڑی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کو درپیش مسائل پر پوری توانائی صرف کی جائے، وقتی اور جزوی طور پر تعریف و تحسین حاصل کرنیوالے کام، پروگرام اور ناٹک بند کیے جائیں۔ علاقائیت، فرقہ پرستی، لسانی عصبیت کے ساتھ ہی کرپشن سے نپٹنے کی ایک واضح پالیسی کا اعلان کرکے اس پر سختی کے ساتھ عملدرآمد کیا جائے۔
اگر ایسا نہیں کیا گیا اور مسز گاندھی نے بر وقت بگڑتے ہوئے حالات پر سمجھداری سے قابو حاصل کرنیکی کوشش نہیں کی تو اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ ••

اظہر احمد

شہنشاہ مرزا :-

اردو ناول کی تنقیدی تاریخ

ایک تجزیہ

ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب نے اس کتاب میں ناول کی پوری تاریخ پر نظر ڈالی ہے لیکن بقول ڈاکٹر ہاشمی "پیش نظر تصنیف اردو ناول نگاری کے صرف بہترین سرمایہ کا تنقیدی جائزہ ہے۔" اور اس کتاب کے دیباچہ میں ڈاکٹر فاروقی صاحب نے یہ بات بہت صاف صاف لکھ دی ہے کہ اُن کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ لوگ اُن کے فیصلوں کو اٹل مان لیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جس قدر لوگ ان سے اختلاف کریں گے اتنا ہی اُن کے اور ان کے مخالفین کے حق میں مفید ہوگا۔ چنانچہ اسی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھ جیسا ادب کا معمولی طالب علم ڈاکٹر فاروقی جیسے عالم کے خیالات سے اختلاف کرنے کی ہمت کر رہا ہے

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی صاحب کو جو اُردو ناول سے دلچسپی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یقیناً وہ اس سلسلہ میں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے ناقدین کے سنجیدہ طبقے میں اُردو ناول سے دلچسپی کا ذوق پیدا کیا" اردو ناول کی تنقیدی تاریخ" ایک ایسی کتاب ہے جس میں موصوف نے نذیر احمد سے لیکر موجودہ دور تک کے تمام اہم ناول نگاروں کا تنقیدی مطالعہ بہت محنت کے ساتھ کیا ہے یقیناً ہم ڈاکٹر فاروقی کی محنت کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتے۔ اُنھوں نے جو نظریے قائم کیے ہیں اُن سے اختلاف کی پوری گنجائش خود اُنھوں نے ہی رکھ چھوڑی ہے لیکن اُن کی محنت کو سراہنا ہمارا پہلا فرض ہے۔

اس مختصر کتاب کو فاروقی صاحب نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصہ میں "اُردو ناول کے اولین نقوش" کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے جس میں نذیر احمد سے قبل داستانوی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں انشاء اللہ خاں کی "رانی کیتکی کی کہانی" کے متعلق جو مختصر اظہار خیال کیا گیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ دوسرے مضمون میں نذیر احمد کی ناول نگاری سے بحث ہے، فاروقی صاحب نے نذیر احمد کو ناول نگار نہ مان کر اُن کی ناولوں کو تمثیلی افسانے کہا ہے۔ جس جرأت سے فاروقی صاحب نے نذیر احمد کو ناول نگار ماننے سے انکار کیا وہ یقیناً قابل تعریف ہے کیونکہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب تو کریم الدین کی "خط تقدیر" تک کو ناول کہنے پر تلے بیٹھے ہیں، ظاہر ہے کہ

"خط تقدیر" کو ناول کہنا ایک زبردستی کی کوشش ہے لیکن اُس کے ساتھ نذیر احمد کی ناولوں کو ناولیں نہ کہنا بھی بڑا عجیب لگتا ہے۔

نذیر احمد کی ناولوں کو ناول ماننے سے انکار کرتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے لکھا ہے کہ:

"ان تصانیف کے داخلی پہلو پر نظر کرتے ہوئے ان کو ناولیں بھی کہہ دیا گیا ہے اور یہ غلطی عام ہو گئی ہے کہ مولانا اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ اُنکی تصانیف اس قدر کھلی ہوئی تمثیلیں ہیں کہ ان کو ناول کہنے والوں پر تعجب ہوتا ہے، یہ بنیادی طور پر تمثیلیں ہی ہیں اور ناول سے اُسی حد تک ملتی ہوئی بھی ہیں جس حد تک طویل نثری تمثیلوں کو ہونا چاہیئے۔" (ص ۲۶)

اردو میں طویل نثری تمثیلیں کس نے لکھی ہیں؟ وجہی کی "سب رس" اور کریم الدین کی "خط تقدیر" کے علاوہ اور کونسی نثری تمثیل لکھی گئی ہے؟ یا بعد میں محمد حسین آزاد نے "نیرنگ خیال" لکھا لیکن "سب رس" اور "خط تقدیر" میں اور نذیر احمد کی ناولوں میں بہت فرق ہے، ظاہر ہے کہ اُردو کی پہلی ناول، ناول کی ٹیکنک کو سامنے رکھ کر ہرگز نہیں لکھی گئی تھی۔ محض اس جرم میں کہ نذیر احمد ٹیکنک سے ناواقف تھے اُنہیں ناول نگار ماننے سے انکار کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر ہمیں ڈاکٹر فاروقی یہ بات وضاحت سے سمجھا سکتے کہ "مراۃ العروس" کے بھی کردار تمثیلی ہیں تو ہم یقیناً ان کی بات مان لیتے کہ نذیر احمد نے محض طویل تمثیلی افسانے لکھے ہیں ناول نہیں لکھی ہے، لیکن ڈاکٹر فاروقی ہمیں یہ سمجھانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ وہ مغربی ٹیکنک کے اُصولوں کو سامنے رکھ کر نذیر احمد کی ناولوں کا جائزہ لے رہے ہیں جس میں فاروقی صاحب کی غلطی ہے ورنہ دراصل "مراۃ العروس" ایک ناول ہی ہے، اُس میں کردار، نظریئے حیات غرض ناول کے سبھی اجزا پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد "اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ" کا دوسرا حصّہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ میں ڈاکٹر فاروقی نے اُردو ناول کا ابتدائی دور ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۵ء تک مقرر کیا ہے، اس دور میں اُنھوں نے خاص طور پر سرشار، شرر، اور رسوا کے فن سے بحث کی ہے اور سب پر الگ الگ مضامین لکھے ہیں یہ تینوں مضامین کافی فکر انگیز ہیں۔ ڈاکٹر فاروقی نے اپنی رائے قائم کرنے میں بہت آزادی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا ہے جہاں تک شرر اور سرشار پر لکھے گئے مضامین کا سوال ہے تجزیہ اور تنقید کے لحاظ سے یہ بھرپور ہیں اور فاروقی صاحب نے ان مضامین میں شرر اور سرشار سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے

کتاب کے دوسرے حصہ کا تیسرا باب "رسوا" اور ناول نگاری کا فن" کے عنوان سے لکھا گیا ہے اور میرے خیال سے مرزا رسوا کے فن پر لکھا گیا یہ مضمون رسوا کے فن ناول نگاری سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ناول نگاری سے شوق رکھنے والوں کو ڈاکٹر فاروقی نے یہ مشورہ بہت صحیح دیا ہے۔

"اردو میں جو کوئی بھی ناول نگاری کرے اُس کے لیے سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ امراؤ جان ادا کو پڑھے اور اس کے فن کا اثر لینا سیکھے۔"

میرے خیال سے اس کتاب کا سب سے اہم حصہ یہی باب ہے ڈاکٹر احسن فاروقی نے رسوا کے فن کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اُس کے واقعی مستحق بھی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر فاروقی ہمیں یہ بتانے سے قاصر نظر آتے ہیں کہ آخر رسوا کی ناول "امراؤ جان ادا" میں مصنف کا نظریۂ حیات کیا ہے؟

وہ خود رسوا کو اس ناول کا ہیرو اور امراؤ جان کو اس کی ہیروئن مانتے ہیں اور میرے خیال سے یہیں پر ڈاکٹر فاروقی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دراصل دیکھا جائے تو یہ ناول محض ایک طوائف کی زندگی کے حالات پیش کرنے کے مقصد سے نہیں لکھی گئی ہے۔ بلکہ اس کے پردے میں مصنف ہم سے کچھ اور ہی کہنا چاہتا ہے۔ دراصل مرزا رسوا لکھنؤ کے اس نشاط انگیز نوابی ماحول کے کھوکھلے پن کو اس کے تمام المناک پہلوؤں کے ساتھ واضح کرنا چاہتے تھے۔ طوائف اس انحطاط پذیر معاشرے کا ایک ایسا جز تھی جو اس ماحول کے تمام کھوکھلے پن کو اپنے میں سموئے ہوئے تھی اسی لیے انھوں نے ایک طوائف کی کہانی کے پردے میں بہت ہی فنکاری کے ساتھ اس ماحول کا کھوکھلا پن ظاہر کر دیا۔ اس ناول کے ہیرو اور ہیروئن کی تلاش فضول ہے کیونکہ مرزا رسوا نے اس معاشرے کی بھرپور نمائندگی کے لیے میلوں ٹھیلوں اور بازاروں اور گھروں میں نظر آنے والے مختلف انسانوں کو اپنی ناول میں ہیرو اور ہیروئن بنا کر پیش کیا ہے

اس ابتدائی دور کے مطالعہ تک ڈاکٹر فاروقی کا اپنے موضوع پر بھرپور عبور نظر آتا ہے اور وہ موضوع کو اپنی گرفت سے جانے نہیں دیتے، لیکن اس کے بعد کتاب کے تیسرے حصے میں ان کی گرفت اپنے موضوع پر بہت کمزور ہو جاتی ہے، شاید اس لیے کہ بعد کی ناولوں کا انھوں نے اس گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا جس کی وہ حقدار تھیں۔

ناول کا یہ تیسرا حصہ "دور انحطاط" کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی تقسیم ڈاکٹر فاروقی نے ۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۶۲ء تک کی ہے اور اس حصہ کا پہلا باب اس چونکا دینے والے جملے سے شروع ہوتا ہے۔

"اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ
اردو ناول اپنی ارتقار کی ایک منزل پوری کرنے
سے پہلے ہی ختم ہو گیا"

اس جملے کو پڑھ کر مجھے کلیم الدین کا وہ اختلافی جملہ یاد آ گیا جو انھوں نے اپنی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" کے شروع میں لکھا ہے کہ اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یہ معشوق کی موہوم کمر کی طرح ہے یا اقلیدس کی شکل۔ خیر کلیم الدین صاحب کا وہ جملہ تو تنقید کی دنیا میں کافی وزن رکھتا ہے لیکن ڈاکٹر فاروقی صاحب کا یہ فرمانا کہ اردو ناول اپنی ارتقا کی ایک منزل پوری کرنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ کیا پریم چند، عصمت چغتائی عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین اور جمیلہ ہاشمی نے اردو ناول میں مستقل اضافہ نہیں کیا ہے کیا "گئو دان" اور "ٹیڑھی لکیر" اور "ایسی بلندی ایسی پستی" "اداس نسلیں" اور "تلاش بہاراں" پڑھنے کے بعد یہ احساس نہیں ہوتا کہ اردو ناول ارتقار کی منزل برابر طے کر رہی ہے؟ اور اس کی وسعت میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کیا آج کے جدید شہر میں بیٹھ کر ہمارا یہ فیصلہ کرنا مناسب ہے کہ "آگ کا دریا" کے مقابلے میں "امراؤ جان ادا" اس لیے بہترین ناول ہے کیوں کہ ٹیکنک کے لحاظ سے وہ ایک مکمل ناول کا احساس دلاتی ہے، "امراؤ جان ادا" لکھنؤ کے ایک انحطاطی معاشرے کی ترجمان ہے اور "آگ کا دریا" سمندر کی طرح وسیع وقت کی ترجمان ہے۔

چلئے اس کو بھی چھوڑیئے "تلاش بہاراں" میں ٹیکنک کے لحاظ سے کیا کمی ہے؟ "اداس نسلیں" جیسی ناول کیا اردو میں اس سے قبل بھی کبھی لکھی گئی تھی؟ میں اس بحث کو اس گزارش کے ساتھ ختم کروں گا کہ مہربانی کر کے ڈاکٹر فاروقی نئے لوگوں کی ناولیں بھی ہمدردی سے پڑھیں۔

میرے تو خیال سے ڈاکٹر فاروقی کو اس کتاب کا تیسرا حصہ پھر سے لکھنا چاہیے تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب اردو ناول پر ایک مکمل کتاب بن جاتی۔ پریم چند اور ان کے ناول "گئو دان" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی

نے ایک جگہ تحریر کیا ہے :-

"حقیقت میں زمیندار اتنے بے حس نہیں ہوتے
جتنے رائے صاحب ہیں اور کم از کم اُن کسانوں کی
طرف سے تو ہرگز بے توجہی نہیں برتتے جو ان کو
گاہے گاہے سلام کرتے جاتے رہتے ہیں ۔ پھر
زمیندار کے کارندے لگان وغیرہ وصول کرتے میں
جو سختیاں کرتے ہیں اُن کی طرف مصنف نے کوئی
اشارہ نہیں کیا حالانکہ یہ سختیاں اُن کے اشتراکی
مقصد کو زیادہ زور کے ساتھ سامنے لاتیں"

(صفحہ ۲۱۵)

معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر فاروقی کو زمینداروں سے اتنی ہمدردی پیدا ہو گئی کہ اُنھوں نے اُن کی صفائی دیتے ہوئے اُن کے ظلم و ستم کا سارا الزام اُن کے کارندوں کے سر تھوپ دیا اور پریم چند سے یہ شکوہ کیا کہ اُنھوں نے زمینداروں کو تو خواہ مخواہ بے حس کہہ دیا اور کارندوں کو صاف چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر فاروقی کا قاری اُن کا یہ جملہ پڑھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے پریم چند کی ناول نگاری کے اس خاص پہلو کو ہی نشانہ کیوں بنایا ہے اور اُس کی اہمیت کو اس قدر گھٹا کر کیوں بیان کیا ہے؟ میرے خیال سے اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق ڈاکٹر فاروقی کے مقابلہ میں پریم چند کو زیادہ حاصل ہے کہ زمیندار بے حس ہوتے تھے کہ نہیں کیونکہ پریم چند نے اُن زمینداروں کی بے حسی بذاتِ خود دیکھی تھی جبکہ ڈاکٹر فاروقی نے شاید ان واقعات دوسروں کی زبانی سُنا ہوگا۔

عزیز احمد کی ناول "گریز" کے ذہنی اور فکری پس منظر کو ڈاکٹر فاروقی نے بہت ہی لچر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے

"اگر "گریز" سے یورپ کا
اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا
کہ اس براعظم کے اُن حصّوں
میں جہاں گئے سوائے قحباؤں کے
اور کوئی بستا ہی نہیں۔ اگر ایک
آدھ تہذیب یافتہ انسان ہوتے
بھی ہیں تو محض بھوت اور
آسیب کی طرح" (صفحہ ۲۳۲)

اس میں شک نہیں کہ "گریز" میں دکھایا گیا یورپ کا نقشہ بہت پست ہے، لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ جس یورپ کا عزیز احمد نقشہ پیش کر رہے ہیں وہ جنگ کے دہانے پر کھڑا ہے اور اس صورتحال کا سامنا اُسے اپنی پستی کی وجہ سے ہی کرنا پڑا ہے، چونکہ عزیز احمد کے پیشِ نظر یورپ کی زندگی کا کھوکھلا پن واضح کرنا ہے، اس لیے حقیقت نگاری کے منصب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ اُس کھوکھلے اور جنس زدہ ماحول کی منہ بولتی تصویر پیش کر رہے ہیں اگر ایک ناول نگار کسی گندے ماحول کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہے، تاکہ ہم اُس گندگی کا احساس کر سکیں تو اس میں اُس ناول نگار کا کیا قصور؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم "گریز" پڑھتے وقت یورپ کے اُس جنس زدہ گندہ ماحول سے جتنی نفرت محسوس کرتے ہیں عزیز احمد کو اپنے فن میں اتنی ہی زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ یہاں پر عزیز احمد کا مقصد عریاں حقیقت نگاری کرنا ہے یقیناً نعیم ایک انسانیت سے گرا ہوا کردار معلوم ہوتا ہے لیکن کیا انسانیت سے گرے ہوئے کرداروں کی نقاب کشائی کرنا جرم ہے؟ آخر گریز کے نعیم کو فاروقی صاحب اینٹی ہیرو کی حیثیت سے کیوں نہیں دیکھتے؟

آگے چل کر ڈاکٹر فاروقی نے شوکت صدیقی کی "خدا کی بستی" اور جمیلہ ہاشمی کی "تلاشِ بہاراں" کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرعہ اِن ناولوں کے نام نہ نکلتا تو ان ناولوں کی طرف توجہ بھی نہ جاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال ان ناولوں کے ساتھ صریح ظلم ہے

(باقی صفحہ (۳۹) پر)

سید عبدالرحمان برکتی

پروفیسر سونیتی کمار چٹرجی
حیات اور کارنامے

متوسط قد — لیکن انفرادیت کا حامل، رنگ گندمی — ایک نایاب انمول مسودے کی طرح، چہرہ کتابی۔ متانت سنجیدگی اور خود اعتمادی سے بھرپور۔ لمبی اونچی ناک — بھارت کے علم وادب کی ناک۔ آنکھیں بڑی اور پرکشش — فنکارانہ جلال وجمال کی مظہر، ان آنکھوں پر کبھی ہلکے نیلے رنگ کی عینک اور کبھی پاور والا چشمہ گہری بصیرت وبصارت سے مزین جسم ہمیشہ دھوتی اور کرتے میں ملبوس ایک مثالی بنگالی اسکالر کی شان، گلے میں ایک خاص قسم کا نیلے دھاری والا جھولا اور ہاتھ میں پتلی چھڑی — خاکساری اور انکساری کا مجسمہ۔ چلتے تو معلوم نہ ہوتا کہ اس انسان نے زندگی کی چھیاسی منزلیں طے کرلی ہیں۔ بولتے تو ضعف وپیری کا شائبہ بھی دور دور تک نظر نہ آتا — یہ شبیہہ ہے اس شہرۂ آفاق ماہر لسانیات، ہندوستانی زبان وادب کے بادہ خواروں کے پیر مغاں متبحر اسکالر دیدہ ور محقق، عظیم دانشور علوم انسانی کے رمز شناس، مثالی استاد، بلند پایہ نقاد، شعلہ مقال، مجاہد العلم، رئیس القلم، نکتہ سنج نکتہ شناس، ذی فہم ذی وقار، یکتائے فن، یگانۂ روزگار انسان کی، جسے علم وادب کا معمولی سا شائق بھی کسی علمی یا ادبی کانفرنس یا سیمنار میں دور سے بولتے ہوئے دیکھ لیتا تو اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا "پروفیسر چٹرجی از اسپیکنگ" (پروفیسر چٹرجی بول رہے ہیں۔)

پروفیسر چٹرجی ایک عرصے سے بول رہے تھے۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں ان کی زبان کی طرح ان کا قلم بھی متحرک تھا۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی میں بیسیوں قومی اور بین اقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرکے انھیں رنگ ونور بخشا، وہاں ساڑھے تین سو سے زیادہ کتابیں تصنیف وتالیف کرکے لاکھوں کی ذہنی آبیاری کی۔ انھوں نے وقت کی اور وقت نے ان کی جس طرح قدر کی اس کی مثال بنگال کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اپنے دور کا یہ عبقری چند گھنٹے کی علالت میں موت سے پنجہ آزمائی کرنے کی جگہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردے گا۔

علالت اور وفات

پروفیسر چٹرجی زندگی کی ستاسی منزل سے گزر رہے تھے لیکن اس کبرسنی میں بھی وہ جوانوں جیسی انرجی رکھتے تھے۔ معلوم سے اس عمر میں بھی اس حد شگفتہ رہنا اور دن بھر میں بارہ بارہ گھنٹے علمی وادبی کاموں کے لیے نذر کرنا شاید جوانوں سے بھی ممکن نہیں۔ شاید وہ ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے ہاتھ میں قلم اور کاغذ لے کر ہی اس دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس عمر میں بھی جیسے تھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں اپنے چیمبر میں وہ

بلا ناغہ آتے اور بڑے ہشاش بشاش اپنے کاموں میں منہمک رہتے، اس کے علاوہ وہ اپنے دولت کدے پر ملنے والوں سے تین منزلہ عمارت کے زینے آسانی سے طے کر کے نیچے دہلیز میں ملتے۔ ۲۹ مئی کا وہ دن کتنا منحوس تھا جب دوپہر سے کچھ قبل اچانک انھیں سینہ میں کچھ درد کا احساس ہوا۔ خاندانی معالج کے بر وقت پہنچنے اور دیکھنے سے عارضی طور پر انھیں کچھ آرام سا ہو گیا۔ لیکن دو گھنٹے بعد پھر ان پر عارضہ قلب کا حملہ ہوا۔ اس دفعہ ماہر قلب ڈاکٹر پی کے سین بلوائے گئے۔ انھوں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انھیں نرسنگ ہوم منتقل کرنے کی صلاح دی چنانچہ انھیں اسی وقت وڈ لینڈ نرسنگ ہوم منتقل کر دیا گیا۔ پروفیسر موصوف اس سے قبل ۱۸ مئی کو آنکھ کے آپریشن سے کامیابی کے ساتھ گزر چکے تھے۔ لیکن اس دفعہ وہ نرسنگ ہوم سے بحیات واپس نہ آ سکے ۴ بجکر ۲ منٹ کی وہ گھڑی تھی جب عمر بھر کروڑوں کو اپنی تقریر و تحریر سے مسحور کرنے والا خود موت کی لوری کے سحر میں کھو گیا ع

مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

خاندان، پیدائش اور ابتدائی تعلیم

پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی بنگال کے ایک برہمن خاندان کے گنج گرانمایہ تھے۔ ان کے آباء و اجداد کا سلسلہ برہمنوں کے کسیپ قبیلے کے کنھتوری شاخ سے ملتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس شاخ کے دتارگ سماویرن نامی ایک برہمن کے کچھ دوسرے برہمن خاندانوں کے ساتھ ان کی تیسویں پشت میں شمالی ہندوستان (اتر پردیش) وارد ہوئے تھے۔ اور گیارہویں یا بارہویں صدی میں مغربی بنگال آکر بود و باش اختیار کر لی تھی۔ دتارگ سماویرن کے پرپوتوں میں سلوچنا نامی ایک شخص جو دسکا نامی برہمن کے صاحبزادے تھے۔ بنگال کے راجہ بلال سین (۱۱۵۸-۱۱۷۹ء) سے اپنی خدمات کے صلے میں چترتی (یا چٹوتی) نامی ایک گاؤں بطور اکرام پایا تھا۔ اسی گاؤں کے نام پر ان کے خاندان کا نام درانگر کر چٹر جیا یا چٹرجی پڑا، جسے انگریزی میں ویسے ہی اور سنسکرت میں چٹوپادھیا لکھا جاتا ہے۔ تیرہویں صدی میں جب ترکوں نے مغربی بنگال پر حملہ کیا تو یہ خاندان ہجرت کر کے مشرقی بنگال چلا گیا۔

دتارگ سماویرن کی بیسویں نسل میں دو سر بھابھوما نامی ایک برہمن سنسکرت کے بہت بڑے عالم ہوئے۔ چھبیسویں نسل میں بھیر بھا چندر کا خاندان گزرا جو پروفیسر چٹرجی کے جد امجد تھے۔ یہ خاندان مشرقی بنگال کے ضلع فرید پور سے مغربی بنگال کے ضلع ہوگلی میں آکر بس گیا۔ ان ہی کے لڑکوں میں ایشور چندر (متوفی ۱۹۰۷) جو فارسی اور انگریزی سے بخوبی واقف تھے بلکہ اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ڈاکٹر چٹرجی کے دادا تھے۔

ایشور چندر نے کلکتہ میں رہائش اختیار کر لی تھی ان ہی کے لڑکوں میں بابو ہری داس چٹرجی کے یہاں، جو بنگال کے ایک اچھے شاعر اور موسیقار سمجھے جاتے تھے۔ شیب پور (ضلع ہوڑہ) میں پروفیسر موصوف نے ۲۶ نومبر ۱۸۹۰ء آنکھیں کھولیں۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم کا آغاز موتی سیل فری پرائمری اسکول سے کیا۔ اس کے بعد بی اے آنرز (انگریزی) اور ۱۹۱۳ء کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کے امتحانات فرسٹ کلاس فرسٹ پاس کر کے اپنی ذہانت و فطانت کا سکہ جما دیا۔ ۱۹۱۳ میں آپ کلکتہ کے ودیا ساگر کالج میں انگریزی کے استاد مقرر کیے گئے۔ ۱۹۱۴ میں کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے بنگال سنسکرت ایسوسی ایشن کا دیک سنسکرت امتحان پاس کیا۔ اسی سال انھیں دو قابل قدر انعامات سے نوازا گیا پہلا پریم چندر رائے ریسرچ اسکالر شپ اور دوسرا کلکتہ یونیورسٹی جوبلی ریسرچ پرائز۔

اعلیٰ تعلیم اور یورپ کا سفر

۱۹۱۹ء میں حکومت ہند کی جانب سے لسانیات کے اسکالر کی حیثیت سے اعلیٰ

تعلیم کے لیے یورپ بھیج دیے گئے جہاں آپ لندن یونیورسٹی میں لسانیاتی مطالعے میں دو سال تک غرق رہے سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ نے علم صوتیات (PHONETICS) پر ڈپلوما حاصل کیا اور ۱۹۲۱ء میں لندن یونیورسٹی نے آپ کو آپ کے تحقیقی مقالے

"THE INDO-ARYAN LINGUISTICS – THE ORIGIN AND DEVELOPMENT OF THE BENGALI LANGUAGE"

پر ڈی لٹ کی گرانقدر ڈگری سے نوازا۔ جن اساتذہ کی زیر نگرانی آپ نے یہ ریسرچ مکمل کی ان میں ڈینیل جونس کا نام بہت اہم ہے۔ لندن سے تکمیل مقالے کے بعد وہ فرانس چلے گئے جہاں پیرس یونیورسٹی کالج دی فرانس اور دوسری دانش گاہوں میں لسانیاتی تحقیق میں مصروف رہے۔ اسی سال انھوں نے اٹلی، یونان اور جرمنی کا سفر کیا۔

چند اہم عہدوں پر

ڈاکٹر موصوف ۱۹۲۲ میں جب ہندستان واپس آئے تو انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسی سال انھیں کلکتہ یونیورسٹی میں ہندستانی لسانیات اور صوتیات کا کھیرا پروفیسر بنایا گیا جہاں وہ تقریباً بیس سال تک اپنے فرائض بڑے حسن وخوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۲ء کھیرا پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد اس شاندار اور طویل خدمات کے صلے میں انھیں کلکتہ یونیورسٹی میں ہی ایمریٹس (EMIRITUS) پروفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اسی سال وہ مغربی بنگال لیجس لیٹو کونسل میں پہلے ممبر اور پھر اس کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ اس عہدے پر بار بار منتخب ہو کر تقریباً ۱۵ سال تک رہنا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ خواص وعوام دونوں میں بہت عزیز ومقبول تھے۔ ۱۹۶۹ میں جب وہ یو ایس ایس آر میں مصروف تھے کہ حکومت نے انھیں علوم انسانی کے ریسرچ نیشنل پروفیسر کی حیثیت سے چنا ۸ فروری ۱۹۶۵ء کو وہ کونسل کے چیئرمین سے مستعفی ہو کر اس نئے عہدے کی ذمہ داری قبول کی جس پر وہ آخری عمر تک قائم رہے

کانفرنسوں میں شرکت

پروفیسر چیٹرجی نے ہزاروں چھوٹی بڑی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور ان میں اپنے فاضلانہ لکچرز سے پوری دنیا میں دھوم مچا دی۔ انھوں نے بہت سی کانفرنسوں کی صدارت بھی کی اور بیشتر کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نمائندگی بھی کی۔ یہاں ان کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۹۲۵ء میں انھوں نے لندن میں صوتیاتی علوم پر منعقدہ دوسری بین الاقوامی کانفرنس میں کلکتہ یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔ اور ہندستانی سیکشن کی صدارت بھی کی۔ یورپ کے اس سفر میں انھوں نے آسٹریا، ہنگری، زیکوسلاویہ، فرانس اور جرمنی کی سیر کی۔ دوران سفر انھوں نے برلن یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں کئی لیکچر دیے۔

۱۹۳۶-۳۷ء میں رنگون میں ہونے والی آل انڈیا لٹریری کانفرنس کی صدارت کی۔ صوتیاتی سائنسز کی تیسری بین اقوامی کانفرنس جس کا انعقاد ۱۹۳۸ میں بلجیم میں ہوا تھا۔ اس میں بھی پروفیسر صاحب کلکتہ یونیورسٹی کے نمائندہ بن کر گئے تھے اسی سال ماہرین علوم انسانی کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ کوپن ہیگن مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ برکسیلز دونوں میں کلکتہ یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے اسی سفر میں انھوں نے ناروے، سویڈن، فن لینڈ، پولینڈ، جرمنی، بلجیم اور اٹلی کی سیر کی۔

۱۹۴۰ء میں انھوں نے گجرات ورنا کولر سوسائٹی کی دعوت پر پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ ڈپارٹمنٹ میں کئی لیکچر دیے۔

۱۹۴۶ء میں ۳۴ ویں آل انڈیا ہندی لٹریری کانفرنس منعقدہ کراچی میں نیشنل لنگوسٹک سیکشن کی صدارت کی۔

۱۹۴۸ میں پیرس میں ہونے والی ماہرین انسانیت اور مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں اور برسیلز میں ہونے

[illegible] کی بین اقوامی کانفرنس میں کلکتہ یونیورسٹی اور ہندستانی حکومت کے نمایندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے قاہرہ کا بھی سفر کیا۔

۱۹۴۹ء میں یونسکو کی بلائی ہوئی ایک عالمی کمیٹی کی مجلس میں شریک کار رہے

۱۹۵۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے اٹلی، انگلینڈ، ہالینڈ اور ترکی کا ایک تعلیمی انکوائری ٹور کے تحت سفر کیا۔ اسی سال مارچ کے مہینے میں پیرس میں منعقد یونسکو کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۰ء میں ہونے والی یونسکو کی دوسری کانفرنس اور تیسری کانفرنس جو عربی اور فارسی کے سلسلے میں بیروت (لبنان) میں ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئی تھی اس میں بھی پروفیسر صاحب شریک تھے۔

۱۹۵۲ء میں پھر وہ یونسکو کی ایک کانفرنس میں تشریف لے گئے جس کے بعد انھوں نے میکسیکو اور دوسرے قریبی شہروں کا دورہ کیا۔ اور ۳۱ مارچ کو ہندستان واپس آگئے۔

۱۹۵۳ء میں انھوں نے سترھویں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔

جولائی ۱۹۵۴ء میں انھوں نے مغربی افریقہ گولڈ کوسٹ نائجیریا وغیرہ کا ایک سوسائٹی کے تحت سفر کیا۔ دورے کے دوران انھوں نے کیمبرج میں ہونے والی مستشرقین کی ۲۳ ویں کانگریس میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی جانب سے نمایندہ بنکر گئے۔ اسی سال انڈونیشیائی زبانوں پر ہونے والی ایک کانگریس میں حکومت انڈونیشیا کی دعوت پر ہندستانی حکومت کی طرف سے نمایندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

مئی ۱۹۵۵ء میں وہ حکومت چین اور پیکنگ یونیورسٹی کی دعوت پر ہندستانی یونیورسٹیز ڈیلیگیشن (INDIAN UNIVERSITIES DELEGATION) کے ممبر کی حیثیت سے چین کا سفر کیا۔

ستمبر ۱۹۵۸ء میں وہ سویٹ اکاڈمی آف سائنسز کی دعوت پر ماسکو میں چوتھی بین اقوامی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اور مقالہ پڑھا۔ اس کے علاوہ ماسکو لینن گراڈ اور کئی جگہوں پر لکچر دیے۔ اسی سال تاشقند میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی ایک کانفرنس میں بھی حصہ لیا۔ اور ایک سیکشن کی صدارت بھی کی۔

۱۹۵۹ء میں کامن ویلتھ پارلیمنٹری کانفرنس میں، جس کا انعقاد کینبرا (آسٹریلیا) میں ہوا۔ ہندستانی نمایندہ کی حیثیت سے شریک رہے۔

۱۹۶۰ء میں ماسکو میں ۹ اگست سے ۱۷ اگست تک ہونے والی مستشرقین کی ۲۵ ویں بین اقوامی کانفرنس میں بھی حکومت ہند کی نمایندگی کی۔ اس میں انھوں نے جو ایک مقالہ پڑھا وہ یہ تھا۔ "ہندستان اور چین [illegible] اپنے قدیمی تعلقات کے آئینے میں نیز ہندستان نے چین سے کیا لیا۔"

۱۹۶۱ء میں وہ روم یونیورسٹی کی دعوت پر روم کا سفر کیا۔ جہاں انھیں مذکورہ یونیورسٹی نے "HONORIS CAUSA" (ڈاکٹریٹ) کی ڈگری سے نوازا۔ اسی سال وہ تہران گئے اور وہاں تہران یونیورسٹی میں ایرانینزم (IRANIANISM) پر اپنا مقالہ پڑھا

۱۹۶۲ء میں ماہرین لسانیات کی نویں بین الاقوامی کانفرنس جو ہارورڈ یونیورسٹی اور کئی دوسری بڑی تنظیموں کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس میں بھی انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ پڑھا اور ایک پورے سیشن کی صدارت کی۔

۱۹۶۴ء میں وہ مستشرقین کی ۲۶ ویں بین اقوامی کانفرنس منعقدہ دہلی میں تنظیمی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے شریک کار رہے۔ اسی سال ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی ایک کانفرنس جس کا انعقاد ماسکو میں ہوا تھا۔ میں بھی شریک ہوئے۔

۱۹۶۶ء میں نو افریقی اور یورپی ممالک کے ایک دو ماہی ٹور میں "ہندستانی تاریخ اور ثقافت" پر اپنی تحقیقات پیش کرنے کے لیے مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں تشریف لے گئے۔ اس ٹور کا انتظام ہندستانی سرکار اور چند دوست ممالک کی طرف سے ہوا تھا جس میں انھوں نے کئی

بین اقوامی کانفرنس میں بھی حصہ لیا۔
۱۹۷۶ء میں انھیں حکومت ایران نے تہران میں ہونے والی ایرانولوجسٹ (IRANOLOGISTS) کی عالمی کانگرس میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا جس میں انھوں نے ایرانی ثقافت اور اس کا اثر دنیا پر۔ (زمانہ اکمینیسن) پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اسی سال انھوں نے "ہندوستانی ادب میں جدیدیت" کے سیمینار میں بھی حصہ لیا جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈی میں منعقد ہوا تھا۔ انھوں نے انڈو یورپین کلچر اور لسانیات کی چند پہلوؤں پر کئی لیکچر دیے۔

ڈاکٹر صاحب قاہرہ یونیورسٹی بھی تشریف لے گئے تھے۔ جہاں انھوں نے "ہند ــ عرب ثقافتی تعلقات کے ذریعہ انسانی نسل کی تکمیل" پر اپنے گرانقدر آراء پیش کی ــ اوپسالا میں بھی سلاکی یونیورسٹی میں انھوں نے جس موضوع پر اپنی عالمانہ تقریر سے بہت متاثر کیا۔ وہ موضوع تھا "ہندوستان اور ایتھوپیا کے رشتے شروع سے"

۱۹۶۷ء میں انھوں نے مستشرقین کی ۲۷ ویں بین الاقوامی کانگرس میں شرکت کی اسی سال رومانیہ میں ہونے والی کانگرس لسانیات کی ۱۰ ویں بین الاقوامی کانگرس میں بھی وہ حاضر ہوئے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں انھوں نے سنٹرل ایشیا کی بین الاقوامی کانفرنس جو یونسکو اور آئی سی سی آر (نئی دہلی) کی مدد سے منعقد کی گئی تھی۔ میں بھی حصہ لیا۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں انھوں نے دہلی میں ہونے والے گرونانک کے پانچ سو سالہ جشن میں مدعو کیے گئے۔ اور اس میں ۹، ۱۰، ۱۱ دسمبر کے تمام سیمیناروں کی صدارت کی۔ اس کے علاوہ کلکتہ میں ہونے والے جشن میں ۱۵، ۱۶، اور ۱۷ دسمبر کو بحیثیت صدر فرائض انجام دیے۔

۱۹۷۰ء گرونانک کے پانچ سو سالہ جشن کے موقع پر سیمینار (منعقدہ مدراس) کی رسم افتتاح ان ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس سیمینار میں بھی انھوں نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔

چند اہم کتابوں پر ایک نظر

یوں تو ہر دو قبیر موضوع کی تصنیفات و تالیفات کی مجموعی تعداد تین سو اسی کے قریب ہے جو مختلف زبانوں میں ہیں لیکن یہاں ایک تو رسالے کی تنگ دامنی پیش نظر ہے۔ دوسری طرف "معلم اردو" کے قارئین کا علمی ذوق بھی ملحوظ نظر ہے لہذا صرف چند کتابوں کا مختصر حال تعارفاً درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) THE ORIGIN AND DEVELOPMENT OF BENGALI LANGUAGE

یہ کتاب بنگلہ زبان کی جنم اور اس کی ابتدا و ارتقاء پر ایک بڑی ہی ضخیم اور مستند کتاب ہے۔ دراصل فاضل محقق نے لندن یونیورسٹی میں اپنا جو تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا اور جس پر انھیں ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔ اسی مقالے کو کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۹۲۶ء میں پہلی بار کتابی شکل میں پیش کیا ۱۹۷۰ء میں جارج ایلن اینڈ انون لمیٹڈ نے دوسری بار اور ۱۹۷۵ء میں روپا اینڈ کمپنی نے تیسری بار مذکورہ کمپنی کے انتظام و اہتمام میں شائع کیا۔

(۲) INDOARYAN AND HINDI

پروفیسر چٹرجی نے گجرات ورنا کولر سوسائٹی (حالیہ ودیا سبھا) کے ریسرچ اور پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہندی پر کئی اہم لکچر دیے تھے۔ جسے اس سوسائٹی نے پہلی بار ۱۹۴۰ء میں طباعت سے آراستہ کیا۔ دوسرا ایڈیشن تصحیح اور اضافہ کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۳) LANGUAGES AND LITERATRES OF MODERN INDIA

ہندوستانی زبان وادب پر پروفیسر جی کی یہ کتاب بر لنظر استھان دہلی کا ہے۔ ڈاکٹر ٹی جوزپے ISTITUTE ITALIANO RER IL MEDIO

ED ESTRENO ORIENTE
کے ڈائرکٹر تھے۔ اور پروفیسر موصوف
کے بہت پرانے دوست بھی تھے ۱۹۵۰ء
میں انھوں نے پروفیسر صاحب سے گزارش
کی کہ وہ LECIVILTA DELA
ORIENTE کی دوسری جلد کے
لیے ہندوستان کی زبانوں اور ان کے آداب
پر ایک طویل تحقیقی مقالہ لکھیں پروفیسر صاحب
نے ۱۹۵۱ میں اسے مکمل کر کے روم بھیج
دیا۔ جہاں وہ مقالہ اطالوی زبان میں
منتقل ہو کر منظر عام پر آیا۔ پروفیسر صاحب
کا انگریزی مقالہ جو اب تک غیر مطبوعہ تھا
پروفیسر صاحب نے دوستوں کی گزارش پر
دوبارہ ترمیم اور اضافہ کر کے پھر سے ترتیب
دینا شروع کیا۔ جو ۱۹۶۲ء میں بنگال
پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ (کلکتہ) کے اہتمام
میں طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا
اور بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا اب
تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے
ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے
پہلے حصہ میں ہندوستانی زبانوں ــــ اس
کے مسائل اور حل پر سیر حاصل بحث ہے
دوسرا حصہ ہندوستانی زبانوں کے آداب
پر مفصل تبصرہ ہے۔ پہلے حصے کے جو
مضامین ہیں ان میں THE
PRESENT LINGUISTIC
POSITION THE PLACE
THE اور OF INDIA
QUESTION OF SCRIPT

IN INDIA بہت اہم ہیں۔
(۴) PHONATICIN THE
STUDY OF CLASSICAL
LANGUAGE IN THE EAST
یہ کتاب ان کے لیکچروں کا مجموعہ
ہے۔ جسے انھوں نے بنگلور یونیورسٹی میں
بالترتیب ۸/ اور ۹ مارچ ۱۹۷۲ کو ہر بجلنگ گپا کوتسی لیکچرز دیئے تھے جو
اسی سال مئی کے مہینے میں بنگلور یونیورسٹی
کے اہتمام میں شائع ہو کر شائع ہو کر منظر
عام پر آیا۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی کتاب
ہے۔ لیکن علم صوتیات کی تاریخ میں
ایک اہم اضافہ ہے۔
۵۔ INDIA AND ETHOPIA
(FROM THE 7th CENTURY
B.C.)
اگست ۱۹۶۸ میں پروفیسر موصوف
نے ریاستہائے متحدہ امریکہ تشریف لے
گئے تھے اور وہاں مستشرقین کی ۲۷ ویں
بین الاقوامی کانگریس میں اپنا مقالہ مذکورہ
عنوان پر پڑھا تھا۔ یہ مقالہ پوری دنیا
میں بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔ کلکتہ کی
رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے
اسے شائع کیا۔
۶۔ WORLD LITERATURE
AND TAGORE
یہ کتاب بھی ان کے ان لیکچروں
کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے وشوابھارتی
یونیورسٹی میں ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ اپریل ۱۹۷۸

کو بزی چندرا چندرا بنرجی میموریل لیکچرز
کے طور پر دیے تھے۔ اس کتاب میں دنیا
کی چند مشہور کلاسیکس اور نامور ادبی
شخصیتوں پر فاضلانہ مضامین ہیں۔
عربی اور فارسی کے کلاسیکس میں THE
ARBIAN NIGHTS۔
THE SHAHNAMA اور
THE NATIONAL EPIC OF
IRAN شامل ہیں۔ جو ان کے وسیع
مطالعے کے ترجمان ہیں۔ سب سے طویل
مقالہ ٹیگور پر ہے جو ٹیگور اور ان کے
فن سے قربت کی یاد دلاتی ہے۔

شخصیت اور اسکے چند اہم پہلو

پروفیسر چٹرجی پوری دنیا میں ایک
ماہر لسانیات کی حیثیت سے مشہور و معروف
تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو وہ ایک ماہر لسانیات
سے زیادہ ایک بڑے "ہیومانیسٹ" تھے ان
کی نظروں میں دنیا کی الگ الگ تہذیبوں
کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ پوری دنیا کو
ایک تہذیب کے جامے میں دیکھنا چاہتے
تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا کی تمام قوموں
کلچروں اور مذہبوں سے بڑی گہری دلچسپی
رکھتے تھے جس کا مظاہرہ انھوں نے تادم
حیات اپنی تقریروں و تحریروں میں کیا
وہ جہاں ویدانتا کے قدیم ہندوستانی فلسفہ
کے پرستار تھے۔ وہاں قدیم یونانی فکر
و نظر اور اسلامی تصوف کے بھی بہت
دلدادہ و مداح تھے۔ وہ دنیا کی مختلف

زبانوں کے جن کلاسیکس کو بہت اہم سمجھتے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ سنسکرت زبان۔ رگ وید کے کچھ حصص — دوسرے وید، مہابھارت، رامائن، اور کالیداس کا شکنتلا۔

۲۔ یونانی زبان میں — ہومر کی گیتیں یونانی المیہ وغیرہ۔

۳۔ عبرانی زبان میں — انجیل مقدس عبرانی زبان کی دوسری مقدس کتابیں۔

۴۔ فارسی زبان میں۔ شاہ نامہ

۵۔ عربی زبان میں۔ الف لیلہ

۶۔ انگریزی زبان میں شیکسپیر کے ڈرامے اور ڈکنس، ٹالسٹائی کی ناولیں۔ ڈرامے وغیرہ۔

۷۔ بنگلہ زبان میں — رابندر ناتھ ٹیگور کی تمام نثری اور غیر نثری تحریریں۔

وہ ایک کامیاب معلم بھی تھے۔ طلبا کے بارے میں ان کی ہمدردی کا جذبہ غیر معمولی تھا۔ انھوں نے طلبا کی تعلیم میں جس قسم کی دلچسپی لی وہ اس زمانہ میں ملتا ہے۔ انھوں نے کم و بیش تیس سال تک یونیورسٹی میں علم لسانیات اور صوتیات کے علاوہ جن مضامین کی درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے ان میں زمانہ قدیم کی اور زمانہ وسطیٰ کی انگریزی یونانی، گوتھک، پہلوی اور عربی کی نصابی کتابیں شامل تھیں۔ لسانیاتی درس میں انھوں نے سنسکرت، بنگلہ، ہندی، اردو اور اڑیہ جیسی زبانیں پڑھائیں۔ یونیورسٹی میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک لڑکوں کو درس دیتے رہے۔

ان کی گھریلو زندگی بھی علمی زندگی کی طرح کامیاب رہی۔ ایک اچھے انسان کی طرح وہ اپنے گھر سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ شریمتی کملا دیوی جب پچاس سال تک رفیقہ حیات رہنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں چل بسیں۔ تو انھوں نے ایک خالی شوہر کی طرح اس کی یاد میں کچھ کرنا چاہا۔ مغلیہ تاجدار شاہجہاں کے پاس دولت تھی اس لیے اس نے سنگ مرمر کا تاج بطور یادگار چھوڑا۔ لیکن سونیتی کمار تو کاغذ و قلم کے بادشاہ تھے۔ لہٰذا وہ ایک کاغذی تاج محل اس کی یاد میں بنا گئے جو ان کی کامیاب خوشگوار گھریلو زندگی کی انمٹ داستان ہے۔

وہ عوامی زندگی میں بھی خواص و عوام میں بڑے مقبول و معزز رہے۔ ان کی مقبولیت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جب ۱۹۵۲ء میں وہ مغربی بنگال لیجس لیٹو کونسل کے الیکشن میں ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے تو اپنے مقابلے میں دو امیدوار ہونے کے باوجود ایک بڑی تعداد ووٹ سے الیکشن جیتے۔ اور پھر سبھوں کی متفقہ رائے سے اس کے چیرمین بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۸ کے الیکشن میں بھی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اسی طرح وہ بار بار منتخب ہو کر تقریباً تیرہ سال تک اس عہدے پر رہے یہاں تک کہ انھیں مستقل پروفیسر مقرر ہونے کی وجہ سے مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ پورے ہندوستان میں ایسے عہدے پر اتنے دنوں تک رہنا سب سے طویل عرصہ ہے۔

پروفیسر صاحب اور ٹیگور

پروفیسر چٹرجی بنگال کے عظیم شاعر و ادیب رابندر ناتھ ٹیگور سے بڑے ہی قریب تھے۔ اعلیٰ انسانی قدروں کے پیدا ہونے میں ٹیگور کی صحبت کا بہت ہاتھ ہے۔ جہاں وہ ٹیگور سے متاثر تھے وہاں یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی نہیں کہ ٹیگور بھی ان کی علمی استعداد اور بالخصوص لسانیاتی معلومات سے بڑے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "بنگلہ بھاشا پرچیہ" کا انتساب پروفیسر صاحب کے نام سے کیا۔ اور انھیں "بھاشا چاریہ" کے نام سے پکارا۔ پروفیسر صاحب اس پر بہت فخر کیا کرتے تھے۔ ٹیگور نے اپنی تحریروں میں بھی بیشتر جگہوں پر اس کا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ اپنی کتاب "شیشیر کبیتہ" میں انھوں نے پروفیسر صاحب کو بحیثیت ہیرو پیش کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ٹیگور کے ساتھ جاوا، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ کا سفر کیا۔ یہاں انھوں نے مختلف جگہوں پر ہندوستانی آرٹ، کلچر اور ٹیگور پر لیکچر دیے۔ ۱۹۶۳ء میں بھی انھوں نے مراٹھواڑا یونیورسٹی (اورنگ آباد) میں ٹیگور اور

اس کے فن پر تین لیکچر دیے، نہ صرف تقریر بلکہ اپنی تحریر سے بھی انھوں نے حق رفاقت ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب WORLD LITERATURE AND TAGORE کا نام قابل ذکر ہے۔ جس میں انھوں نے ٹیگور کے فن پر اپنے بسیط مطالعہ کا ماحصل پیش کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء میں ایک اور کتاب ٹیگور کے نام پر شائع کی۔ ٹیگور پر ایک اور کتاب بھی وہ مکمل کر چکے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ کتاب طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔

پروفیسر صاحب اور اردو

پروفیسر چیٹرجی پورے ہندوستان میں بولی جانے والی تمام ترقی یافتہ زبانوں سے واقف تھے۔ نہ صرف زبان بلکہ ان کی لسانی پیچیدگیوں اور ان کی ادبیات پر گہری نظر تھی۔ اس سلسلے میں ہندی اور اردو کا ذکر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہندی کی انھوں نے جو خدمت کی اس کو ہندی کی تاریخ میں ہمیشہ جلی حرفوں سے لکھا جائے گا۔ ہندی کی ان غیر معمولی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "ساہتیہ واچسپتی" جیسے خطاب سے نوازا گیا۔ لیکن یہاں محبوب (یعنی اردو) کے ساتھ ان کے تعلقات کا ذکر بہت ضروری ہے۔ اردو کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے گہرے تھے ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے انھوں نے اس زبان کی جنم اس کی ابتدا و ارتقا پر جو تحقیقیں کیں۔ وہ بڑی معتبر و مستند سمجھی جاتی ہیں یہ مشہور نقاد و محقق پروفیسر آل احمد سرور نے اردو زبان کی جنم اور اس کی ابتدا و ارتقا پر جہاں بحث کی ہے۔ وہاں پروفیسر چیٹرجی کی رائے کو دوسرے محققوں کی رائے پر ترجیح دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

"اردو زبان ایک آریائی زبان ہے۔ یہ کھڑی بولی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ گریرسن اس کا آغاز سریانی کے آغاز میں تلاش کرتا ہے شیرانی نے اس کا جنم قدیم پنجابی میں ڈھونڈھا ہے۔ جولیس بلاک اسے اس شورسینی پراکرت کا ثمر سمجھتا ہے جو الہ آباد سے لاہور تک پھیل گئی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے مستند رائے ہندوستان کے مشہور ماہر لسانیات ایس کے چیٹرجی کی ہے۔ جو اسے کھڑی بولی کی ادبی شاخ کہتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ ان کی رائے سے پورا اتفاق کیا ہے۔

"ہندی اور اردو دو مستقل اور جداگانہ زبانیں نہیں بقول چیٹرجی کے دو ادبی اسلوب ہیں۔"

پروفیسر موصوف نے اپنی مشہور کتاب LANGUAGES AND LITERATURES OF MODERN INDIA میں جہاں بھارت کی دوسری زبانوں اور ان کے ادب پر روشنی ڈالی ہے وہاں اردو زبان و ادب پر بھی ایک قابل قدر باب لکھ کر اردو سے اپنے تعلقات کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب میں ہندوستانی زبانوں کی ادبیات میں "اردو ادب" کا دوسرے باب میں ہونا اردو زبان و ادب سے ان کی گہری محبت کا بین ثبوت ہے۔

مغربی بنگال میں جب حکومت نے اردو اکاڈمی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے چیرمین شپ کے لیے سب سے موزوں آدمی پروفیسر چیٹرجی ہی ملے لہٰذا حکومت نے چیرمین کے عہدے پر ان ہی کو فائز کیا۔ اردو اکاڈمی کی تیاری کمیٹی نے ان کی زیر نگرانی اکیڈمی کا جامع منصوبہ بنایا تھا۔ اور گزشتہ سال اگست کے مہینے میں اپنی مکمل رپورٹ بھی پیش کر چکی تھی۔ لیکن اسے اردو کی بدقسمتی کہیے یا اردو والوں کی کہ ایک طرف نئی حکومت اردو کے بارے میں الکشنی وعدوں کے برعکس سوتیلی ماں جیسا برتاؤ کر رہی ہے (گرچہ بنگال کی ریاستی حکومت نے اب تک کوئی ایسا بیان نہیں دیا ہے اور نہ ہی اس سے ایسی توقع ہے) دوسری طرف پروفیسر چیٹرجی جیسا حامی و جاں نثار اکاڈمی قائم ہونے سے پہلے اس کو ہمیشہ کے لیے داغ

فارقت دے گیا۔ ع
کہ جاملک الموت تقاضا کوئی دن اور

پروفیسر صاحب اور رامائن

قدرت نے پروفیسر صاحب کی طبیعت میں شروع ہی سے بے انتہا کرید اور تلاش و جستجو ودیعت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ علم لسانیات اور صوتیات جیسی موضوعات پر کامیابی کے ساتھ تا عمر آخر کام کرتے رہے۔ یہی تلاش و تجسس انھیں ان کی مقدس مذہبی کتاب "رامائن" سے بھی حقائق کے پردے اٹھانے سے باز نہیں رکھ سکی۔ رامائن کی اصل اس کے واقعات کی صحت پر انھوں نے عمر کے آخری دور میں جو تحقیقی انکشافات کیے۔ ایسے ارباب عقل اور قدامت پرست ہندوؤں کے درمیان بحث و مباحثہ کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق انھوں نے اپنی تحقیق کی بنا پر یہ رائے دی تھی۔ کہ رامائن کا تصور (CONAEPTION) [illegible] مستعار ہے اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی دعوا کیا تھا کہ ہماری MYTHOLOGY میں دس سر رکھنے والے راکشش کی بات ہماری نہیں بلکہ یونانی دیومالاؤں سے ماخوذ ہے۔ سب سے زیادہ انھیں جس حقیقت کے انکشاف پر قیل و قال کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ انھوں نے ہندوؤں کے عقیدے کے برعکس رام کو بھگوان کا اوتار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید رامائن ہی پروفیسر چٹرجی جیسے حق گو و حق شناس محقق کی آخری منزل ہوتی لیکن قدرت کو کیا منظور تھا کہ۔ ع

مسافر رک گیا چلتے چلتے

انعامات، اعترافات، اعزازات

سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں انھیں دو گرانقدر اسکالر شپ "پریم چندر ریسرچ اسٹوڈنٹ شپ" اور "کلکتہ یونیورسٹی جوبلی ریسرچ پرائز" ملے۔ ۱۹۳۶ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کا فیلو منتخب کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں ہندوستان کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات کے لیے "ساہتیہ واچسپتی" کا خطاب ملا ۱۹۵۵ء میں حکومت ہند نے ان کی متبحر علمی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے پدم بھوشن اور پھر ۱۹۶۳ء میں پدم وی بھوشن جیسے اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۶۱ء میں روم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ اس یونیورسٹی کے علاوہ اور بھی کئی یونیورسٹیوں نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا جس میں دہلی یونیورسٹی، رابندرا ناتھ ٹیگور یونیورسٹی (کلکتہ) وشوا بھارتی (بیربھوم) عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) اور کلکتہ یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں انھیں ٹیگور ریسرچ انسٹیٹیوٹ نے ان کی علمیت پر "طلائی تمغہ" دیا۔ ۱۹۶۹ء میں ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) نے ان کی لسانیاتی تحقیقات سے متاثر ہو کر انھیں "رابندر پلیک" (RABINDRA PLAQUE) پیش کیا۔

پروفیسر موصوف سینکڑوں ملکی و غیر ملکی اداروں، مجلسوں، درسگاہوں وغیرہ سے منسلک تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ پہلی دفعہ ۱۹۳۶ء میں اور دوسری بار ۱۹۷۰ میں کلکتہ یونیورسٹی کے فائن آرٹس اور موسیقی فیکلٹی میں وہ ڈین (DEAN) بھی رہے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ سی پی اے (ایل پیرس) کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ "سوسائٹی آف آرٹس اینڈ سائنس" کے منتخب ممبر بھی تھے جن اداروں سے وہ اعزازی طور پر وابستہ تھے۔ ان میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ آف پولینڈ۔ فرانسیسی اورینٹل سوسائٹی امریکن اورینٹل سوسائٹی۔ لنگوسٹک سوسائٹی آف امریکہ، اٹالین انسٹی ٹیوٹ۔ فور دی نیر اینڈ فار ایسٹ انٹرنیشنل کونسل آف فونیٹک سائنسز، یونیورسٹی آف سیلون، لنگوسٹک سوسائٹی اور پاکستانی فونیٹک سوسائٹی کے نام بہت اہم ہیں

افسوس! صد افسوس! کہ پروفیسر چٹرجی جیسا عالم صدیوں کیا قرنوں میں مشکل سے پیدا ہوتا ہے لائق

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

...تو پھر سچ کیا ہے؟

احمد رشید شیروانی

بعض الفاظ کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن ان کا مفہوم لوگ صاف طور سے نہیں سمجھتے ان الفاظ کو اپنے اپنے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ایسے ہی دو الفاظ ہیں سیکولرازم اور فرقہ پرستی ان دو الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ ایک رائے ہے کہ سیکولرازم کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں ہر چیز اکثریتی فرقہ کی چھاپ ہو اور اگر کوئی مسلمان اس پر اعتراض کرے تو وہ فرقہ پرست ہے۔ اس کے متضاد دوسری رائے یہ ہے کہ اس ملک میں سیکولرازم کے نام پر مسلمانوں کو من مانی کرنے کا حق دیا جائے اور اگر کوئی ہندو کچھ بولے تو وہ فرقہ پرست ہے۔

ہندو فرقہ پرست

چنانچہ ہندوؤں کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ دیکھئے صاحب باوجود کہ مسلمانوں نے پاکستان بنوا لیا پھر بھی ہندوؤں کی شرافت اور وسیع القلبی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے بھارت کو ایک سیکولر آئین دیا اور یہاں مسلمانوں کو نہ صرف مساویانہ حقوق دیئے بلکہ اقلیت کی حیثیت سے کچھ خصوصی مراعات بھی دیں۔ مثلاً مسلمان اپنے "تعلیمی اداروں" کو چلا سکتے ہیں اور ان میں حکومت کوئی مداخلت بھی نہیں کر سکتی بے جا مداخلت تو درکنار بجا مداخلت بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن مسلمان کتنے فرقہ پرست ہیں کہ اول تو چار شادیاں کر کے اپنی آبادی بڑھائے جا رہے ہیں اور پھر جہاں موقع ملے یہ ہندو بچوں کو پیٹرو ڈالر کا لالچ دے کر مسلمان کر لیتے ہیں اور اس طرح یہ مسلسل اس کوشش میں لگے ہیں کہ بھارت میں کسی طرح ہندو اکثریت ختم ہو جائے اور اور اسے بھی مسلم اکثریتی ملک بنا لیا جائے۔

یہ رائے کچھ دن پہلے تک قریب ۲۰ فیصد ہندوؤں کی تھی جن کو ہم جن سنگھی کہتے تھے۔ اسی فیصد ہندو اس رائے سے ہنستے تھے۔ اور اسے جن سنگھی ذہنیت کی اختراع کہتے تھے۔ لیکن میناکشی پورم کے واقعے کے بعد سے یہ رائے قریب ۴۰ فیصد ہندوؤں کی ہو گئی ہے۔ اور اب جن سنگھیوں کے علاوہ اور بہت سے ہندو بہت سی سیکولر پارٹیوں کے ہندو بھی ایسا ہی سوچنے لگے ہیں۔ یہ رجحان یقیناً خطرناک ہے۔ اور اگر روکا نہ گیا اور یہ رجحان یونہی بڑھتا گیا تو وہ دن دور نہیں جب ہندوؤں کی اکثریت کی یہی رائے بن جائے گی اور تب شاید اس ملک کا سیکولر دستور بھی ختم ہو جائے گا۔ اور یہ ملک ایک "ہندو دیس" بن جائے اور مسلمان یہاں واقعی دوسرے درجے کے شہری بن جائیں۔

مسلم فرقہ پرستی

مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ ارے صاحب یہ سیکولرازم محض ایک ڈھونگ ہے مسلمانوں کو الو بنانے کے لیے ہندوؤں نے ایک دکھاوا کر رکھا ہے ورنہ درحقیقت اس ملک کا چپہ چپہ جبہ جبہ مسلمان کے خون کے قطرے قطرے کا پیاسا ہے۔ مسلمانوں کی نسل کشی ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی سازش کی جا رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ رائے رکھنے والے فسادات کے آنکڑے پیش کرتے ہیں کہ دیکھئے جمشید پور، مراد آباد میں، میرٹھ میں،

بڑودہ میں اور اسی طرح کئی مقامات پر کیا ہوا۔ مسلمانوں کو کس طرح مارا گیا جہاں مسلمان ذرا سے آگے بڑھتے ہیں وہیں کچل دیے جاتے ہیں۔

یہ بھی نہایت افسوسناک بات ہے کہ یہ رائے دن بہ دن زیادہ سے زیادہ مسلمانوں میں عام ہوتی جا رہی ہے۔ چند سال پہلے تک مسلم فرقہ پرست پارٹیاں ہی یہ بات کھل کر نہیں کہتی تھیں۔ اب یہ بات صرف مسلم فرقہ پرست عناصر کہہ رہے ہیں بلکہ سیکولر پارٹیوں کے کئی مسلمان بھی کم و بیش یہی بات کہنے لگے ہیں۔ یہ رجحان بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا پہلے والا یعنی ہندو فرقہ پرستی کے فروغ کا رجحان اور اگر اس رجحان کو نہ روکا گیا تو اس ملک کے مسائل اور الجھیں گے۔ ایک قسم کی فرقہ پرستی سے ہمیشہ دوسری قسم کی فرقہ پرستی کو فروغ ملا کرتا ہے۔ تقویت ہی ملتی ہے۔ ہندو فرقہ پرستی کی کاٹ اس کا توڑ کبھی مسلم فرقہ پرستی کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔

سچ کیا ہے؟

جمہوریت میں اس بات کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی کہ سچ کیا ہے بلکہ زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ لوگ کیا سچ سمجھتے ہیں مثلاً ۱۹۷۷ء میں شمالی ہندوستان کے بیشتر عوام نے یہ سمجھا صحیح سمجھا یا غلط سمجھا مگر سمجھا کہ ایمرجنسی میں بڑے مظالم ہوئے۔ لاکھوں لوگوں کی زبردستی نس بندی کر دی گئی اور اگر مسز اندرا گاندھی کی پارٹی ہرایا نہ گیا تو آگے اور نہ جانے کیا کیا ہو۔ چنانچہ سارے شمالی ہندوستان میں ان کی پارٹی کو ایک سیٹ نہ ملی۔

۱۹۸۰ء میں انہی عوام کی اکثریت نے سمجھا کہ ایمرجنسی کے مظالم کی داستانیں گپیں تھیں جنتا پارٹی والے مہا جھوٹے نکمے اور ناکارہ ہیں۔ مسز گاندھی تو بڑی جمہوریت نواز ہیں۔ دیکھو انھوں نے الیکشن کرایا اور ہارتے ہی جھٹ سے حکومت جنتا پارٹی کو سونپ دی۔ مگر ان لوگوں نے ان بے چاری کو بہت ستایا۔ یہ سب مل کر بھی ان کے خلاف ایک بھی الزام ثابت نہ کر سکے۔ بہرحال دیس پر راج کرنے کی صلاحیت صرف مسز اندرا گاندھی میں ہے چنانچہ جنتا پارٹی والوں کا صفایا ہو گیا اور مسز گاندھی اب پھر بر سر اقتدار ہیں۔

اب بتائیے سچ کیا ہے۔ ایمرجنسی میں مظالم ہوتے تھے؟ یا نہیں؟ زبردستی کتنے آدمیوں کی نس بندی ہوئی تھی! لاکھوں کی؟ یا کسی کی بھی نہیں؟ اہمیت اس بات کی ہے کہ کب عوام نے کس بات کو صحیح مانا۔ ۷۷ء میں سچ یہ تھا کہ ایمرجنسی میں بڑے مظالم ہوئے لہٰذا مسز گاندھی کو ہرانا عوام کی جان بچانے کے لیے ضروری ہے۔ ۱۹۸۰ء میں سچ یہ تھا کہ مسز گاندھی تو ایک بہت ہی جمہوریت نواز، نہایت شریف خاتون ہیں جو بڑی معصوم و مظلوم ہیں ان کو پھر وزیر اعظم بنانا بھارت پر احسان ہوگا۔

گویا جمہوریت میں سچ وہ ہوتا ہے جسے عوام سچ سمجھیں۔

حقیقت کے پہلو

اور اگر آپ واقعی دیکھیں تو بہت سی متضاد باتوں میں سچ بھی ہے۔ اور جھوٹ بھی۔ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے پاکستان بنوایا۔ دیش کا بٹوارا کروایا اور اس کے بعد ہندوؤں نے شرافت اور وسیع القلبی کی حد کر دی کہ پھر بھی مسلمانوں کو برابر کا شہری قرار دیا اور ان کو وہ سارے حقوق دیے جو ہندوؤں کو حاصل ہیں اور ان کے علاوہ کچھ خصوصی مراعات بطور اقلیت کے اور دیں اس ملک میں ہر عہدے پر مسلمان فائز رہے ہیں مسلم وزیر اور گورنر تو اتنے ہوئے کہ شمار نہیں فوج کے ایک بازو کے چیف آف اسٹاف سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور ان سب سے بڑھ کر صدر جمہوریہ مسلمان رہ چکے ہیں۔ صرف وزیر اعظم اب تک کوئی مسلمان نہ بن سکا۔ لیکن جب پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک بار استعفے کی بات کی تو اس اہم ترین عہدے کے لیے جو نام سب سے زیادہ لیا جا رہا تھا وہ رفیع احمد قدوائی مرحوم کا تھا۔ اور اگر ان کا اچانک انتقال نہ ہو گیا ہوتا تو ان کے وزیر اعظم بننے کا صرف امکان نہ تھا بلکہ احتمال غالب تھا۔ اب بھی قطعاً ممکن ہے کہ اگر کوئی مسلمان رفیع صاحب جیسا ہو یا ان سے آدھا بھی کا ہو تو وہ اس ملک کا وزیر اعظم بن سکتا۔

حد یہ ہے کہ کیرالا میں ایک مسلم لیگی مسلمان بھی وزیر اعلیٰ بن گیا تھا۔ اور ہندوؤں کی حمایت ہی سے ایسا ہونا ممکن تھا اگر ہم ان باتوں کو دیکھیں تو ہمیں یہی نظر آئے گا کہ ہندوؤں سے زیادہ وسیع القلب فراخ دل شریف، معقول اکثریت دنیا کے اور کسی ملک میں نہیں اور ان باتوں کو دیکھ کر ہی بہت سے مسلمان کہتے ہیں (میں خود کہتا ہوں) کہ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اس ہندو اکثریتی بھارت کا ایک ادنیٰ شہری ہونا بہتر سمجھتا ہوں بہ نسبت کسی ملک وزیر اعظم یا صدر ہونے کے کیونکہ ٹھیک نہیں کہ کسی مسلم ملک میں کب کسی وزیر اعظم کو پھانسی دے دی جائے یا گولی ماردی جائے۔ اور کب کسی صدر کو قید کر دیا جائے۔ یا کان پکڑ کر جلا وطن کر دیا جائے اس ہندو اکثریتی ملک، بھارت میں مجھ جیسے شہریوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ کچھ مقام ہے۔ کچھ اہمیت ہے۔ یہ بات میں نے ایک بار نہیں دس بار کہی ہے اور مسلم مجمعوں میں کہی ہے، اگر میں یہ بات ہندوؤں کی سبھاؤں میں کہتا تو ہندوؤں کا ایک گھٹیا قسم کا چمچہ کہلاتا مگر میں نے ہمیشہ یہ بات ایسے مجمع میں کہی جہاں قریب نوے فیصد مسلمان تھے اور ہمیشہ کافی مسلمانوں نے میری اس بات پر تالیاں بجائیں یعنی یہ بات نہ صرف ہندو بلکہ کافی مسلمان بھی محسوس کرتے ہیں اور اسے سچ مانتے ہیں۔

دوسرا پہلو

لیکن دوسری بات بھی غلط نہیں اکثریت کے بہت سے لوگوں کی رکیک القلبی اور ان کے نہایت چھوٹے دل و دماغ کی مثالیں بھی اتنی ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ اس سے زیادہ تنگ دل لوگ اور کہیں نہیں ہوں گے تو شاید یہ بات بھی غلط نہ ہو۔ مثالیں پیش ہیں۔

گیارہ فیصد مسلمانوں کو بمشکل دو فیصد سرکاری ملازمتیں ملتی ہیں۔ قومیائے ہوئے بینکوں سے قرضے پانے والوں میں مسلمان بمشکل دو فیصد ہیں کئی جگہ سرکاری مشینری فرقہ وارانہ فساد کے دوران بالکل فرقہ پرست بن جاتی ہیں۔ مارے جانے والوں میں مسلمان اسی نوے فیصد ہوتے ہیں۔ جن کے گھر اور جن کی دکانیں جلتی ہیں۔ ان میں مسلمان اسی نوے فیصد ہوتے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ گرفتار ہونے والوں میں بھی بیشتر مسلمان ہوتے ہیں۔ یعنی جن کو لوٹا اور مارا جاتا ہے انھیں کو ملزم بنا کر جیلوں میں بھی ٹھونسا جاتا ہے۔

اردو کے ساتھ ایسی کھلی ناانصافی ہوئی ہے۔ اور بیشتر ریاستوں میں ہو رہی ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ملک میں سب سے زیادہ اردو والے یوپی میں ہیں اور وہیں اردو میڈیم سے ہائی اسکول کا امتحان دینے کی سہولت ۱۹۴۷ کے بعد دو تین سال کے اندر بالکل ختم کر دی گئی۔ ۱۔ ج تک ہزاروں اسکولوں میں اردو کے استاد نہیں۔ حد یہ ہے کہ اردو کے جو ٹیچر ہیں ان کو بھی ایسے اسکولوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں اردو پڑھنے والے نہیں۔ اور جہاں اردو پڑھنے والے ہیں وہاں اردو کے استاد ندارد۔ حماقت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ سرکار کا نقصان ہو رہا ہے کہ اردو استاد کو بے کام کے تنخواہ مل رہی ہے اور کئی جگہ ضرورت ہوتے ہوئے اردو استاد نہیں بھیجے جا رہے۔

مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرنے میں بالکل بلا وجہ تیرہ سال لگائے گئے۔ لیکن یہ بات قانوناً تسلیم کرنے میں اس ملک کے حکمرانوں کو (اور کسی ایک پارٹی کے نہیں بلکہ کئی پارٹیوں کے حکمرانوں کو) تیرہ سال لگے۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان کے خلاف جنگ میں ایک مسلمان حوالدار عبد الحمید مرحوم نے پاکستان کے چار پیٹن ٹینک توڑ ڈالے لیکن سیکولر بھارت کی سیکولر فوج میں مسلمانوں کا تناسب شاید ایک فیصد ہے۔ کیوں؟ کون بتلائے۔ ورنہ یہ مسلمان بھی ہندوستانی مسلمان ہیں۔ جو برٹش انڈیا فوج میں شامل ہو کر ایک نہیں کئی مسلم ملکوں کی فوجوں سے لڑ کر انھیں ہرا چکے ہیں۔ ان کا سر انگریزوں کے قدموں میں جھکا چکے ہیں۔ ان ہی مسلمانوں نے عراق، حجاز، اور فلسطین کو امیر المومنین سلطان عبد الحمید سے چھین کر انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اگر ہم ان مسلمانوں کو بجنر

کی فوج میں لو تو یہ پاکستان کو بھی فتح کر کے تمہارے قدموں میں ڈال سکتے ہیں۔ یہ پاکستان کے خلاف لڑنے میں بھی تم سے آگے رہیں گے۔ موقع تو دو۔

آج تک بھارت کی فوج میں جتنے پاکستانی جاسوس پکڑے گئے ان میں ننانوے فیصد غیر مسلم رہے ہیں۔ اور شاید نوے فیصد تو ہندو ہی رہے ہیں مگر پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہندو تو ہر ایک شرطیہ دیش بھگت ہوگا۔ بلکہ دیش بھگتی اور حب الوطنی تو ہندو کا اجارہ ہے۔ ہر مسلمان شرطیہ پاکستان کا ایجنٹ ہوگا۔ اس ذہنیت کو اور جن ذہنوں میں یہ ذہنیت ہے ان ذہنوں کو کیا کہا جائے؟ مگر یا یہ بھی سچ ہے کہ ملک کی اکثریت کے بعض لوگوں کی ذہنیت جتنی تنگ ہے اور گھٹیا ہے اتنی تنگ اور گھٹیا ذہنیت کی تلاش ہونے پر بھی مشکل ہی سے ملے گی اور یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے بلکہ بیشتر ہندو جتنے وسیع النظر کشادہ دل جتنے معقول اور شریف ہیں ایسے لوگ بھی روئے زمین پر کہیں اور مجھے تو نظر نہیں آئے۔ آپ کو آئے ہوں تو بتائیے کہاں ہیں۔

تو پھر سچ کیا ہے؟

یہ ملک سیکولر ہے؟ یا اس ملک کا سیکولرازم محض ڈھونگ ہے؟ مسلمانان ہند خوش قسمت ہیں کہ ان کو اس ملک میں وہ سب حقوق حاصل ہیں جن سے مسلم ملکوں کے مسلمان محروم ہیں؟ یا اس ملک کے مسلمان ایک صیاد کے دام میں پھنسے ہوئے پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہے ہیں؟ قصائی کے بکرے کی طرح بندھے ہوئے تیز ہوتی ہوئی چھری کی طرف دیکھ رہے ہیں؟ دونوں باتیں سچ ہیں مگر زیادہ سچ کون سی بات؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں حالات کا اور زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ اور ہندو فرقہ پرستوں کو الزام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر بھی دیکھنا ہوگا۔ ہندو تو جلتے ہیں دیتے ہیں۔ سوال یہ بھی اہم ہے کہ بعض مسلمان خود اپنے مسائل کو الجھانے میں کیا کچھ کم کوشاں ہیں۔

پرچھائیاں پکڑنے والے

.. فرحت احساس ..

وہ کئی دنوں سے برابر سوچ رہا تھا کہ یہ بات شانتا سے کہہ دے لیکن کہنے بھی تو کیا بات بھی کتنی عجیب تھی۔

ایک میز پر اس کے سامنے بیٹھی ہوئی ایک لڑکی — اس کے چاروں طرف بیٹھا اس کا پورا خاندان اور میز کے نیچے سے اس کے پاؤں کو چھوتا ہوا اس کا پاؤں — ایک ڈرا ہوا۔ مگر بھرپور بھرا اعتماد لمس — یہ منظر اس کی آنکھوں میں جم سا گیا تھا۔ کام کرتے کرتے جب وہ تھک جاتا تو وہ خوف زدہ سا پاؤں اسے اپنی طرف سرکتا ہوا محسوس ہوتا اور پھر اس کے پورے وجود پر، ایک بادل کی طرح چھا جاتا ہے۔

اس لڑکی کو اب وہ بھول چکا تھا۔ کب اور کہاں ملا تھا [illegible] اسے نہیں یاد تھا لیکن اس کے پاؤں کا وہ لمحاتی لمس، جس کی عمر اس کی زندگی کی ہمسفر بن گئی تھی۔ اس کے وجود کی پہچان بن گیا تھا۔ زندگی کی تیز دھوپ میں بیتے ہوئے دن کا ایک ایک نقش پگھل چکا تھا۔ اس کے اندر کی تمام عمارتیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں — وہ میز، اس کی شکل، اس کی جگہ، اس پر بیٹھے تمام لوگ بدل چکے تھے۔ لیکن وہ پاؤں، اس کا سہما پن اس کی پُر اعتماد سپردگی کا سا وہ آج بھی بالکل یوں ہی زندہ تھا — بلکہ وہی تو تھا جو زندہ تھا۔

شانتا سے اس کی شادی کو کئی سال ہو چکے تھے۔ اس نے اسے کئی بچے دیے تھے۔ اس کا گھر اس کی بے ترتیبی شانتا کے تناسب سے مرتب ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کا سارا اعتماد کھول کر اس کے ڈھیلے پن پر ڈال دیا تھا۔ لیکن آج تک شانتا کی کسی بات سے اسے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی — بس اس کے پاؤں، بے جان، خاموش۔ انھیں میں اس کی توجہ سمٹ کر رہ گئی تھی۔

اس نے آج تک پوری شانتا کو دیکھا ہی نہ تھا۔ بستر پر پگھلتی، کھانا پکاتی۔ کپڑے دھوتی بچوں کو سلاتی اور ہنستی پوری شانتا کو دیکھ کر اسے اپنا وزن کئی گنا زیادہ محسوس ہوتا — اسے لگتا جیسے سارا گھر ایک بہت بڑی میز ہے جس کے نیچے سے سرکتا ہوا پاؤں، اس کا انتظار اس کے ذرے ذرے لمس کی سرسراہٹ سب کچھ کہیں کھو گیا ہے — اسے لے کر۔

کھانے کی میز پر وہ جب بیٹھتا۔ اس کی آنکھیں شانتا کے پاؤں کو گھورا کرتیں — ان میں سب بالکل ویسا ہی تھا اسی پاؤں جیسا۔ ویسا ہی نازک، سفید۔ دھلا ہوا۔ لیکن بالکل بے فکر، بے خوف جیسے اس نے سب کچھ دیکھ لیا ہو اسے کہیں آنا اور جانا نہ ہو جیسے اس نے اپنی آخری زمین پہچان لی ہو — اس کا یہی اطمینان اسے بہت بوجھل کر دیتا تھا۔

یہ میز بھی بالکل ویسی ہی گھر بھی ویسا ہی۔ شانتا کے پاؤں بھی ویسے ہی لیکن یہ کچھ کہتے کیوں نہیں! آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ کیا ان کا سفر ختم ہو گیا یا انھیں سفر کا احساس ہی نہیں؟ یہ اتنے بے نیاز کیوں ہیں۔ ایسے لمحوں میں اسے محسوس ہوتا کہ دور دھند میں لٹکا پاؤں اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ کمرے کی ساری چیزیں، اس پر جمی گرد۔ سب کچھ ٹھہرا ہے...... ہمیشہ ہمیشہ سے اور

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

نازش پرتاپ گڈھی

تین نظمیں

ناتمامی

یوں تو اب تک روزِ ازل سے
میں نے گائے
تو نے چھیڑے
پھر جانے کیوں ہیں انجانے
رُوح کے گانے
دل کے ترانے

مُروّت

زندگی کو اداس کون کرے
اپنے دامن کے چاک سیتا ہوں
زہر پیتا ہوں اور جیتا ہوں
اس گھڑی کو اداس کون کرے
لاکھ اشکوں کی جھلملاہٹ ہو
پھر بھی ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہو
چاندنی کو اُداس کون کرے
چشم دل ہے کہ رو رہی ہے خوں
اور میں ہوں کہ گنگناتا ہوں
روشنی کو اداس کون کرے
زندگی کو اداس کون کرے

احساس

روح کا چھالا کسک رہا ہے
تپک رہا ہے
کھٹک رہا ہے
اب مرا دامن کون سیئے گا
کون پیئے گا؟
کون جیئے گا؟

خونی انقلاب

مورٹ مرشیرڈ

ترجمہ رفعت کمال

فوجی زندگی کی یکسانیت سے تنگ آکر بالآخر سام ساڈرنے امریکی فوج کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ دیا اور جنوبی امریکہ میں امیزن کے بالائی حصہ پر واقع ایکوڈر کو اپنی رہائش گاہ بنالیا۔ وہاں جوار و انڈینز کے ساتھ بےنام جزیروں میں مہماتی زندگی میں لگا۔ ذیل کی سچی کہانی نہایت انوکھی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ جو سام کی زندگی کی سنسنی خیز پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے

تاریخ کے طلبا اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پناما نہر کی تعمیر کے لیے جو خطہ ارض حاصل کیا گیا تھا وہ کولمبیا کا ایک جز تھا اور وہاں کے عوام ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ غاصبانہ طور پر ان کی زمین کے کسی حصے پر قابض ہو جائے اسلیے وہ امریکہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے اور امریکی سرکار کے مقابلہ کے لیے انھوں نے باقاعدہ انقلابیوں کی ایک جماعت قائم کرلی تھی کیا پُرجوش انقلاب میں سام کہادر نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور ایک سربراہ کی حیثیت سے امریکی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

انقلابیوں کی جماعت میں شامل ہونے کے بعد اس نے فوج کی کمان سنبھال لی اس کی قیادت کو سبھی نے خوشی سے قبول کرلیا تھا اور باغیوں کی ہائی کمانڈ نے اسے یقین دلایا کہ انقلاب کی کامیابی کے بعد اسے اعلیٰ ترین منصب اور اعزاز سے سرفراز کیا جائے گا۔

انقلابی فوج میں کرنل کے عہدہ پر تقرر کے بعد سام ساڈرنے محسوس کیا کہ سپاہی غیر تربیت یافتہ ہیں اور بڑی حد تک فن سپہ گری سے ناواقفیت رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ جسمانی طور پر بھی لاغر دکھائی دیتے ہیں اکثر غریب کی ایسی آبادی کے افراد ہیں جو محض انقلاب کی کامیابی کے خواب آئندہ خوشحال زندگی کے دن گزار رہے ہیں وہ بالکل جاہل تھے۔ اور پریڈ کے بنیادی اصولوں سے بھی ناواقف تھے انھیں تربیت دینا کوئی آسان کام نہ تھا مگر سام نے کبھی ہار ماننا نہیں سیکھا تھا جلد ہی اس کی ذہانت اور محنت نے کسی رجمنٹ کو سپاہیوں کو فن سپاہ گری کے زریں اصول سے روشناس کرایا ... فوج کے بہترین دستوں میں ایک رجمنٹ ...

انقلابی فوج جسے کولمبیا کی عوام کی حمایت
حاصل تھی متحدہ امریکی فوج کے خلاف
صف آرا ہوگئی اور بے پناہ جرأت اور شجاعت
کا مظاہرہ کیا۔ مگر امریکی فوجی دستے بہتر ہتھیاروں
سے لیس تھے اور انھیں لڑائی کی بہتر تربیت
دی گئی تھی۔ اس لیے انقلابی فوج کو شکست کا منہ
دیکھنا پڑا اور پیچھے ہٹ کر نسبتاً محفوظ مقامات
پر پناہ لینی پڑی۔ سام کی رجمنٹ آخر تک
جان کی بازی لگائے رہی مگر پھر مجبور ہوکر
اسے بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کی رجمنٹ کے جنگجو
اور شجاع سپاہی کافی تعداد میں میدان کارزار
کی نذر ہوگئے۔ اور جو بچے وہ زخموں سے چور
تھے۔ سام نے کوئی کاری زخم نہیں کھایا تھا۔
پھر بھی اس کا شانہ زخمی ہوگیا تھا۔

اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد کرنل
سام کو یقینی طور پر بہت زیادہ تشویش تھی اور
اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ
بکھرے ہوئے فوجیوں کے کارروان کی از سر نو تنظیم
کے بعد کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کی تگ و دو
کی جائے۔ شکست کے اسباب پر غور و فکر کرنے کے
لیے انقلابی جماعت کے سربراہوں کی ایک کانفرنس
بلائی گئی جس میں ایک سابق جنرل کے سوا وطن
پرست کولمبیائی شہری تھے۔ ان میں تین امریکی
بھی تھے جو نظریاتی اعتبار سے امریکی پالیسیوں
کے مخالف تھے اور کولمبیا کے انقلاب کا ساتھ دیتے
تھے۔

مسئلہ بہتر ہتھیاروں کی فراہمی اور فوجیوں
کے لیے غذا مہیا کرنے کا تھا۔ کولمبیا مالی
بحران سے دوچار تھا۔ ایک کولمبیائی شہری نے
مالی بحران سے نکلنے کے لیے تجویز پیش کی جسے
ردو قدح کے بعد قبول کر لیا گیا۔ یہ کولمبیائی
شہری ایک سابق تجربہ کار فوجی تھا۔ اس نے
اپنی تجویز پیش کرتے ہوئے کانفرنس کے شرکاء
کے سامنے انکشاف کیا کہ ریاستہائے متحدہ
امریکہ کے شعبہ خزانہ میں اس کا ایک بہت
قریبی دوست اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے اور
خفیہ طور پر کولمبیائی انقلابیوں کی انقلابی
تحریک سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اس لیے پہلا
یہ اسے اس اقدام کے لیے آمادہ کیا جائے کہ
وہ سرکاری خزانے کی ان پلیٹوں کو ہمارے
حوالے کردے جن پر ڈالر کے نوٹ چھاپے جاتے
ہیں۔ اور پھر ان پلیٹوں کے ہماری تحویل میں
آتے ہی ہمارے مسائل حل ہوجائیں گے اور
ہم نوٹ چھاپ کر نہ صرف ضرورت کے ہتھیار
خرید سکیں گے بلکہ فوج کے لیے بہتر ہتھیار
اور فوجیوں کے لیے اچھی غذا بھی مہیا کرسکیں
گے۔

اور پھر انقلابیوں نے اپنے مخفی کارکنوں
کی مدد سے سرکاری خزانے کے افسر اعلیٰ سے
رابطہ قائم کرکے اسے سرکاری خزانے کی پلیٹیں
دینے پر آمادہ کر لیا۔ افسر اعلیٰ کو انقلابیوں
نے یقین دلایا تھا کہ انقلاب کی کامیابی کے
بعد اسے شعبہ خزانہ کا ڈائرکٹر جنرل مقرر
کیا جائے گا۔

مگر بڑی مشکل یہ تھی کہ دارالحکومت
پہنچ کر افسر اعلیٰ سے سرکاری خزانے کی پلیٹیں
حاصل کرکے دوبارہ کولمبیا لوٹنا آسان کام
نہ تھا۔ چپہ چپہ پر امریکی فوجیں نگہبانی کررہی
تھیں اور چاروں طرف ان کے جاسوسوں کا
جال پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک آزمائش کا مقام
تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگا کر دارالحکومت
کو جانا۔ جہاں قدم قدم پر موت کے سائے
پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ایک خفیہ پلان تھا
جس سے انقلابی تحریک کے سربراہوں اور
اعلیٰ فوجی افسران کے علاوہ کوئی واقف نہیں
تھا۔ راز کے افشا ہونے کا مطلب انقلابی
تحریک کی مکمل ناکامی تھا۔ اس لیے یہ طے کیا گیا
کہ ان میں سے ہی کوئی اس عظیم مگر بے حد خطرناک
مہم کو سر کرنے کا ذمہ لے اور غیر مشروط طور
پر اس سنگین فرض کو انجام دے جس افسر نے
پلان کو ترتیب دیا تھا۔ اس نے سرکاری خزانے
کے افسر اعلیٰ سے رابطہ قائم کرکے اپنا فرض
پورا کردیا تھا اس لیے اسے مزید خطرے میں
ڈالنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ غیر مشروط طور
پر کوئی بھی اس خطرے کو مول لینے پر آمادہ
نہیں تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ کانفرنس
ناکامی کا شکار ہوجائے۔ سام نے اپنی نشست
سے اٹھ کر اعلان کیا کہ وہ زندگی اور موت
کے اس خوفناک کھیل میں حصہ لینے کو تیار
ہے۔ اور وہ خزانے کی پلیٹیں حاصل کرنے
کے لیے دارالحکومت جائے گا۔

سبھی لوگوں نے بڑی گرمجوشی کے
ساتھ اسے مبارکباد دی۔ اس کی شجاعت اور
دلیری کا لمبے چوڑے لفظوں میں اعتراف کیا
اور اس کی صحت اور زندگی کی بقا کے لیے
شراب کے جام لنڈھائے گئے۔

[illegible] دو ہفتہ کے بعد [illegible]

رات کو جب موسلادھار بارش کے جھالے بڑی ہیبت ناک ماحول کا منظر پیش کر رہے تھے شعبہ خزانہ کے عقبی حصے میں کرنل سام افسر اعلیٰ کا انتظار کر رہا تھا۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر سام دارالحکومت کے شعبہ خزانہ کی سہ منزلہ عمارت تک پہنچ گیا تھا۔ اور افسر اعلیٰ تک اس نے اپنی آمد کی اطلاع پہنچا دی تھی۔

آدھی رات کے گجر نے جب کراہتی ہوئی آواز نکالی تو امریکی شعبہ خزانہ کا اعلیٰ افسر لمبا اوورکوٹ اوڑھے بارش میں بھیگتا ہوا عمارت کے عقبی دروازے سے نکل کر سام کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے اوورکوٹ کی جیبوں میں کرنسی نوٹ چھاپنے کی چار پلیٹوں کے پیکٹ موجود تھے۔ سرد موسم اور بارش کے عتاب سے وہ کپکپا رہا تھا۔ سام نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اور پھر وہ دونوں باغیوں کی باڑ کاٹ تک پہنچنے کے لیے پہلے سے منتخب ایک غیر معروف راستہ کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے جسموں میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور وہ اپنے سروں پر تلواریں لٹکتی محسوس کر رہے تھے۔ ان کے سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے صاف ظاہر تھا کہ راستے میں پیش آنے والے کسی بھی خطرے کے تصور سے لرزہ براندام ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ معمولی سے شبہ پر ان کی گردنیں سر سے جدا ہو سکتی تھیں۔ امریکی جاسوسوں کی نظروں میں آنے کا مطلب صرف موت تھا۔ مگر یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ بغیر کسی خطرے سے دو چار ہوئے وہ امریکی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے اور معینہ جگہ پر پہنچ گئے جہاں پر پہلے سے دو گھوڑے موجود تھے۔ اور جن کا انتظام کرنل سام امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں داخل ہونے سے پہلے کر آیا تھا۔ اب انہیں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے خاردار جنگلوں سے گزرنا تھا۔ اس دشوار گزار راستہ کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ خود کو امریکی فوج کے عیار جاسوسوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھ سکیں۔

یہاں اس بات کا اظہار کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے اوائل دور اور اس کے کچھ بعد تک سلاطینی امریکہ میں آئے دن انقلاب آتے رہتے تھے اور محیرالعقول طور پر ڈراموں کی طرح کسی بھی وقت کوئی غیر یقینی واقعہ ظہور میں آ سکتا تھا۔ جب کہ آج کی دنیا میں یہ چیز بڑی حد تک بعید از قیاس ہے۔

دارالحکومت سے اپنی روانگی سے دوسرے دن وہ کانٹوں بھرے جنگلات سے گزرتے ہوئے اس دریا تک پہنچ گئے جسے انہیں تیر کر عبور کرنا تھا۔ دریا کے واحد پل کا استعمال ان کی گردنوں کے لیے پھانسی کا پھندا ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ دریا کے پل پر متحارب امریکہ کی فوجیں اور ان کے سراغرساں گشت کر رہے ہوں گے۔ جنہیں سرکاری خزانے کی پلیٹوں کی چوری کی اطلاع ۔۔۔ بارہ گھنٹے کے درمیانی عرصے میں دی جا چکی ہو گی اور وہ اپنی انگلیوں کو رائفلوں کے ٹریگروں پر رکھے ہوئے کسی بھی مشتبہ آدمی کو شوٹ کرنے کے لیے مضطرب ہو رہے ہوں گے۔

اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ اپنے گھوڑوں اور خزانے کی قیمتی پلیٹوں کے ساتھ وہ خود کو دریا کی خوفناک لہروں کے حوالے کر دیں کرنل سام اور افسر اعلیٰ کے پاس کرنسی نوٹ چھاپنے کی دو دو پلیٹیں تھیں۔ دریا میں اپنے گھوڑے ڈالنے تک وہ شاید اس بات سے بے خبر تھے کہ دریا کا یہ حصہ ایسی خونخوار مچھلیوں کا مرکز ہے جو انسانوں کو چٹ کر جانے میں ذرا بھی تامل نہیں برتتیں ——— اس خطرناک بہادری سفر کے دوران انہیں اکثر درشت پر خار جھاڑیوں سے سابقہ پڑا تھا اور ان کے گھوڑوں کے جسم پر بھی خراشیں آ گئی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ پیرانہا (PIRANHA) مچھلیوں کو خون کے قطروں کا لطف آنے میں دیر نہیں ہوتا، خون کو دیکھتے ہی وہ اپنے شکار کی طرف لپکتی ہیں۔ انسان کا خون چوس کر ہی دم لیتی ہیں۔

سام نے پہلے اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈالا اور جب وہ دریا کے عین بیچ میں پہنچا تو انسانی خون کی پیاسی مچھلیوں کا غول اس پر حملہ آور ہو گیا۔ سام نے ان خونخوار مچھلیوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے پاؤں اوپر اٹھا لیے مگر اس دوران مچھلیاں اس کے گھوڑے سے لپٹ چکی تھیں اور اس کا خون چوس رہی تھیں۔ گھوڑا شدت درد سے بلبلا

اچھلا۔ سام کے لیے گھوڑے کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا اور اس سے پہلے کہ گھوڑا اسے گرا دیتا سام نے بڑی پھرتی سے چھلانگ لگا کر دریا میں کود پڑا، موت کو آنکھوں کے سامنے رقص کرتے دیکھ کر پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ہاتھ پاؤں چلانے لگا اور با آخر کسی نہ کسی طرح کنارے تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ مچھلیاں بڑی تیزی کے ساتھ زندہ گھوڑے کا گوشت نوچ رہی تھیں۔ کنارے تک پہنچنے میں سام نے جس قدر تیز رفتاری اور پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے اس کی جان ضرور بچا دی پھر بھی ایک مچھلی اس کی پنڈلی کا گوشت نوچ لے گئی تھی۔ یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ اس کا نشان زندگی بھر نہیں مٹا۔

خزانے کا افسر اغلباً سام کے پیچھے اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈال چکا تھا اور کنارے سے جو منظر سام نے دیکھا وہ بڑا روح فرسا اور دردناک تھا دریا کی پر شور لہروں میں گھرا ہوا افسر اعلا تڑپ رہا تھا۔ خون کی پیاسی مچھلیاں اس سے لپٹ گئی تھیں اور اس کا زندہ گوشت کھا رہی تھیں۔ سام کے سامنے ایک ایسا دلدوز منظر تھا۔ جسے دیکھ کر کوئی بھی انسان اپنے ہوش و حواس قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے پیرانہا مچھلیاں ایک زندہ انسان کا گوشت نوچ رہی تھیں اور وہ بے دست و پا خوف و حیرت کے ملے جذبات کے ساتھ اس بھیانک منظر کو دیکھ رہا تھا ایک گھنٹہ کی جان لیوا مسافت کے بعد زخموں سے چور سام ہسینڈا (HACIENDA) کے جنگلات تک پہنچ گیا۔ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ذہنی اور جسمانی طور پر وہ بے پناہ خستگی کا احساس کر رہا تھا۔

رات اس نے ایک غار میں گزاری اور صبح کے انتظار میں جاگتا رہا غار کے منہ پر اس نے آگ کا الاؤ روشن کر دیا تھا۔ اس لیے جنگلی درندوں کی دست برد سے بچا رہا۔

اور پھر اگلی صبح طلوع آفتاب سے قبل اس نے اپنی منزل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور موت کے بھیانک سایوں میں وہ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتا رہا۔ اس نے اپنی پنڈلی پر کپڑا جلا کر اس کی راکھ باندھ لی تھی —— اور جب وہ انقلابی جماعت کے ہیڈ کوارٹر پہنچا تو اس کی حالت غیر ہو چکی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایک مہینہ سے زیادہ تک وہ بیمار پڑا رہا مگر کچھ بھی ہو وہ موت کو شکست دے کر اپنی مہم سے کامیاب واپس آیا تھا۔ کرنسی نوٹ چھاپنے والی پلیٹوں کا جوڑا انقلابی جماعت کی مالی کمان تک پہنچا دیا گیا تھا۔

جلد از جلد کرنسی نوٹ چھاپنے والی پلیٹیں جاری کی گئیں اور ہزاروں کی تعداد میں نوٹ چھپنے لگے۔ وقتی طور پر اقتصادی بحران ختم ہو گیا۔ ضرورت کی سبھی اشیا خریدی گئیں فوجوں کی از سر نو تنظیم کر دی گئی اور پھر حیرت انگیز طور پر انقلابی فوج کی طاقت دن دونی رات چوگنی بڑھتی گئی۔ متحدہ امریکہ کی فوجوں کو ہر محاذ پر شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔

حکومت کے سربراہوں کو جب اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی تو وہ محفوظ بینکوں سے اپنا سونا چاندی نکلوا کر فرار ہو گئے۔ جیسا کہ لاطینی امریکہ میں ان دنوں یہ روش عام تھی۔ جب ان کے وفادار بحری جہازوں نے بندرگاہ چھوڑی تو ملک کی ساری دولت ان کے ساتھ تھی۔ اور ملک میں معاشی بحران پیدا ہو چکا تھا۔

سام ساڈر کو اس خدمات کے سلسلے میں انقلابی جماعت کی طرف سے ۲۵ ہزار ڈالر کا گرانقدر عطیہ دیا گیا اور اسے فوجی کارپس کا جنرل بنا دیا گیا —— مگر انقلابیوں کی خوشی لمحاتی ثابت ہوئی۔ ابھی وہ پوری طرح فتح کا جشن بھی نہیں منا سکے تھے کہ ملک کے بینکوں میں سونا چاندی نہ ہونے کی بنا پر معاشی بحران پیدا ہو گیا۔ روپیہ کی قوت خرید صفر کے برابر رہ گئی تھی۔ اجناس کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ غیر ملکی حکومتوں نے کولمبیا کی کرنسی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا یہ خبر باہر کی دنیا تک پہنچ چکی تھی کہ حکومت کولمبیا کے خزانے میں سونا برائے نام ہے۔

فوجیوں کو جب اندازہ ہوا کہ انہوں نے جس لڑائی کو خون دے کر جیتا تھا وہ بے سود ثابت ہوئی تو ان کا بد دل ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ وہ اپنی مہینہ بھر کی

تنخواہ سے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں خرید سکتے تھے۔

اور پھر رد عمل کے طور پر ایک اور انقلاب آیا۔ یہ عوامی انقلاب تھا۔ انقلابی حکومت جس کا مقابلہ نہیں کرسکی فوجیوں کا عزم ٹوٹ چکا تھا۔ اور بیشتر مردہ ہو چکے تھے، انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

شہر کے سرکاری حصے کے علاوہ انقلابیوں کے قبضہ میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا انقلابی جماعت کے سبھی عہدیدار نئے انقلابیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ یا گرفتار کرلیے تھے۔ انقلابی جماعت کے فوجی سربراہ (جو ایک جرمن تھا) اور سام کے علاوہ سبھی لوگ ہلاک کر دیے گئے تھے۔ انقلابی جماعت کے فوجی عہدیدار اور بیشتر سپاہی پسپا ہوکر ہتھیار ڈال چکے تھے۔ سام کی رجمنٹ جو سو آدمیوں پر مشتمل رہ گئی تھی۔ وہ بدستور سرکاری محل کے باہر پہرہ دے رہی تھی۔

نئے انقلابیوں نے آمد و رفت کے سبھی مرکزوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا ریلوے اسٹیشنوں، فضائیہ کے اڈوں اور بندرگاہوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔

آخر میں بالکل مجبور ہو کر سام ساڈر اور جرمن فوجی سربراہ اپنے سو وفادار ساتھیوں کے ساتھ محل سے نکل پڑے اور کئی مقامات پر خونریز لڑائیوں کے بعد شہر کی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہوگئے مگر اس کے لیے انھیں اپنے سبھی جانباز ساتھیوں کو کھونا پڑا تھا ——— امیزن کے بالائی حصہ پر واقع ایکوڈر تک محض جرمن فوجی سربراہ اور سام ساڈر ہی پہنچ سکے تھے۔ اور وہاں سے جرمن بھی واپس اپنے وطن یورپ چلا گیا۔ سام نے مستقل طور پر ایکوڈر میں رہائش اختیار کرلی اور جوار و انڈینز کے ساتھ زندگی کے دن گزارنے لگا۔

پرچھائیاں — (بسلسلہ صفحہ ۲۳)

اس کے پاؤں کٹ گئے ہیں۔ جیسے وہ سب اسی طرح کب سے بیٹھے ہیں۔ خاموش اور جمے ہوئے۔ اپنی اپنی گرد میں لپٹے۔ اسی کے منتظر جو آ نہیں سکتا۔

دونوں میزیں ایک جیسی لیکن ایک کے نیچے ایک ڈرا سہما دھند میں لپٹا پاؤں جس میں حرکت ہے آگے بڑھتا ہے اور اس کی ساری گرد پونچھ لے جاتا ہے ——— دوسری کے نیچے ایک بے خوف، مطمئن کھلی دھوپ میں چمکتا پاؤں لیکن ٹھہرا ہوا۔ جو اسے دھندلا دیتا ہے۔

شانتا کے لیے بہت حیرتناک بات تھی۔

دوسرے دن شانتا نے دریافت کیا لیکن اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ شانتا نے اس کے پاؤں کو کب چھوا لیے تعجب تھا کہ اس کے پاؤں کا تمام انکار کہاں گیا؟ لیکن کچھ دنوں بعد شانتا کے پاؤں سے اسے عجیب قسم کی چبھن کا احساس ہونے لگا۔ اسے لگا وہ جب بھی میز پہ بیٹھتا ہے اسے کسی سانپ کا خوف کاٹنے لگتا ہے ——— اور روز بروز اس کی خلش بڑھتی جاتی تھی۔

اور پھر ایک روز، وہ میز شانتا کا پاؤں ——— اس کے دل میں خوف کا تیز کھنچاؤ وہ اس کے پاؤں کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا ——— وہ آگے بڑھا ..... آگے اور آگے ..... اور ایک تیز ——— اس نے بڑی تیزی سے شانتا کے پاؤں کو جھٹکا دیا۔ میز الٹ گئی اور اسے لگا دور وقت کے پچھلے موڑ پر رکھی وہ میز الٹ گئی ہے اور اس کے نیچے کے پاؤں لہولہان ہیں۔

پروفیسر چٹرجی (بسلسلہ صفحہ ۱۴)

موت ایک عالم کی نہیں ایک عالم کی موت ہے۔ ان کی موت کے بعد جب تصور میں ایک ہیولا اٹھنے لگتا ہے تو کسی شاعر کا یہ شعر اس پر ہر جگہ کندہ نظر آتا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

انسان ——— ایک مکمل "انسان" کی واقعی وہ تصویر تھے۔ الوداع! اے بنگال کے لائق فرزند الوداع ——— بھارت کے علم و ادب کے نامور شہسوار الوداع ع

"ڈھونڈیں گے" اگر ملکوں ملکوں
ملنے کا نہیں "نایاب ہے تو"

÷✻÷✻÷✻÷

انور حسین انور

غزل

سردی گرمی ہر موسم سے رہتی ہے بیگانی بھوک
ہم جب اپنے شہر سے نکلے، ہم نے تب پہچانی بھوک

وقت پڑا تو چھین ہی لے گا میرے حصے کی روٹی بھی
تیرے ٹھوس اصولوں کو بھی کر دے گی بے معنی بھوک

کیسے کیسے وقت گذارے، سوچوں تو دکھ ہوتا ہے
میرے قسمت کی چھلنی میں لمحہ لمحہ چھانی بھوک

سناٹوں میں تنہائی میں، گردش میں بھی، غربت میں بھی
ہر اک حال میں ساتھ رہی ہے میرے یہ متانی بھوک

شہر شہر کہرام ہے برپا، چین نہیں، آرام نہیں ہے
مانگ رہی ہے جسم کے ٹکڑے ہر غم سے انجانی بھوک

سوچوگے تو پیٹ جلے گا ذہن کی حرکت رک جائیگی
ضبط کیا تو ہو جائے گی خود ہی پانی پانی بھوک

یہ وہ دور ہے جس نے ہر کام کو ممکن کر ڈالا ہے
بل جائے گا آج کے انساں میں تیرا بھی ثانی بھوک

مرتے مرتے بھی اے انور بھوک نہیں مٹ پائے گی
پیٹ بھرا تو لگنے لگی ہے اب مجھ کو جسمانی بھوک

سنگدل

انگریزی کہانی

سمرسیٹ مام

ترجمہ ہلال الدین عثمانی

○○○

ہانس کے باورچی خانے میں واپس آیا تو گھر کا مالک فرش پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ اس کی بیوی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور خوفزدہ نظروں سے ہانس کے دوست ولی کو دیکھ رہی تھی۔ ہانس نے میز کے پاس آکر گلاس میں شراب ڈالی اور ایک ہی بار میں گلاس خالی کر کے رکھ دیا۔

"بڑی بُری حالت بنا دی ہے اس نے تمھاری!" ولی نے ہنس کر کہا۔

ہانس کے چہرے پر ناخونوں کے نشان تھے، اور ان میں سے خون نکل رہا تھا۔

"بچ گیا، ورنہ اس کتیا نے تو میری آنکھیں ہی نکال ڈالی ہوتیں۔ خیر اب تم جاؤ اس کے پاس۔ وہ آرام سے لیٹی ہوئی ہے۔"

ولی لڑکی کے پاس جانے سے ہچکچایا، لیکن اس ڈر سے کہ کہیں ہانس اس کا مذاق نہ اڑائے، وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ لوٹ آیا۔

"وہ تو بے ہوش پڑی ہے" اس نے کہا۔

"تو کیا ہوا؟"

"اس حالت میں میں کچھ نہیں کر سکتا!"

"تم کیسے مرد ہو؟"

ہانس اور ولی راستہ بھول گئے تھے، اس گاؤں میں پہنچ کر انھوں نے ایک دروازہ پر دستک دی تھی۔ لڑکی نے دروازہ کھولا تھا اور "سوئی سونس" کا راستہ دریافت کرنے پر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ہانس دروازہ ڈھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ گھر میں اس لڑکی کے علاوہ اس کے والدین تھے۔ وہ ابھی۔ ابھی کھانا کھا کر اٹھے تھے لڑکی کی ماں نے سوئی سونس کا راستہ بتایا۔ اس میز پر شراب کی بوتل دیکھ کر ہانس نے محسوس کیا کہ اسے پیاس لگی ہے۔ اس نے شراب کی بوتل مانگی اور ولی نے کہا کہ وہ اس کی قیمت ادا کر دے گا۔ ہانس کو یہ بات بُری لگی تھی۔ آخر وہ فاتح تھے۔ جرمنی کا فرانس پر قبضہ ہو چکا تھا فاتح جو چاہے لے سکتا ہے۔

عورت نے شراب کی دو بوتلیں نکال کر میز پر رکھیں ولی نے جیب سے ۲۰ فرانک نکال کر اسے دیئے۔ پھر وہ اور ہانس بیٹھ کر شراب پیتے ہوئے آرام سے باتیں کرنے لگے۔

"تم راستہ معلوم کرنے آئے تھے یا [illegible]

دیا گیا ہے۔ اب تم جاؤ یہاں سے"۔
لڑکی نے کہا۔
"چلو اب چلیں" ولی نے کہا۔
"ہاں لے جاؤ اسے" لڑکی نے کہا۔
"لیکن جانے سے پہلے تمھارا بوسہ لینا چاہوں گا"
لڑکی ایک قدم پیچھے ہٹی تھی، لیکن تبھی ہانس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ لڑکی کا باپ آگے بڑھا تو ہانس نے اسے زور سے دھکا دے کر زمین پر پٹخ دیا پھر اس نے لڑکی کی ماں کو بھی جھٹک کر ایک طرف ہٹایا۔ اور لڑکی کو کھینچ کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔

× × ×

لڑکی میز کے سامنے بیٹھی آلو چھیل رہی تھی وہ ہانس کو دیکھتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی
"تم پھر آگئے؟"
"ڈرو نہیں۔ دیکھو میں تمھارے لیے ریشمی جرابیں لایا ہوں"
"لے جاؤ انھیں واپس!
چلے جاؤ یہاں سے!"
ہانس جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گیا۔
"مجھ سے اتنی ناراض کیوں ہو؟ میں نے تمھارا کوئی خاص نقصان تو نہیں کیا اس وقت میں نشہ میں تھا۔ وہ ہماری فتح کا نشہ بھی تھا"
"تمھارے والدین کہاں ہیں؟"
"کھیتوں میں کام کر رہے ہیں"
"مجھے بھوک لگی ہے۔ کچھ روٹی اور پنیر دو، ایک گلاس شراب۔ میں قیمت ادا کر دوں گا"۔
لڑکی ہنسی۔ اس کی ہنسی میں طنز تھا۔ ایک ماہ سے اس نے پنیر کی شکل تک نہیں دیکھی تھی اور پیٹ بھر روٹی بھی نہیں کھائی تھی۔

"ہمارے سبھی مویشی چھین لیے گئے ہیں" اس نے کہا۔
"لیکن ان کی قیمت تو نہیں چکائی گئی ہے"
"کیا ان نوٹوں کو ہم کھائیں گے؟ پھر ان کی قیمت ہی کیا ہے؟" وہ رونے لگی۔
"دیکھو، میں بُرا آدمی نہیں ہوں"
ہانس نے ہمدردی سے کہا "کل میں تمھارے لیے پنیر اور گوشت لے کر آؤں گا"
"مجھے تمھاری کوئی چیز نہیں چاہیے۔ انھیں ہاتھ لگانے سے قبل میں مرجانا بہتر سمجھوں گی"

× × ×

فوجیوں کو اپنی مرضی سے گاؤں میں گھومنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے ہانس کسی کام کے بہانے دس دن بعد لڑکی کے یہاں گیا اس کے والدین اس وقت گھر پر تھے
"میں آپ کے لیے کچھ لایا ہوں" ہانس نے کہا اور بنڈل سے پنیر، گوشت مچھلیوں کے کچھ ڈبے نکال کر ان کے سامنے رکھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر عورت کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ ہانس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔
"تم بہت اچھے ہو!" اس نے کہا۔
"بیٹھو کچھ پینے کے لیے لاؤں، پیاس لگی ہوگی!"
"ہاں" ہانس بیٹھ گیا "پچھلی بار جو گوشت لایا تھا وہ اچھا لگا؟"
"بہت اچھا!"
"آئندہ کچھ اور لانے کی کوشش کروں گا۔ انیت نے بھی پسند کیا تھا؟"
"اس نے تو اسے ہاتھ تک نہیں لگایا"
ہانس کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ آئندہ جب وہ آیا تو انیت اکیلی تھی۔ وہ اس کے پاس سے اس طرح گزری گویا جیسے وہ آدمی نہیں کوڑا کرکٹ ہو۔
"ٹھہرو۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں"

"بولو۔"

"تمھارے والدین کا رویہ بدل چکا ہے۔ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتے۔ تمھارا رویہ کیوں نہیں بدل رہا ہے؟"

انیت نے پیٹ پر سے کپڑا ہٹا کر اسے دکھایا۔

ہانس نے دیکھا تو ایک لمحہ کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انیت کرسی پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہانس اس طرف بڑھا اور اسے اپنی باہنوں میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "میری انیت!"

انیت نے ہانس کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ "خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

× × ×

ہانس انیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ انیت پر اسے ترس آرہا تھا۔ تبھی اسے محسوس ہوا کہ اسے انیت سے پیار ہے یہ ایک نیا احساس تھا۔

"تم کیتھولک ہو؟" انیت کی ماں نے ایک بار پوچھا تھا۔"

"ہاں"

انیت کے والد نے کہا "تمھاری یہ بات سن کر میں خوش ہوں۔ ہمارا ایک ہی بیٹا تھا جو اب دنیا میں نہیں ہے۔ انیت بھی اس گھر سے چلی جائے گی تو یہ گھر بڑا سونا لگے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں آپ کا مطلب"

ہانس نے کہا "اس بارے میں میں نے بھی سوچا ہے۔ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ وہ والد کے ساتھ رہے گا اور میں یہاں فرانس میں۔ ویسے بھی فرانس میں کام کرنے والے محنتی آدمیوں کی کمی ہے۔"

"تب تو اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے" انیت کی والدہ نے کہا۔

"چپ رہو!" انیت نے چیخ کر کہا۔ اسے دکھتی ہوئی آنکھوں سے ہانس کی طرف دیکھا "میری منگنی ایک ٹیچر سے ہو چکی ہے اور اس جنگ کے بعد ہماری شادی ہونے والی ہے۔ وہ تمھاری طرح تندرست اور خوبصورت نہیں ہے وہ چھوٹے سے قد کا دبلا پتلا آدمی ہے لیکن اس کے چہرے پر ذہانت کی چمک ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے اور اس کی سب سے بڑی طاقت اس کی روحانی عظمت ہے۔ وہ تم لوگوں کی طرح وحشی نہیں ہے۔ وہ مہذب اور با اخلاق ہے تہذیب اسے ورثہ میں ملی ہے۔ میں اسے پیار کرتی ہوں۔"

یہ سن کر ہانس اداس ہو گیا۔

"کہاں ہے وہ آج کل؟"

"کہاں سوچتے ہو تم؟" جرمنی میں وہ قیدی ہے جبکہ تم یہاں گلچھرے اڑا رہے ہو۔"

وہ اٹھ کر جلدی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

کچھ دیر تک سکوت جاری رہا۔

ہانس شیمپین کی بوتل کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر انیت کی ماں نے کہا "تم واقعی اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"سچ مچ مجھے پیار ہے انیت سے۔"

"شادی کے بعد تم یہیں رہو گے؟ ہمارے گھر میں رہ کر کھیتوں پر کام کرو گے؟"

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ہانس وہاں سے چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ انیت کے والدین اس کے طرفدار ہیں۔ لیکن انیت کا رویہ ویسا ہی رہا۔

ایک دن جب ہانس آرہا تھا تو انیت کی ماں اسے باہر کھیتوں میں ملی۔ اس نے کہا "پیئر گاداں مر گیا ہے۔"

"پیئر گاداں کون؟"

"وہی ٹیچر جس سے انیت شادی کرنے والی تھی۔"

"اس کی موت کا پتہ کیسے چلا؟"

"اس کا ایک دوست قید سے بھاگ نکلا ہے۔ آج کل وہ سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ وہیں سے انیت کو خط لکھا ہے جیل میں بڑا دستہ ہوئی تھی۔ کیونکہ قیدی روٹی مانگ رہے تھے

گولی چلی۔ دوسرے قیدیوں کے ساتھ پیئر بھی مارا گیا۔ اب کچھ دنوں کے لیے انیت سے نہ ملو تو اچھا ہے۔"

× × ×

اس کے دس دن بعد انیت کے والدین نے اسے بلا کر کہا "اب یہ ضد چھوڑ دو بیٹی پیئر مر چکا ہے۔ ہانس تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے وہ ہمارے یہاں رہے گا تو کھیتی باڑی کا کام سنبھال لے گا آخر وہ ہمیں کیا کیا تو دیتا رہتا ہے۔"

"آپ لوگوں میں اگر تھوڑی سی بھی خودداری اور حب الوطنی کا جذبہ ہوتا تو اس کی دی ہوئی چیزیں اٹھا کر اس کے منہ پر مار دیتے۔"

"ان چیزوں کا تمہیں بھی تو فائدہ ہوا ہے۔"

"نہیں، کبھی نہیں!"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہانس جو گوشت اور پنیر لایا کرتا تھا وہ تم نے کسی دوسری شکل میں کھائی ہیں جو سوپ تم پیتی رہی ہو اس میں گوشت کے کچھ ٹکڑے ڈال دیا کرتی تھی۔ اور سلاد میں جو تیل ڈالا جاتا تھا وہ بھی ہانس ہی لایا کرتا تھا۔"

انیت نے آہ بھری اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں "ہاں جانتی ہوں میں۔ میں نے کوشش کی تھی کہ یہ چیزیں نہ کھاؤں لیکن مجبور تھی۔ بھوک کے سامنے مجبور تھی۔ ... ہاں میں نے ہانس کا لایا ہوا گوشت اور تیل استعمال کیا ہے ۔۔ یہ چیزیں دراصل میں نے نہیں، میرے اندر کے بھوکے شیطان نے کھائی ہیں۔"

"کچھ بھی ہو یہ تمام چیزیں تمھارے پیٹ میں گئی ہیں"

"لعنت ہے! نفرت ہے مجھے اپنے آپ سے۔ جرمنوں نے پہلے اپنے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے ہماری ہمت پست کی اور اب وہ بھوک سے ہماری ہمت توڑ رہے ہیں۔"

دوسرے دن ہانس آیا۔ انیت نے اس کی طرف دیکھا لیکن بولی نہیں۔ ہانس مسکرایا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آج تم مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں نہیں چلی گئیں!" ہانس نے کہا!

"اس وقت میرے والدین کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ بیٹھ جاؤ"

"میرے والدین تم سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تم بہت چالاک ہو، کھانے پینے کی چیزیں دے دے کر تم نے اپنا حامی بنا لیا ہے۔ لیکن میں صاف صاف کہنا چاہتی ہوں کہ میں ہرگز تم سے شادی نہیں کروں گی۔"

"انیت" ہانس نے کہا "میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ اب جب پیئر نہیں رہا تو مجھ سے شادی کرنے میں کیا اعتراض ہے؟"

"اسے جرمنوں نے گولی مار دی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے۔"

"میں یہ بات کبھی نہیں فراموش کروں گی کہ تم جرمنی ہو اور میں فرانسیسی۔ میں کسی بھی دوسرے نوجوان سے شادی کر سکتی ہوں۔ میں تم سے یہی کہوں گی کہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ"

"لیکن یہ میرا بھی بچہ ہے۔"

"تم نے غصہ کی حالت میں جو کچھ کیا ہے اسی کا نتیجہ ہے یہ پھر اس سے تمھارا کیا واسطہ ہے؟"

"تم نہیں سمجھیں۔ جب مجھے پتہ لگا کہ تمھاری کوکھ میں میرا بچہ ہے تو مجھے اچانک تم سے پیار ہو گیا۔ یہ بچہ میرے لیے سب کچھ ہے۔ سب کچھ۔"

انیت نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھ میں عجیب سی چمک تھی جیسے وہ فتح کی چمک ہو۔

"تم میرے دشمن ہو اور رہو گے۔ میں فرانس کو آزاد ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ جن لوگوں نے میرے ملک پر حملہ کیا ہے میں ان کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتی مجھے نفرت ہے تم سے اور تمھارے اس بچے سے بھی۔"

کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

جرمن فوجوں کو فرانس سے باہر بھیجا جا رہا تھا۔ افواہیں تھیں کہ وہ روس جا رہی ہیں۔ پالسن کئی دنوں تک بہت مشغول رہا اور وہ انیت کے یہاں بھی نہ جا سکا۔

× × ×

جس دن وہ جانے والا تھا انیت کی ماں نے اسے ایک لڑکے کی پیدائش کی خوشخبری دی۔

پالسن خوشی سے اچھل پڑا "اتوار کے دن پیدا ہونے والا بچہ خوش قسمت ہوتا ہے۔ آؤ اس خوشی میں شیمپین کی بوتل کھولیں۔ انیت کا کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے بچے کے سر پر گھنے بال ہیں، اور تمہارے ہی بالوں جیسے سنہرے۔ اس کی آنکھیں بھی تمہاری آنکھوں جیسی نیلی ہی ہیں بڑا ہو کر بالکل تمہارے جیسا بنے گا!"

"میں کتنا خوش ہوں!" پالسن نے کہا "دنیا کتنی خوبصورت ہے! انیت کہاں ہے؟ میں اس سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔"

"شاید اس وقت وہ تم سے نہ ملے۔"

"کم سے کم بچہ تو دکھاؤ۔"

"میں جا کر لاتی ہوں۔"

وہ انیت کے کمرے میں گئی اور اسی لمحہ جاتی ہوئی واپس آئی۔ "کمرہ خالی ہے۔ انیت اور بچہ دونوں وہاں نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

گھر میں انھیں تلاش کیا جانے لگا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دیئے۔

"میرے ساتھ آؤ" انیت کی ماں نے کہا اور وہ اس نالے کی طرف بڑھی جو ان کے گھر سے کچھ دور پر تھا۔

وہ گھر سے نکلے تو انھوں نے دیکھا انیت سامنے سے آ رہی ہے، ٹھنڈ کی وجہ سے اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔

"تم کہاں سے آ رہی ہو؟" ماں نے پوچھا

انیت نے کوئی جواب نہیں دیا اور پالسن کے سامنے کھڑی ہو گئی "تم ٹھیک وقت پر آئے ہو۔"

"بچہ کہاں ہے؟" ماں زور سے چیخی۔

"میں اس نالے میں پھینک آئی ہوں۔ جب تک وہ مر نہیں گیا میں نے اسے نالے میں ڈبوئے رکھا۔"

پالسن چیخ پڑا۔ جیسے کوئی جانور مرنے سے پہلے چیختا ہے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا، اور لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔ انیت نیچے گر پڑی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

●●

پریس رجسٹریشن

آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "معلم اردو" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جاتی ہیں۔

۱۔ مقام اشاعت — لکھنؤ

۲۔ وقفۂ اشاعت — ماہوار

۳۔ پرنٹر کا نام قومیت اور پتہ۔ اظہار احمد، ہندوستانی۔ ۱۹/۵۰۰ راما دھین سنگھ روڈ۔ لکھنؤ ۳

۴۔ پبلشر کا نام اور پتہ: اظہار احمد۔ ہندوستانی۔ ۱۹/۵۰۰ راما دھین سنگھ روڈ۔ لکھنؤ ۳

۵۔ ایڈیٹر کا نام قومیت اور پتہ: اظہار احمد، ہندوستانی ۱۹/۵۰۰ راما دھین سنگھ روڈ۔ لکھنؤ ۳

۶۔ ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حقدار ہیں یا اس کے تمام سرمایہ میں ایک فیصد سے زیادہ کے حقدار ہیں — اظہار احمد

میں اظہار احمد اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

اظہار احمد (پبلشر)

(مزاحیہ)

مسٹر انداز

محمد شمیم الاسلام :-

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں ان کا نام فرقان احمد ہے، لیکن میرے خیال میں ان کو مسٹر انداز کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یوں تو وہ بہت ہی بھلے آدمی ہیں۔ کسی کو تنگ کرنے یا ضرر پہونچانے کی ان کی قطعی نیت نہیں ہوتی لیکن ان کو ہمیشہ دوسروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ کر لینے کی عادت پڑگئی ہے۔ اس اندازہ کی وجہ سے وہ ہم پر سوالات کی بوچھار کر دیتے ہیں درحقیقت ان کا یہ طرزِ عمل ہم کو بہت کھلتا ہے۔ بس مروت اور اخلاق کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پاتا۔ لیکن وہ کبھی سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ مجھے ان کی یہ سب باتیں قطعی پسند نہیں۔

میں ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہوں۔ صبح دس بجے جاتا ہوں اور شام کو چھ بجے واپس ہوتا ہوں۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ کبھی دوسروں کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ نہ اپنے کام میں کسی دوسرے کا دخل دینا ہی مجھے پسند ہے۔

لیکن مسٹر انداز کو دیکھئے۔ نو بجے ہیں۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر جا رہا ہوں تاکہ سوا نو بجے کی بس مل جائے کہ پیچھے سے آواز سنائی دی" ارے بھئی ذرا ٹھہر جائیے"

میں نے گھوم کر دیکھا بڑی مہری کا پائجامہ، ڈھیلی ڈھالی اچکن جس کے بٹن کھلے ہوئے۔ منہ میں پان، ہاتھ میں گھڑی، گورا گٹھیلا بدن، چندیا صاف، عمر کوئی ساٹھ سال کے پیٹے میں ہوگی۔ یہ تھے مسٹر انداز۔

میں نے کہا' معاف کیجئے گا بھائی صاحب میں دفتر جا رہا ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔"

" ہاں، ہاں دفتر تو جانا ہی ہے۔ کون روکتا ہے؟ دفتر کون اتنی دور ہے؟ اس قریب کے چھاپہ خانے میں تو آپ کام کرتے ہیں نا؟"

میں چونک پڑا' چھاپہ خانہ سے میرا کیا سروکار؟

'میں ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہوں" میں نے جواب دیا

" اچھا میں سمجھتا تھا کہ آپ چھاپہ خانہ میں کام کرتے ہیں۔"

"آپ نے ایسا کیوں کہا؟" میں نے دریافت کیا۔

'کل شام کو میں نے آپ کو چھاپے خانے کے قریب سے ہو کر آتے دیکھا تھا اس لیے میں سمجھا کہ شاید آپ وہیں کام کرتے ہوں گے۔"

" اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں وہیں کام کرتا ہوں اچھا

اب دیر ہو رہی ہے۔ معاف کیجئے گا۔" میں کہتے ہوئے لمبے لمبے قدم بڑھانے لگا۔

"ارے حضرت دفتر جانا ہے تو ایک منٹ بات چیت کرنے سے کون دیر ہو جائے گی۔ ہم نے بھی تو دفتر میں کام کیا ہے کئی دفتر دیکھ چکا ہوں۔" مسٹر انداز نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

میں آگے بڑھا لیکن دیر ہو چکی تھی بس اسٹینڈ پر پہونچتے پہونچتے سوا نو بجے کی بس چھوٹ چکی تھی۔ دوسری بس میں دفتر کچھ تاخیر سے پہونچا جس کی وجہ سے انچارج کی گھڑکیاں سننا پڑیں۔

شام کو میں دفتر سے لوٹ رہا تھا کہ مسٹر انداز سے پھر ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان کی آنکھ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن وہ بھلا کب چھوڑنے والے تھے۔ سامنے آکر کھڑے ہو گئے اور مسکراتے ہوئے بولے"۔ ارے حضرت! سویرے تو ہم سے دو باتیں کرنے کے لیے فرصت نہ تھی اب تو ذرا ٹھہر جائیے۔

میں انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اخلاق و مروت کے ناطے مجھے رکنا ہی پڑا۔ رکنے کو تو میں رک گیا، لیکن گھر پر بھی کئی کام تھے، اس لیے بڑی انکساری اور سماجت کے لہجے میں بولا۔" کیا کروں اتنا مشغول آدمی ہوں کہ ایک منٹ کے لیے بھی فرصت نہیں ملتی اب بھی گھر پر کئی کام ہیں۔

"ارے کام! کام! جانے بھی دیجئے۔ کیا ہم نے کام نہیں کیا ہے؟ دن میں چوبیس چوبیس گھنٹہ کام کیا ہے پھر بھی کبھی ایسا نہ ہوا کہ بات چیت کے لیے کم سے کم ایک گھنٹہ فرصت نہ نکالی ہو۔"

میں انہیں دو ٹوک جواب دے سکتا تھا مگر یہ سوچ کر کہ وہ پھر کچھ بات نہ چھیڑ دیں گے، میں خاموش ہو رہا، لیکن مسٹر انداز کب خاموش رہنے والے تھے۔ بولے، "خیر آپ کا دفتر تو بہت دور ہے نا؟ آپ کو بس سے جانا چاہیئے، پیدل چلنا مناسب نہیں ہوگا۔ پیدل چلتے ہیں نا آپ؟ اتنی دور چلنا اور پھر دن بھر کام کرنا یہ تندرستی کے اصول کے خلاف ہے۔"

جہاں پر ہم کھڑے ہو کر بات کر رہے تھے وہاں سے ہر طرف کی بسیں جاتی ہیں۔ ایک گاڑی مجھ سے بالکل چھوتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے سوچا ایک طرف کھڑے ہو جائیں، جان کو خطرے میں ڈالنے سے کیا فائدہ۔ لہٰذا دوسری جگہ کھڑے ہوتے ہوئے میں نے کہا " میں تو روز بس ہی سے جاتا ہوں آپ کو کس نے بتایا کہ میں پیدل جاتا ہوں؟"

یوں ہی میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ پیدل ہی جاتے ہوں گے۔ آپ ایسے نوجوان اکثر دفتر پیدل ہی جاتے ہیں۔ دوسرے آپ کا جوتا بہت گھسا ہوا ہے جس سے عام طور پر یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اچھا یہ میگزین آپ کہاں سے لائے ہیں؟

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میگزینوں سے دلچسپی ہے رسالوں اور میگزین وغیرہ پڑھنے کی اچھی عادت ہے، اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میرے ہاتھ میں دراصل ایک ریلوے گائڈ تھی جس کی طرف ان کا اشارہ تھا۔

میں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ رسالہ نہیں ریلوے گائڈ ہے۔ سنتے ہی بولے

"اچھا؟ کیا ابھی خرید کر لا رہے ہیں آپ؟"

"جی نہیں۔ اپنے بھائی کے گھر سے لا رہا ہوں میں نے جواب دیا۔"

مسٹر انداز نے اپنا سر اس زور سے اور اس انداز سے ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں۔

بولے " اوہو۔ تو کہیں جانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں تو" میں نے جل کر کہا۔

"پھر یہ گائڈ کیوں؟

ایک دوست نے مانگی تھی اس لیے لیے جا رہا ہوں"۔

"وہ کہاں جا رہے ہیں؟ شاید چھٹی پر جا رہے ہیں"۔

سرکاری آفس میں چھٹی کے دن ہیں نا؟"

"میرے دوست سرکاری ملازم نہیں ہیں" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "یہ تو مجھے بھی علم نہیں ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔" انھوں نے گائڈ مانگی اور میں گائڈ لیے جا رہا ہوں۔ گائڈ تو یوں بھی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے دیکھا جا سکتا ہے۔

"جی ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔" مسٹر انداز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن اپنا خیال یہ ہے کہ آپ کے دوست ضرور کہیں جا رہے ہیں۔ آج کل ریل گاڑیوں کے حادثے بہت ہو رہے ہیں۔ انجن الٹ جاتے ہیں اور جانیں چلی جاتی ہیں۔ ان کو مشورہ دیجیے کہ انجن کے پاس ڈبے میں کبھی نہ بیٹھیں پچھلے ڈبے میں جہاں تک ممکن ہو بیٹھیں۔ اس صورت میں اگر گاڑی الٹ بھی جائے تو ان کا کچھ نہ بگڑ سکے گا۔"

مجھ سے اب نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ "اچھا اب اجازت دیجیے پھر ملیں گے۔" اور میں آگے بڑھ گیا

یہ صاحب بھی عجیب آدمی ہیں ہر ایک کے کام میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ غیر ضروری سوالات کی بوچھار ان کی عادت میں شامل ہے۔ ویسے تو میں خود کو بہت سمجھدار آدمی سمجھتا ہوں لیکن اخلاق و مروت کی وجہ سے ان سے یہ نہیں کہا جاتا کہ مجھے آپ کا یہ برتاؤ پسند نہیں ہے۔ اس کا سبب ایک اور ہے وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے گفتگو فرماتے ہیں۔ میں کتنا ہی جھنجھلاؤں اس کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔ اس لیے مجھ سے یہ مروتی نہیں ہو پاتی

ڈاکیہ خط لایا۔ میں خط لیکر گھر میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ مسٹر انداز نے دور سے مجھے دیکھ لیا۔ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں لفافہ کھول ہی رہا تھا کہ پوچھنے لگے۔

"کہاں سے آیا ہے؟ والد صاحب نے بھیجا ہوگا۔"

"جی نہیں۔ میرے والد صاحب کا تو کب کا انتقال ہو چکا ہے"

"تو پھر کس نے بھیجا ہے۔ والدہ صاحبہ نے لکھا ہوگا؟"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"پھر بھی پتہ کی تحریر سے تو معلوم ہو سکتا ہے"

"کیوں؟ کسی دوسرے سے بھی پتہ لکھوایا جا سکتا ہے" میں نے کہا۔

"خیر کس نے لکھا۔ اب تو آپ دیکھ چکے لفافہ؟"

"بہن نے" میں نے جواب دیا۔

"پتہ کی تحریر بھی انھیں کی ہے نا؟" مسٹر انداز نے پوچھا۔

"جی نہیں، کسی اور کی ہے" میں نے کہا جس سے وہ مایوس ہو گئے لیکن ظاہر نہیں ہونے دیا اور بولے "کیا لکھا ہے آپ کی بہن نے؟"

"ابھی پڑھ رہا ہوں۔"

"آپ تو بہت دھیرے دھیرے پڑھتے ہیں، میں تو ایک سرسری نگاہ ڈالکر پورے خط کا مطلب نکال لیتا ہوں" وہ بولے تھا کہ علمی کے بارے میں اگرچہ نیر پڑھ لینے پر مجھے انعام ملا تھا پھر بھی میں نے اس کا ذکر نہ کیا اس ڈر سے کہ کہیں منہ سے نکل گیا تو ہزاروں سوال کر ڈالیں گے میں نے جان بوجھ کہا "بہن کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔"

"اچھا میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔"

"مجھے معاف کیجیے گا۔ میں جلدی میں غلطی کی حقیقت میں بہن کے یہاں لڑکی ہوئی ہے"۔

"جی۔ کیا پہلی لڑکی ہے؟" مسٹر انداز نے سوال کیا"

"یہ تیسری لڑکی ہے" میرے منہ سے نکلا اگر کچھ اور کہتا تو سوالات کا تانتا بندھ جاتا۔ "حضرت اس خط کا مجھے ابھی فوری جواب دینا ہے اس لیے اس وقت اجازت دیجیے پھر بات چیت ہوگی۔" آخر میں تنگ آ کر کہا۔

"ٹھیک فرماتے ہیں آپ۔ خط کا جواب تو فوراً دینا چاہیے۔ یہ اچھی عادت ہے میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں لیکن میرے یہاں رہنے سے کیا نقصان ہو رہا ہے" مسٹر انداز نے پوچھا۔

"انھیں شاید اس کا احساس نہیں تھا کہ ان کی موجودگی میں مسلسل سوالات کا جواب دیتے ہوئے خط لکھنا آسان نہ تھا

میں نے کسی صورت سے سمجھا بجھا کر اُنہیں باھر کیا اور خط لکھنے بیٹھ گیا لیکن دیر ہونے کی وجہ سے خط اس روز ہوائی ڈاک سے نہ بھیج سکا۔

اس طرح متعدد بار اسی قسم کے تجربے پیش آئے، مسٹر انداز کے اندازوں کی کوئی حد نہیں کبھی وہ پوچھتے ہیں کہ فلاں پکچر کیسی ہے؟ جب میں کہتا ہوں اسے میں نے نہیں دیکھا کہ اپنی رائے دے سکوں تو اُنہیں یقین ہی نہیں آتا کیوں کہ گزشتہ روز مجھے سینما گھر کے سامنے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے اُنھیں پر انداز لگانے کا موقع مل گیا۔

ایک روز میرا لڑکا بیمار تھا۔ مئی جون کی چلچلاتی دھوپ میں ڈاکٹر کو بُلانے جارہا تھا کہ وہ مل گئے۔ "کیا کرکٹ میچ دیکھنے جارہے ہیں۔ اس وقت اور کہاں جا سکتے ہیں؟" اُنھوں نے فوراً پوچھ لیا۔ میں نے خاموشی سے اُنہیں تا اور آگے بڑھ گیا۔

آخر کار میں نے ان سے نجات پانے کی ایک صورت ڈھونڈھ نکالی۔ میں ان سے سوال وغیرہ کرتا ہی نہ تھا سو چاکہ کیوں نہ ان کا امتحان لیا جائے؟ دوسرے روز جب صبح کو ملاقات ہوئی تو میں نے ہی پہلے حملہ کر دیا۔ پوچھ بیٹھا۔

"حضرت۔ آپ ترکاری خریدنے بازار کیوں جاتے ہیں قریب ہی میں دوکان ہے۔

"ارے بھائی میں قریب ہی والی دوکان کی طرف جا رہا ہوں۔ بازار کی طرف نہیں" جواب ملا۔

"اچھا آپ کے ہاتھ میں تھیلا دیکھکر میں سمجھا آپ بازار جارہے ہیں۔ آپ ہمیشہ بیگن ہی کیوں خریدتے ہیں۔ کبھی کبھی بھنڈی بھی کھا لیا کیجیے" میں نے پھر پوچھا۔

"واہ۔ میں تو ہمیشہ بھنڈی ہی خریدتا ہوں۔ آپ کو کس نے اطلاع دی کہ میں بینگن خریدنے والا ہوں" مسٹر انداز نے جواب دیا۔

"ایسے ہی۔ میں نے آپ کے چہرے سے انداز لگایا تھا خیر آپ رام لعل کی دوکان سے سودا خریدا کریں۔ وہ بہت پاجی ہے کم تولتا ہے، کستوری لعل کے یہاں سے لیا کیجیے اس کی تول اچھی ہے اور ترکاریاں بھی تازی دیا کرتا ہے۔"

اب مسٹر انداز کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا کہیں میں ان کا مذاق تو نہیں اُڑا رہا ہوں۔ وہ کچھ بگڑ کر بولے "ارے بھئی میں کستوری لعل کے یہاں سے ہی لیتا ہوں رام لعل کی طرف تو جا سکتا بھی نہیں۔

"میں نے کل آپ کو رام لعل کے چچا زاد بھائی سے بات چیت کرتے دیکھا تھا اس لیے میں نے انداز لگایا کہ آپ رام لعل کے یہاں سے ہی خریدتے ہیں" میں نے کہا۔ اب وہ سمجھ گئے ان کی تیوری چڑھ گئی اور وہاں سے کھسک گیے

دوسرے روز ایک تار آیا۔ جب میں تار لے رہا تھا تب اُنھوں نے دیکھ لیا اور میرے پاس چلے آئے۔ میں نے انداز لگایا کہ تار کے متعلق دریافت کریں گے، جواب کیلئے میں دل ہی دل میں تیاری کر رہا تھا۔ لیکن میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ آئے۔ مُسکرائے اور اپنی راہ چل دیئے۔ واقعی وہ کہیں جارہے تھے، اور بالکل بدل چکے تھے اس لیے ان کے بارے میں میرا اس بار کا انداز غلط ثابت ہوا اور وہ مجھے معاف کریں گے۔

●●●

اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ (بسلسلہ صفحہ)

بلکہ میں اسے ڈاکٹر فاروقی کی ادبی ناانصافی کہنے پر مجبور ہوں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ان بے حد طویل ناولوں کو پڑھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اس لیے اُنھوں نے ان ناولوں کا اس طرح سرسری طور پر ذکر کردیا ورنہ ان ناولوں کو پڑھنے والے ان کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، اچھا ہوتا جو ڈاکٹر صاحب ان ناولوں کا ذکر ہی نہ کرتے۔

ضمیمہ بیس۲۰ نکاتی پروگرام — ۱

نیا بیس ۲۰ نکاتی پروگرام

گذشتہ کامیابیاں اور مستقبل کی ہدایت

۱۹۸۲ء میں ہندوستان کا جو روپ ہے وہ ۱۹۴۷ء کے ہندوستان سے یہاں تک کہ دس سال پہلے کے ہندوستان سے بھی قطعی مختلف ہے۔

آج ہندوستان کا شمار دنیا کے چند سب سے بڑے صنعتی ملکوں میں کیا جاتا ہے، پانچ سالہ منصوبے کے دوران ٹیکنالوجی نے اس کے زرعی صنعتی میدانوں میں ایک حیرت انگیز تبدیلی لا دی ہے اور ملک میں تربیت یافتہ انفرادی قوت کا ایک زبردست خزانہ جمع کر دیا ہے۔ ملک کو خود کفالت کی منزل کی طرف گامزن کرنے کے لیے تیزی سے پیش رفت ہوئی ہے۔ اگرچہ ہماری فی کس آمدنی زیادہ نہیں ہے، پھر بھی ملک نہ صرف اپنے پرانے مسائل بلکہ اُن کے مسائل پر بھی قابو پانے میں نسبتاً بہتر پوزیشن میں ہے جو کہ ترقی اپنے ساتھ لائی ہے۔

ترقی کے عام پروگراموں کے علاوہ ۱۹۷۵ء میں ایک خاص سرگرمی کا آغاز کیا گیا تاکہ مختلف طبقوں کی مشکلات کا بوجھ کم کیا جا سکے۔ یہ تھا ۲۰ نکاتی پروگرام۔

اس پروگرام کے بہت سے مقاصد تو اب پورے کیے جا چکے ہیں ۱۹۷۶ء میں بندھوا مزدوری کو ختم کرنے کا قانون پاس کیا گیا۔ اسمگلروں کی جائیدادیں ضبط کرنے کے اقدام کیے گئے اور کم متوسط آمدنی والے لاکھوں لوگوں کو آمدنی ٹیکس سے مستثنٰی قرار دیا گیا۔

سڑک ٹرانسپورٹ کے لیے قومی پرمٹ سسٹم شروع کیا جا چکا ہے، پچاس لاکھ ہیکٹر رقبے میں آبپاشی کی سہولت مہیا کرنے کا نشانہ پورا کیا جا چکا ہے۔ زمینی پانی کے استعمال کے لیے ایک قومی اسکیم کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور شیر تھرمل پاور

دیہاتوں کی مربوط ترقی

خوشحالی کی جانب گامزن

زندگی کے مختلف روپ کا آئینہ دار ۔ اتر پردیش

مربوط دیہی ترقی اور قومی روزگار پروگرام کی تیز رفتار عمل آوری کے لیے دو سو کروڑ روپے کی رقم خرچ کی گئی ہے اور ریاست کے تمام ۸۸۵ ترقیاتی بلاکوں میں سے ہر ایک میں کمزور ترین ۶۰۰ خاندان خاص طور سے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے خاندان منتخب کر لیے گئے ہیں اور ۵٫۳۱ لاکھ خاندانوں کو غریبی کی سطح سے اوپر لانے کے لیے بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔

مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم ریاست کے تمام ترقیاتی بلاکوں میں نافذ کی جا چکی ہے۔ اس اسکیم سے اب تک ۸٫۴۲ لاکھ خاندان مستفید ہو چکے ہیں، جن میں ۵۲ ہزار خاندان اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ہیں۔

تمام ریاست میں گاؤں سبھاؤں کے انتخابات مکمل ہو گئے ہیں اور نئی پنچایتوں کی تشکیل کا کام شروع ہو چکا ہے۔

قومی دیہی روزگار اسکیم کے تحت گذشتہ سال ۵۳٫۱۳۵۸ لاکھ روپے کے اخراجات سے ۱۰۷٫۰۳ لاکھ انسانی یوم کے برابر روزگار کے مواقع پیدا کیے گئے۔

جنتا بایو گیس پروگرام کے تحت ۲۳۵۰ بایو گیس پلانٹ گذشتہ سال لگائے گئے اور ۴۲۶۱ اکائیوں میں کام تیزی سے چل رہا ہے۔

محکمۂ دیہی ترقی نے پینے کے پانی کی سہولت مہیا کرنے کی غرض سے ہریجن بستیوں میں تقریباً ۵۳۰۰ اور کنوؤں کی تعمیر کی ہے اور ہینڈ پمپ لگائے ہیں۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا

۲۰ نکاتی پروگرام

ہمہ گیر ترقی کا ضامن

جاری کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ ۔ اتر پردیش۔

اسٹیشن قائم کیے جا چکے ہیں۔

۱۹۷۵ء کے بیس نکاتی پروگرام کی کئی دوسری باتوں میں بھی کافی پیش رفت ہوئی ہے۔

بہت سے نشانے پورے ہو جانے، ہمارے عوام کی اقتصادی اور سماجی زندگی میں بعد میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور نئے پیدا ہونے والے خطرات سے یہ ضروری ہو گیا کہ اس پروگرام کو نئے سرے سے ترتیب دیا جائے اور اس کی پھر سے تشریح کی جائے۔

مختلف سرکاری سطحوں پر پورے غور و خوض اور صلاح و مشورے کے بعد ایک نئے بیس نکاتی پروگرام کا خاکہ تیار کیا گیا جس کا اعلان وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ۱۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو اپنے ایک قومی نشریے میں کیا۔

وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ نئے پروگرام کے تحت حکومت چاہتی ہے کہ:۔

۱۔ آبپاشی کے وسائل میں اضافہ کیا جائے، سوکھی زمین پر زراعت سے متعلق تکنیکی معلومات اور طریقے ایجاد کیے جائیں اور ان کی تشہیر کی جائے۔

۲۔ دالوں اور تلہن کی پیداوار بڑھانے کے لیے خاص کوششیں کی جائیں۔

۳۔ مربوط دیہی ترقی اور قومی دیہی روزگار پروگراموں کو مستحکم اور وسیع کیا جائے۔

۴۔ زرعی زمین کی حد ملکیت لاگو کی جائے۔ فاضل زمین تقسیم کی جائے اور تمام انتظامیہ اور قانونی اڑچنوں کو دور کر کے زمین سے متعلق سبھی معلومات اور اعداد و شمار جمع کیے جائیں

۵۔ زرعی مزدوروں کو ایک مقررہ اجرت دلانے سے متعلق قانونوں کا جائزہ لیا جائے اور موثر طور پر انھیں لاگو کیا جائے۔

۶۔ بندھوا مزدوروں کی آبادکاری کا انتظام کیا جائے

۷۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی ترقی کے پروگراموں میں تیزی لائی جائے۔

۸۔ جن دیہات میں پینے کا پانی دستیاب نہیں انھیں پینے کا پانی مہیا کرنے کا انتظام کیا جائے۔

۹۔ دیہی علاقوں کے ایسے کنبوں کو، جن کے پاس اپنے مکان نہیں، انھیں اس کے لیے زمین دی جائے اور مکان بنانے میں امداد دینے کے پروگرام ہیں ان میں توسیع کی جائے

۱۰۔ جھگی جھونپڑی بستیوں کے ماحول کو بہتر بنایا جائے۔ اقتصادی لحاظ سے کمزور طبقوں کے لوگوں کے لیے مکان تعمیر کرنے کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا جائے، اور زمین کی قیمتوں میں غیر ضروری اضافے کو روکنے کے لیے اقدام کیے جائیں۔

۱۱۔ بجلی کی تیاری زیادہ سے زیادہ کی جائے۔ بجلی بورڈوں کی کارکردگی بہتر بنائی جائے اور سبھی دیہات میں بجلی پہنچائی جائے۔

۱۲۔ درخت لگانے اور سماجی و فارم جنگل بانی کے پروگراموں کو موثر طور پر عملی جامہ پہنایا جائے اور بائیو گیس نیز توانائی کے دیگر متبادل ذرائع کو فروغ دیا جائے۔

۱۳۔ خاندانی منصوبہ بندی کو رضاکارانہ طور پر عوامی تحریک کی شکل میں فروغ دیا جائے۔

۱۴۔ عام ابتدائی صحت کی سہولیات بڑھائی جائیں اور کوڑھ تپدق اور اندھے پن کو قابو میں لانے کی کوشش کی جائے

۱۵۔ عورتوں اور بچوں کے فلاحی پروگرام میں تیزی لائی جائے۔ حاملہ عورتوں، دودھ پلانے والی ماؤں، اور بچوں خصوصاً قبائلی، پہاڑی اور پچھڑے علاقوں میں رہنے والوں کے لیے غذائیت بخش خوراک مہیا کرنے کے پروگرام تیزی سے چلائے جائیں

۱۶۔ چھ سے چودہ برس تک کے سبھی بچوں کے لیے بنیادی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے اور اس پروگرام کے تحت لڑکیوں کی تعلیم پر خاص طور سے زور دیا جائے نیز ان پروگراموں میں طلبا اور رضاکاروں کا تعاون حاصل

خوشحالی کی جانب گامزن زندگی کے مختلف رخ کا آئینہ دار اتر پردیش

سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں کی ترقی

کسی بھی حکومت کی سرگرمیوں کا تجزیہ کرتے وقت یہ ایک فطری امر ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ سماج کے کمزور طبقوں کے لیے کیا کچھ کیا گیا ہے۔

اتر پردیش میں کمزور طبقوں کے ۱۸٫۳۶ لاکھ سے زیادہ افراد کو گاؤں سبھا کی ۶٫۴۹ لاکھ ہیکٹر سے بھی زیادہ زمین گزشتہ اکتوبر تک الاٹ کی جا چکی ہے اور ۱۵ لاکھ سے زیادہ خاندانوں کو مکانات کے لیے زمین دے دی گئی ہے۔

اسپیشل کمپوننٹ پلان کے تحت ہریجنوں کی ترقی سے متعلق کاموں کے سلسلے میں گزشتہ دو برسوں میں ۱۷۸٫۰۲ کروڑ روپے خرچ کیے جا چکے ہیں ۱۹۱۴۴ ہریجن بستیوں کی بجلی کاری اور ۴۵۰۰ سے زیادہ کنووں، ۶۱۰۰ ہینڈ پمپوں اور ۲۴۴۹ ڈگیوں کی تعمیر، پینے کے پانی کی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے کی جا چکی ہے۔

اس کے علاوہ دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت ۴۱ ہزار سے زیادہ مکانات کی تعمیر ہو چکی ہے اور ۱۳۰۰ سے زیادہ دکانیں اقوام مندرجہ فہرست کے لوگوں کو الاٹ کردی گئی ہیں۔ اسی طبقے کے مزید ترقی کے پیش نظر ۱۲۱۶ ایکٹر زمین ان میں تقسیم کرنے کیلئے منظوری کردی گئی اس زمین میں سے ۱۸۷ ایکٹر الاٹ بھی کیا جا چکا ہے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا

۲۰ نکاتی پروگرام

ہمہ گیر ترقی کا ضامن

(جاری کردہ ۔ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

کیا جائے تاکہ بالغوں میں ناخواندگی کا اندھیرا دور کیا جا سکے۔

۱۷۔ مناسب قیمتوں کی دوکانوں کی تعداد بڑھاکر اور دور دراز کے علاقوں میں چلتی پھرتی دوکانیں کھول کر، صنعتی علاقوں میں کام کرنے والے طالب علموں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوکانیں کھول کر عام تقسیم کے نظام میں توسیع کی جائے۔ طلبا کو نصاب کی کتابیں اور کاپیاں ترجیحی بنیادوں پر مہیا کی جائیں اور صارفین کو استحصال سے بچانے کے لیے زور دار مہم چلائی جائے۔

۱۸۔ سرمایہ کاری کے ضابطوں کو نرم بنایا جائے اور صنعتی پالیسیوں کو زیادہ آسان بنایا جائے تاکہ ہم پراجیکٹوں کو بروقت پورا کر سکیں۔ اس کے علاوہ دست کاریوں، ہینڈ لوم اور دیگر چھوٹی اور دیہی صنعتوں کو ہر طرح کی سہولیات مہیا کی جائیں تاکہ وہ ترقی کر سکیں اور اپنی تکنیک کو جدید طرز دے سکیں۔

۱۹۔ اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور ٹیکس کی چوری کرنیوالوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے تاکہ کالا دھن بڑھنے نہ پائے۔

۲۰۔ سرکاری اداروں کی کارگزاری کو بہتر بنا کر، صلاحیت کے پورے استعمال اور اندرونی وسائل پیدا کر کے ان کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔

وزیر اعظم کے الفاظ میں " قوم کا یہ کارروائی نامہ ہماری ترقی کے مجموعی منصوبے کو دھیان میں رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہم کن کن خاص باتوں پر زور دیں کہ ہمارے مختلف طبقوں کی ترقی میں ٹھوس اور فوری نتائج سامنے آئیں۔"

وزیر اعظم نے اپنی نشری تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ ۱۹۷۵ میں جب پہلی بار ۲۰ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا گیا تھا تو میں نے آپ کو خبردار کیا تھا کہ آپ کسی معجزے کی توقع نہ کریں۔ پہلے کی طرح اب بھی غربت مٹانے کا طرف ایک ہی منتر ہے اور وہ ہے سخت محنت۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط اور اپنے نصب العین کے بارے میں واضح تصور ہمارے مشکل سفر میں آرام کے لیے نہ تو کوئی جگہ ہے اور نہ ہی وقت ہے۔ ہمارا نصب العین ہے "ستیہ میو جیتے" یعنی ہمیشہ سچ ہی کی جیت ہوتی ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہمیں ایک اور مثالی نعرہ یاد رکھنا چاہیے " شرم ایو جیتے" یعنی ہم احترام، ترقی اور خوشحالی تبھی حاصل کر سکتے ہیں جب ہم سخت محنت کریں اور اپنے آپ کو صداقت کی راہ پر گامزن کر دیں۔

" ہماری اقتصادیات ترقی کے راستے پر رواں دواں ہے یہ ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے کہ ہم ترقی کی اس رفتار کو برقرار رکھیں تاکہ ہمارے لاکھوں کروڑوں لوگوں کی زندگی سکھی بن سکے۔ یہ پروگرام ہر ایک فرد کا ہے اور پوری قوم کا ہے جس کی خدمت ترقی اور تعمیر کرنا ہمارا پہلا فرض ہے میں آپ سے اپیل کرتی ہوں کہ آپ اپنا دلی تعاون دے کر اس پروگرام کو کامیاب بنائیں۔"

نیا دور، نئے عزم

مومن خاں شوق

کم کرو باتیں، عمل اپنا دکھاؤ دوستو
دیش کی خاطر سے تن من دھن لٹاؤ دوستو
آئے گی خوشحالی پیداوار کی افراط سے
اپنی پیداوار، محنت سے بڑھاؤ دوستو
دیش کے دشمن ہی پھیلاتے ہیں افواہیں
دیش بھگتو! منھ پہ افواہیں نہ لاؤ دوستو
آج مستعدی، ڈسپلن وقت کی للکار ہے
کام نپٹاکر، قدم آگے بڑھاؤ دوستو
محنت و کوشش، دیانت کا سبق ذوق سے
دیش کو اس طرح دشمن سے بچاؤ دوستو

غلام محمد انور سلونوی

بیس نکاتی پروگرام

ہم کو دعوت دے رہا ہے بیس نکتوں کا محاذ
سیٹھ ساہوکار کے [illegible] اک ہی افتاد ہے
کام لے سکتا نہیں جبراً کوئی مزدور سے
اب مناسب طور پر مزدور کو اجرت ملے
اور رہائش کے لیے ہر خاندان کو [illegible]
آبپاشی کے [illegible] اہتمام
طالب علموں کے لیے [illegible] آسانیاں
علم میں سرکار کے آ جائے سبھی جائداد
صنعتیں جتنی بھی ہوں بہتر ہو سب کا انتظام
جتنی مزروعہ زمیں ہے اس کی پیمائش ہو اب
غلہ، صابن اور گھی کپڑے کی اب وقت پر
ہو ٹرافک کے لیے پرمٹ کا بہتر انتظام
جو بھی اب سامان اسمگلنگ کا پکڑا جائے گا
چور بازاری کا مٹ جائے گا اب نام و نشاں
رہبر ہندوستاں کا اب یہی اعلان ہے
ملک کی اس میں ترقی ہے اسے اپنائیے

متحد ہو کر کریں گے سر برقی کا محاذ
قرض کے چنگل سے ہر مزدور اب آزاد ہے
سب کو آگاہی ملی ہے تیرے منشور سے
جس قدر محنت کرے اتنی اسے قیمت ملے
اب نہ سڑکوں پر لگا مزدور کا بستر ملے
اور بجلی کے فوائد سے ہوں بہرہ ور عوام
ہوں [illegible] تعلیم کی ممکن سبھی آسانیاں
ٹیکس چوری کی وبا کا ہو مکمل انسداد
دور ہو بے روزگاری اور ملے ہر اک کو کام
جھوم سینوں کو زمیں ملنے کی گنجائش بھی ہو
زندگی کی ہر ضروری شے کی پھر قلت نہ ہو
ہو درآمد اور برآمد کا مکمل اہتمام
اب کسی حالت میں وہ ہرگز نہ چھوڑا جائے گا
گامزن ہے اب صداقت کی طرف ہندوستاں
دور حاضر کی صدا ہے وقت کا فرمان ہے
بیس نکتوں کو بہر صورت عمل میں لائیے

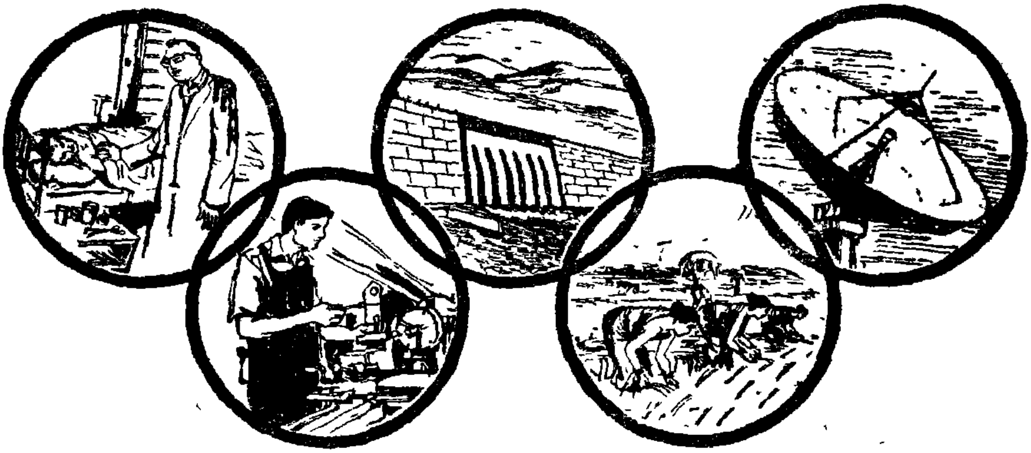
اب قدم راہِ صداقت سے نہ ہٹنا چاہیے
ایکتا کی راہ پر مل جل کے چلنا چاہیے



سدا بڑھتے قدم

نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان کے لئے بھارت کو دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام ملے ہیں۔

اسٹیڈیم ریکارڈ ٹائم میں تعمیر کئے گئے۔ ملک بھر اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہی گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن پر کھیل لوگوں کو دکھائے گئے۔ اس کے لئے کمپیوٹروں، الیکٹرانک ایکسچینجوں، مائکروویو اور مصنوعی سیارے کے ساتھ رابطوں کے عظیم سلسلے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔





تال میل کے ساتھ کی گئی سخت محنت کی یہ منہ بولتی مثال ہے

اگر ہم وطن تعمیر کے دیگر شعبوں میں بھی اسی لگن سے کام کریں تو اسی طرح کی کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

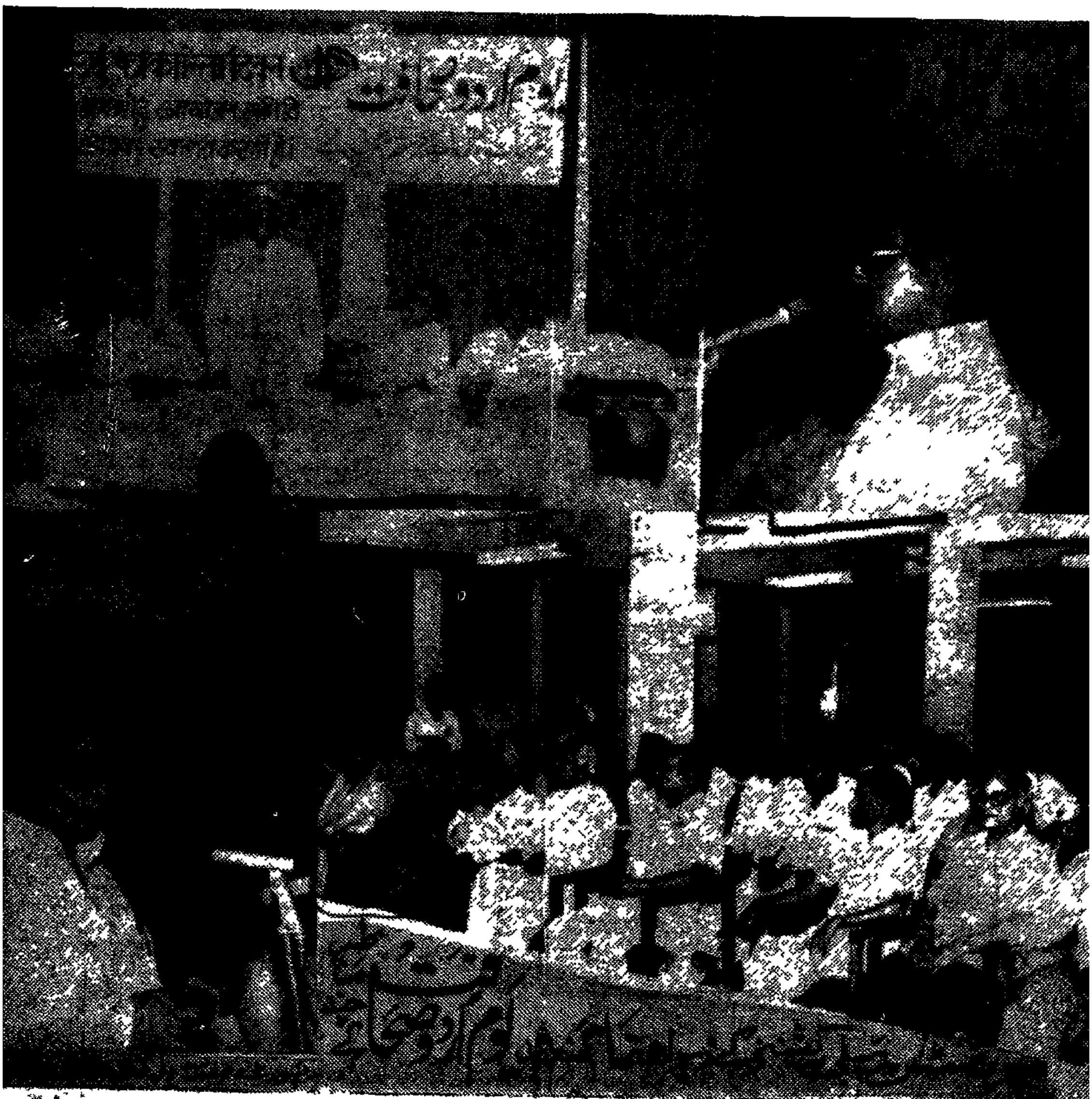
آیئے ہم سب مل جل کر
اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

davp 82/586


پاکیزہ
کی
لازوال موسیقی کے بعد اب پیش خدمت ہے
ایچ ایم وی اور
کمال امروہوی کا
ایک عظیم شاہکار۔ حسین گیت اور
بے مثال سنگیت کا سنگم
سُلطان رضیہ
موسیقار: خیام
٭ دلکش گانوں میں شامل ہیں (لتا منگیشکر) کی مدھر آواز میں
اے دل ناداں، جلتا ہے بدن۔ جنھیں سن کر آپ باغ باغ ہو
جائیں گے، سپریم اسٹیریو ایل پی اور میوزیکسٹ میں دستیاب
محدود اسٹاک: اپنے سنگیت خزانے میں اضافہ کرنے کے
خواہشمندوں کیلئے سپریم اسٹیریو ڈبل البم
جلد کیجیے: اپنے قریبی ایچ ایم وی ڈیلروں سے آج ہی رجوع کیجیے
بہترین تفریح پیش کرتے ہیں
ایچ - ایم - وی

لکھنؤ

MAY 1983



لکھنؤ

ماہنامہ

منیجنگ ایڈیٹر
افضال احمد انصاری

ایڈیٹر
اظہار احمد

تاریخ اشاعت
مئی ۱۹۸۳ء

جلد (۲)
شمارہ (۶)

قیمت

سالانہ : ــــــــــ پندرہ روپے
فی پرچہ : ــــــــــ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

جرنلسٹس پبلی کیشنز ۵۰/۱۹ ، راما دھین سنگھ روڈ لکھنؤ ۔

اظہار احمد۔ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و مالک نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر ۵/۱۹ راما دھین سنگھ روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اس شمارہ میں

○

اداریہ :

مضامین :

رپورٹ :

افسانے :

دو باتیں

اُردو صحافت کے ایک سو ساٹھ برس پُورے ہو چکے ہیں، اس موقع پر "معلم اُردو" کی جانب سے یہ اَدَنیٰ شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے صحافت کے جو اعلا معیار اُردو صحافت نے اپنی ابتدار ہی میں قائم کیے تھے، افسوس کہ بعد میں ان معیاروں میں ہم کوئی قابل قدر اضافہ نہ کرسکے بلکہ روز بہ روز وہ معیار کم سے کم تر ہی ہوتا چلا جارہا ہے' یہ بات الگ ہے کہ اب کتابت طباعت اور اشاعت کے سلسلے میں ہم کافی ترقی کرچکے ہیں' اردو کے پہلے اخبار کے مقابلے میں آج ہمارے اخبار کہیں زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر ہوتے ہیں ابتدائی، رسالوں کے مقابلہ میں آج ہماری زبان میں ایک سے ایک خوبصورت اور باتصویر رسالے شائع ہو رہے ہیں جنکی اعلا طباعت ہمیں اپنی سمت متوجہ کرلیتی ہے مگر اسے صحافت کی ترقی کہنا کسی بھی طرح درست نہ ہوگا کیوں کہ ان تمام اعلا معیاروں کے باوجود ہماری صحافت اور صحافیوں کا عام معیار برابر گر رہا ہے ہمارے یہاں گزشتہ پچاس برس کے مقابلہ میں آج اچھے صحافیوں کی سخت کمی ہے۔ ادبی رسالوں کو پیش نظر رکھ کر بھی اگر بات کیجائے تو ہمارے یہاں اب پنڈت دیا نرائن نگم، نیاز فتحپوری اور اس قسم کے بہترین مدیروں کا سخت نقدان ہے۔

اَدبی رسالے اوّل تو تعداد میں ہیں ہی کتنے ؟ اور جو ہیں بھی وہ پابندی سے شائع نہیں ہو پاتے۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں اَدبی رسالوں کی تاریخ میں اظہار، معیار، اور شعور جیسے رسالوں کی اشاعت ایک قابل فخر بات ہے مگر ان رسالوں کو باضابطہ رسالوں کے زمرہ میں نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ یہ رسالے

سال دو سال کے عرصے میں اپنے شمارے نکال پاتے ہیں جہاں تک روزناموں کا سوال ہے تو اگرچہ ہمارے یہاں بعض بہت بڑے روزنامے لکھنؤ، بمبئی، حیدرآباد، اور کلکتہ سے شائع ہوتے ہیں، مگر ان کا عام معیار بہرحال ایسا نہیں ہوتا کہ انھیں ہم ہندی یا انگریزی کے روزناموں کے مقابلہ میں رکھ سکیں۔
اُردو ہی کی بات نہیں ہندوستانی صحافت کی دنیا میں عام طور پر جو بات انتہائی تشویشناک ہے وہ ہے اخباروں اور رسالوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مسئلہ۔ یہ بات عام طور پر سبھی کو معلوم ہے کہ ملک کے تمام اہم روزناموں پر بڑے گھرانوں کی اجارہ داری قائم ہے اور وہ اُن بڑے گھرانوں کی آواز بازگشت بنکر رہ گئے ہیں، یہ بڑے گھرانے کروروں کا منافع دوسرے ذرائع سے کما رہے ہیں، اپنے اخباروں اور رسالوں کو اگر یہ بڑے گھرانے چاہیں تو کم داموں پر عوام کو فراہم کر سکتے ہیں مگر پچھلے ۲۔۳ برسوں میں کاغذ کے داموں میں روز افزوں اضافہ کی وجہ سے اول تو اخباروں اور رسالوں کی قیمتیں بڑھی ہیں اور کچھ ان بڑے بڑے اجارہ داروں نے بھی ان کی قیمتوں میں اضافہ ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اب تو صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ متوسط طبقہ کے افراد کے لیے اخبار خرید کر پڑھنا ایک مشکل کام ہو گیا ہے ظاہر ہے ہندوستان کے غریب عوام اخبار نہیں خریدتے۔ ان اخباروں اور رسالوں کی قیمتوں میں اضافہ کی مار سب سے زیادہ متوسط طبقے پر پڑتی ہے۔ اس کی قوت خرید یوں ہی کیا ہے اب اخباروں اور رسالوں کے داموں میں مسلسل اضافہ کی وجہ سے اُس کیلئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا ہے کہ وہ اخبار یا رسالے کیونکر خرید کر پڑھے اگر یہی صورتحال برقرار رہی اور رسالوں اور اخباروں کے داموں میں ایسے ہی اضافہ ہوتا رہا تو ایک دن ایسا بھی آئے گا (اور غالباً بہت جلد) کہ جب اخبار خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جانے لگے گویا امارت کے معیار ہی ایک سرے سے بدل جائیں گے پھر تو اخبار کی صنعت کلی طور پر سرمایہ داروں کے ہاتھ ہی چلی جائے گی، یعنی اخبار نکالیں گے بھی سرمایہ دار اور خریدیں اور پڑھیں بھی سرمایہ دار۔ جس طرح آج ہم کسی کے گھر میں ٹی، وی اور دوسرے آسائش کے سامانوں کو دیکھ کر اس کی مالی حالت کا اندازہ لگاتے ہیں، اس طرح کل کسی کے گھر میں کتنے اخبار اور رسالے خریدے جاتے ہیں، یہ دیکھ کر اُس کی مالی حالت کا اندازہ قائم کیا جائے گا۔

اخباری صنعت اور صحافت سے متعلق تمام لوگوں کو اس معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے اور کوئی ایسا ٹھوس قدم اٹھانے پر غور کرنا چاہیئے جس سے اخباروں اور رسالوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا اثر متوسط طبقہ کی قوت خرید پر نہ پڑنے پائے، چاہے اِس کے لیے اخباروں اور رسالوں کے داموں کو [illegible] کیوں نہ کرنا پڑے۔

جامِ جہاں نما

سلمان علی خاں

اُردو کے پہلے اخبار کے بارے میں آج تک محققین کے درمیان بڑا اختلاف رہا ہے کیونکہ دنیائے اُردو ادب کی اکثریت کافی عرصے تک مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے مشہور زمانہ اخبار

اُردو کا پہلا اخبار

دہلی اخبار' کو اُردو کا پہلا اخبار تسلیم کرتی رہی ہے جب کہ بعض محققین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مولوی اکرام علی کا بینہ اخبار 'اُردو اخبار' ہی اُردو کا پہلا اخبار تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو کا سب سے پہلا اخبار — جام جہاں نما' ہے جو ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری ہوا تھا۔ اگرچہ یہ وہ اخبار ہے جس کی اولیت اب تقریباً متنازع نہیں رہ گئی ہے، تاہم اس کی تاریخ اجرا کے بارے میں آج بھی اختلاف ہے۔

گزشتہ سال لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والی تقاریر اور بعض اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹوں، اور مقالوں میں جن گمراہ کن اور بے بنیاد خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے نہ صرف جام جہاں نما کی اولیت مجروح ہوئی ہے بلکہ تاریخ صحافت کا بھی خون ہوا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ "فارسی اور اُردو کا ملا جلا پہلا اخبار ۱۸۲۲ء میں نکلا تھا۔ ۱۸۳۶ء میں صرف اُردو کا اخبار شائع ہوا۔"

محمد عثمان غنی۔ جوائنٹ ایڈیٹر قومی آواز۔

۲۔ "جولائی ۱۹۸۲ء میں اُردو صحافت نے اپنے ایک سو ساٹھ سال پورے کر لیے۔"

رپورٹ۔ یو این آئی خبر رساں ایجنسی

۳۔ "۲۸ ویں مارچ ۱۹۲۲ء کو منشی سدا سکھ اُردو اور فارسی کا ایک مشترکہ اخبار جہاں نما کلکتہ سے جاری کر چکے تھے جو ۵۵ سال تک شائع ہوتا رہا۔"

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

اس طرح اب اگر ان تینوں اقتباسات کا بغور

مطالعہ کیجیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُردو کا پہلا اخبار ایک مشترکہ اخبار تھا جو ۱۸۲۴ء یا جولائی ۱۸۲۳ء یا ۲۷ مارچ ۱۸۲۳ء کو شائع ہوا تھا۔ غلط ـــــ بالکل غلط ـ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی دعویٰ صحیح نہیں ہے ـ

درحقیقت اُردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" ـــــ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو بدھ کے دن شائع ہوا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے ۲۸ مارچ کی تاریخ صحیح تحریر کی ہے لیکن جام جہاں نما کے بارے میں موصوف نے جو سنہ اور نام درج کیا ہے وہ غلط ہے ـ اسی طرح مولانا امداد صابری اور محمد عتیق صدیقی نے بھی جام جہاں کی تاریخ اجرار بالترتیب ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء[1] اور اپریل ۱۸۲۲ء[2] قرار دی ہے جو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے ـ

اُردو جام جہاں نما کے بارے میں راقم الحروف کو نیشنل آرکائیوز نئی دلی میں دوران تحقیق نہ صرف جام جہاں نما کی فائیلوں کے مطالعہ کا موقع ملا بلکہ وہاں محفوظ ایک بے حد اہم رپورٹ نظر نواز ہوئی جس میں اس اخبار کے اولیں شمارہ پر برطانوی سکریٹری مسٹر بیلی کا کلکتہ کونسل میں ۱۱ اکتوبر ۱۸۲۲ کو دیا گیا بیان درج ہے ـ مسٹر بیلی نے اُردو جام جہاں نما کے پانچویں شمارہ پر جو ۲۴ اپریل ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا تھا ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے ؎

" حیدر آباد سے متعلق اس کی نوٹس اب تک راجہ چندو لال کے کردار اور نظم و نسق کی تعریف تک محدود رہی، جیسے (جام جہاں نما کے) ۲۴ اپریل کے شمارہ کے کو جب نظام کا جتنا اعتماد حاصل تھا اتنا کسی اور کا نہ تھا۔"[3]

اس طرح اگر مندرجہ بالا اقتباس میں مندرج ۲۴ اپریل ۱۸۲۲ء کی تاریخ کو بنیاد تسلیم کر کے ہر بدھ کے روز شائع ہونے والے اس اولیں اردو ہفت روزہ "جام جہاں نما" کی گذشتہ اشاعتوں کا شمار کیا جائے تو ۲۴ اپریل سے قبل شائع ہونے والے چار شماروں کی تاریخ ۲۷ مارچ ۳ اپریل، ۱۰ اپریل اور ۱۷ اپریل نکلتی ہے جو اگلے صفحہ پر چارٹ میں ملاحظہ فرمایئے ؎

اس چارٹ سے اردو جام جہاں کی تاریخ اجرار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء بھی ثابت ہو جاتی ہے جس کے بارے میں اب تک شدید اختلاف رہا ہے ـ اس کے علاوہ کلکتہ جرنل، کلکتہ کے ۱۹ اپریل ۱۸۲۲ کے شمارہ میں صفحہ ۵۳۵ پر شائع شدہ جام جہاں نما، (اُردو) کے شمارہ نمبر ۱، جلد ۱ کے مضامین سے بھی اس بات کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ اُردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" واقعتاً ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو ہی شائع ہوا تھا۔ اس ضمن میں کلکتہ منتھلی جرنل، کلکتہ کی، جو کلکتہ جرنل، کلکتہ میں شائع شدہ ایک ماہ کے مضامین کو یکجا کر کے ہر ماہ شائع کرتا تھا، جلد اول (صفحہ ۳۹۵) کے حسب ذیل اقتباس کو بڑی اہمیت حاصل ہے ؎

"پچھلے دنوں ایک تیسرا فلسفی نمودار ہوا جس کا نام "جام جہاں نما" ہے ہمارا ہمعصر اخبار "جان بل" گذشتہ جمعہ کے شمارہ میں ان تینوں (یعنی راجہ رام موہن رائے کی سنواد کومدی، سماچار چندریکا اور جام جہاں نما) کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے ـ

اس وقت کلکتہ سے دیسی عالموں کی نگرانی میں دو بنگالی اخبار جاری ہیں ـ آج صبح ایک نیا اخبار "ہندوستانی زبان میں جاری ہوا ہے" لیکن اس کا رشتہ کس سے ہے؟ اسے کس نے جاری کیا؟ اس کے بارے میں ہمیں کوئی بھی کچھ بتا نہیں سکتا ـ نہ اس کا کوئی پراسپکٹس ہے، نہ اس پر چھاپنے والے کا نام درج ہے ـ یہ اخبار کوارٹو سائز کے تین ورق

---

(۱) روح صحافت، مولانا امداد صابری، صفحہ ۲۴۳
(۲) سب ساتھ، نئی دلی، ۱۳-۶ دسمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۹
(۳) بنگال پبلک کنسلٹیشن، جارج ۱۸۲۲ نمبر ۳۸ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۲۲ء

پر مشتمل ہے اور اس کا نام "جام جہاں نما" ہے۔
پہلا شمارہ بدھ کے دن ۲۷ مارچ کو شائع ہوا۔"[1]
اس کے علاوہ راجہ رام موہن رائے نے بھی اپنے جنگا جریدہ سنواد کو مدی کے ۱۹ اپریل ۱۸۲۲ء کے ۲۰ ویں شمارہ میں اُردو کے اس اولین اخبار "جام جہاں نما" کے پہلے شمارہ کے بارے

مارچ ۱۸۲۲ء

دوشنبہ	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار
				۱	۲	۳
۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷
۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴
۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰	۳۱

اپریل ۱۸۲۲ء

دوشنبہ	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴
۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱
۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
۲۹	۳۰					

میں ایک مضمون "ہندوستانی پیپر جام جہاں نما" شائع کیا تھا، جس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اردو جام جہاں نما ہی اردو کا پہلا مکمل اخبار تھا۔ سنواد کو مدی کے اس شمارے کو کلکتہ جرنل، کلکتہ نے بھی نقل کیا تھا۔

اس طرح جام جہاں نما کے ہمعصر انگریزی اخبارات بالخصوص "جان بل ان دی ایسٹ" کلکتہ، کلکتہ جرنل، کلکتہ اور کلکتہ منتھلی جرنل، کلکتہ، سنواد کو مدی کلکتہ میں اردو جام جہاں نما کے پہلے شمارہ کے بارے میں شائع شدہ تبصرے اور مضامین سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اُردو کا سب سے پہلا مکمل اخبار "جام جہاں نما" ہی تھا جو ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا تھا، کیونکہ جام جہاں نما اگر سب سے پہلے ۲۷ مارچ کو اردو میں شائع نہ ہوا ہوتا تو راجہ رام موہن رائے جو سنواد کو مدی اور ایڈیٹر جام جہاں نما کے بارے میں پہلے ہی ایک مضمون شائع کر چکے تھے، اپنے فارسی اخبار "مراۃ الاخبار"

---

[1] صحافت پاکستان و ہند میں دوسرا ایڈیشن المصنفہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صفحہ ۲۰

کلکتہ کی اشاعت اول میں یہ قطعاً تحریر نہ کرتے۔

"ایڈیٹر عوام کو مطلع کرتا ہے کہ اگرچہ اس شہر میں قارئین کے لیے متعدد اخبارات شائع ہو چکے ہیں تاہم انگریزی سے نابلد اور اس زبان (فارسی) سے بخوبی واقف قارئین بالخصوص شمالی ہند کے عوام کے لیے اس زبان (فارسی) میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا ہے چنانچہ راجہ رام موہن رائے نے ہر ہفتے ایک فارسی اخبار جاری کرنے کا کام شروع کیا ہے (۱)

اردو جام جہاں نما کی اشاعت اول کا دور انتہائی مختصر رہا، کیونکہ کلکتہ جرنل کلکتہ کے ۸ مئی ۱۸۲۲ء کے شمارہ میں شائع شدہ اس اعلان کے بموجب کہ "ہندوستانی اخبار کے اب تک چھ شمارہ شائع ہو چکے ہیں، اس کی زبان میں اہم تبدیلی ہونے والی ہے" اردو جام جہاں نما کے ساتویں شمارہ کی اشاعت کے بعد ۱۵ مئی ۱۸۲۲ء سے اس میں فارسی کے چند مضامین شائع ہوئے اور پھر ۱۹ جون ۱۸۲۲ء کے شمارہ سے جام جہاں نما محض فارسی کا ہی ایک اخبار بنکر رہ گیا۔

البتہ ایک سال کے بعد جون ۱۸۲۳ء سے اس کے ایڈیٹر نے دوبارہ اردو جام جہاں نما شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں ایڈیٹر نے اعلان کیا کہ ؎

"اخبار کو زیادہ دلچسپ، پرلطف اور مفید بنانے کی غرض سے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اس اخبار کا ایک ضمیمہ خالص ہندوستانی یا اردو زبان میں شائع کرے۔ اگر اسے فارسی اخبار کے ساتھ خریدا جائے تو اس کا چندہ چار آنے فی پرچہ یا ایک روپیہ ماہانہ ہوگا لیکن اگر صرف اردو ضمیمہ خریدا جائے تو چندہ دو روپے ماہانہ ہوگا"

لیکن افسوس اردو جام جہاں نما ۲۳ جنوری ۱۸۲۴ء کی اشاعت کے بعد ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا جبکہ فارسی جام جہاں نما مسلسل جاری رہا اس سلسلہ میں اخبار کے ایڈیٹر نے اردو جام جہاں نما کے اردو ایڈیشن کو بند کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے جو معذرت شائع کی تھی وہ یہ ہے ؎

بہتیرے قدر شناس، جنہوں کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی۔ اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہل ہند، جنہوں کی زبان ہی فارسی ہے وہ فارسی کی تحریر چاہتے ہیں، خاکسار نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ہفتے سے ہندی فرمان کے عوض ایک فرمان اور بھی فارسی میں لکھا جائے ... آج تک آٹھ صفحہ فارسی اور اردو کے چار چھپتے ہیں، آئندہ سے بارہ صفحے فارسی چھاپے جائیں گے اور تین روپے ماہوار بدستور بحال رہیں گے

اس طرح اردو جام جہاں نما کی اشاعت ثانی کا دور بھی ختم ہو گیا۔ حالانکہ فارسی جام جہاں نما کافی عرصے تک جاری رہا کیونکہ اودھ اخبار لکھنؤ کے ۸ جون ۱۸۷۵ء کے شمارہ میں شائع شدہ اس عبارت سے کہ "جام جہاں نما" کلکتہ۔ فارسی عبارت صاف وشفاف ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ فارسی میں یہ اخبار انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں اگر زیر بحث مقالہ کی ابتدا میں درج اقتباسات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ سبھی غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن ثابت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے متذکرہ بالا اقتباسات کی روشنی میں صحیح صورت حال کی وضاحت کرنا ضروری ہے

ان میں پہلا اقتباس ہے مقامی روزنامہ قومی آواز کے جوائنٹ ایڈیٹر محمد عثمان غنی سے سعادت صدیقی کی اس گفتگو کا جو ۲۱ مئی ۱۹۸۲ء کو آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن سے نشر ہوئی اور جس پر بعد میں قومی آواز لکھنؤ کے ۸ جون ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں "ابن محبوب" کا تبصرہ شائع ہوا۔ عثمان صاحب کے بیان کے بموجب فارسی اور اردو کا ملا جلا اردو کا پہلا اخبار ۱۸۲۳ء میں نکلا تھا

(۱) کلکتہ جرنل، کلکتہ جلد دوم نمبر ۹۸، صفحہ ۵۸۳، ۲۳ اپریل ۱۸۲۲ء

اور ۱۸۳۶ء میں صرف اُردو کا اخبار شائع ہوا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ کیونکہ اُردو کا پہلا اخبار ۱۸۲۴ء میں نہیں بلکہ ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا تھا۔ ممکن ہے ۱۸۲۴ء سہو کاتب کا نتیجہ ہو اور غلطی سے ۱۸۲۲ء کے بجائے ۱۸۲۴ء تحریر ہوگیا ہو، لیکن یہ بات سراسر غلط ہے کہ فارسی اور اردو میں ملا جلا اُردو کا پہلا اخبار شائع ہوا۔ دراصل یہ اخبار سب سے پہلے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو اردو زبان ہی میں شائع ہوا تھا اور بعد میں اسی نام سے یہ فارسی میں شائع ہوا۔ موصوف نے اس کا نام بھی نہیں بتایا ہے اس کا نام جام جہاں نما ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے ۱۸۳۶ء میں شائع ہونے والے اردو اخبار کا نام بھی نہیں بتایا ہے غالباً موصوف کا اشارہ مولوی محمد باقر کے " دہلی اخبار" کی جانب ہے جو ۱۸۳۶ء میں نہیں بلکہ ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کے بارے میں محمد عتیق صدیقی رقمطراز ہیں :-

" یہ دہلی کا پہلا اخبار تھا جس کا ۱۸۳۷ء میں اجرار ہوا" (۱)

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دہلی اخبار صرف دہلی کا ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کا سب سے پہلا اُردو اخبار ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ دہلی اخبار ہندوستان کا پہلا اخبار ہے۔ دراصل دہلی اردو اخبار کے بارے میں غلط فہمی اس وقت پیدا ہوئی جب محمد حسین آزاد نے آب حیات میں یہ تحریر کیا

" ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا۔ یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔ (۲)

لیکن پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے مولانا محمد حسین آزاد کے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہوئے تحریر کیا۔

" مولانا محمد حسین کے والد مولوی باقر " دہلی اُردو اخبار" کے ایڈیٹر تھے اور وہ خود بھی اس سے وابستہ رہ چکے تھے، اسی لیے ان کا بیان اہم ہے لیکن اس کا دوسرا ٹکڑا کہ یہ اُردو کا پہلا اخبار تھا، صحیح نہیں۔ جام جہاں نما کی موجودگی میں یہ شرف دہلی اُردو اخبار کو حاصل نہیں ہو سکتا۔" (۳)

دوسرا اقتباس ہے اس رپورٹ کا جسے خبررساں ایجنسی یو این آئی نے جاری کیا تھا اور وہ قومی آواز لکھنؤ کے علاوہ ۱۳ جولائی ۱۹۸۲ء کو ایک ساتھ انگریزی روزنامہ ہیرالڈ پائٹ نئی دہلی، نادرن انڈیا پتریکا لکھنؤ روزنامہ عزائم، لکھنؤ اور ہندی روزنامہ جاگرن لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوئی۔ مکمل رپورٹ سے قطع نظر راقم الحروف کو سردست اس کے اس بے بنیاد حملہ پر تبصرہ کرنا ہے کہ جولائی ۱۹۸۲ء میں اردو صحافت کی عمر ۱۶۰ سال ہوگئی۔ غلط بالکل غلط۔ اُردو کا پہلا اخبار چونکہ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا تھا۔ اس اعتبار سے ۲۷ مارچ ۱۹۸۲ء کو اردو صحافت کے ۱۶۰ سال مکمل ہو جاتے ہیں چنانچہ خبررساں ایجنسی یو این آئی کو یہ رپورٹ ۱۲ جولائی کو جاری کرنے کے بجائے گذشتہ سال ۲۵ مارچ کو جاری کرنا چاہیئے تھا تاکہ وہ اگلے دن ۲۶ مارچ کو اخبارات میں شائع ہوتا اور اس طرح قارئین کو یہ معلوم ہو سکتا کہ اُردو صحافت کی عمر ۱۶۰ سال ہوگئی ہے۔ دراصل اس قسم کی بے بنیاد اور غلط رپورٹ کی اشاعت سے قارئین گمراہ ہوتے ہیں اور صداقت کا خون ہوتا ہے

مؤخر الذکر اقتباس ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کے مضمون "صحافت اور ملیح آبادی" سے اخذ کیا گیا ہے جو ۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کو قومی آواز، لکھنؤ۔ پٹنہ۔ اور بمبئی کے ضمیمہ میں شائع ہوا۔ موصوف نے بھی جام جہاں نما کو اُردو اور فارسی کا ایک " مشترکہ اخبار" قرار دیا ہے اور اس کا نام " اخبار جہاں نما" تحریر کیا ہے جو

(۱) ہندوستانی اخبار نویسی، محمد عتیق صدیقی صفحہ ۲۹۶

(۲) آب حیات، محمد حسین آزاد صفحہ ۲۹، طبع لاہور (۱۹۵۰ء)

(۳) مقدمہ، دہلی اردو اخبار، مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صفحہ الف

سراسر غلط ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف جام جہاں نما کے بارے میں مولانا امداد صابری کی "تاریخ صحافت اردو" میں صفحہ ۴۳ پر تحریر کردہ نام "اخبار جہاں نما" سے گمراہ ہوگئے ہیں ورنہ صحیح نام غلط تحریر نہ کرتے۔ اس اخبار کی تاریخ اجرا کے سلسلے میں عصمت ملیح آبادی نے تحریر کیا ہے کہ یہ اخبار ۱۸۲۲ء میں نہیں بلکہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا اگر یہ صحیح کر لیا جائے تو اس طرح اردو جام جہاں نما کی عمر ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء کو صرف ۶۱ سال ہی ہوتی جبکہ اس سے قبل اردو کے ہزاروں اخبار اور رسائل شائع ہو چکے ہیں۔

جام جہاں نما آٹھویں شمارہ سے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شائع ہوا تھا اور چند مشترکہ شماروں کی اشاعت کے بعد اردو جام جہاں نما کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۹ جون ۱۸۲۲ء سے فارسی زبان میں جام جہاں نما شائع ہونے لگا اور کافی عرصے تک جاری رہا لیکن اس فارسی جام جہاں نما کی اشاعت کے ٹھیک ایک سال بعد اس کے باہمت ایڈیٹر نے ۱۹ جون ۱۸۲۳ء کو فارسی کے ساتھ ہی اردو جام جہاں نما شائع کرنا شروع کر دیا جو ۳ جنوری ۱۸۲۸ تک جاری رہا۔

اس سلسلہ میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کیونکہ پروفیسر سید حامد حسن قادری، سید رئیس احمد جعفری اور نادم سیتاپوری جیسے بعض ادیبوں اور صحافیوں نے مولوی اکرام علی کے مبینہ "اُردو اخبار" کو اُردو کا پہلا اخبار قرار دیا ہے جو ان حضرات کے کہنے کے مطابق اردو جام جہاں نما سے قبل ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں نادم سیتاپوری نے یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ ؎

کلکتہ سے "اردو اخبار" ۱۸۱۰ء میں مولوی اکرام علی
کی ادارت میں نکلا اور یہی اردو کا پہلا اخبار تھا۔
.. "اُردو اخبار" کے کچھ پرچے بچپن میں میری نظر
سے گزرے ہیں"۔[1]

[1] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری، صفحہ ۱۷۰۔

لیکن نادم سیتاپوری کی بچپن کی یادداشت کی بنیاد پر یہ قطعی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے جس اخبار کو پہلا اخبار قرار دیا ہے، واقعی اس نام کا کوئی اخبار شائع ہوا تھا، ممکن ہے نادم سیتاپوری نے جس اخبار کو بچپن میں دیکھا وہ مولوی محمد باقر کا "دہلی اردو اخبار" رہا ہو جسے وہ مولوی اکرام علی کا "اُردو اخبار" سمجھ بیٹھے ہوں حالانکہ اس مبہم "اردو اخبار" کا نام بعض محققین نے "ہندوستانی" بتایا۔ مولوی اکرام علی کے اس اخبار کے بارے میں ڈاکٹر رتن بھٹناگر اپنی گرانقدر تصنیف میں رقمطراز ہیں۔

"مولوی اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں ایک فارسی اخبار "ہندوستانی" جاری کیا تھا۔[1]

اس کے برعکس عبدالرزاق نے انگریزی اخبار ٹریبیون میں شائع شدہ مضمون "انگلش جرنلزم ان انڈیا" کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی اکرام علی کے اس مبینہ اخبار کے بارے میں تحریر کیا ہے ؎

" دیسی صحافت۔ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ میں ہندوستانی اردو مطبع قائم ہوا اور مولوی اکرام الدین صاحب نے اسی نام سے اخبار جاری کیا مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس رنگ کا اخبار تھا۔[2]

اب اگر اس مبینہ اخبار کے بارے میں متذکرہ حوالوں پر غور کیجیے تو کسی فیصلہ تک پہونچنا ناممکن ہے کیونکہ کوئی اس اخبار کا نام "اردو اخبار" بتا رہا ہے تو کوئی نام "ہندوستانی" قرار دیا ہے ڈاکٹر بھٹناگر نے اسے اردو نہیں بلکہ فارسی کا اخبار تحریر کیا ہے جبکہ عبدالرزاق نے اکرام علی کا نام مولوی اکرام الدین بتایا۔ (باقی صفحہ ؛

[1] دی رائز اینڈ گروتھ آف ہندی جرنلزم : ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر صفحہ ۴۲۔

[2] ہندوستان میں انگریزی صحافت: عبدالرزاق، ماہنامہ اعظم گڑھ، مئی ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۸۰۔

اُردو صحافت کے ایک سو ساٹھ سال

صلاح الدین عثمانی

بھارت ورش میں آج اُردو کی جو زبوں حالی ہے اُس کو دیکھ کر یہ وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک دن ایسا بھی تھا جب اردو زبان کے اخبارات اور اردو اخبار نویسوں کے ہاتھ میں ملک کی ذہنی زندگی کی تعمیر تھی۔ اردو اخباروں نے ہی ملک میں سیاسی بیداری کی داغ بیل ڈالی۔ آزادی کی راہ دکھائی اور برطانوی سامراج کے خلاف مورچہ لگایا صرف ہندوستان ہی نہیں ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں یورپین سامراج کی لوٹ کھسوٹ اور مظالم کے خلاف صدا بلند کی۔ دہلی اردو اخبار۔ الہلال، البلاغ۔ ہمدرد، زمیندار، ہمدم زمانہ سب اسی میدان کے مجاہد تھے۔ ان کے اڈیٹروں کا نام لیے بغیر ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

ہر زبان ایک ثقافت اور ایک تہذیب کی نمائندہ ہوتی ہے اُردو اُس تہذیب کی ترجمان ہے جس کی تعمیر ہندوستان کے قدیم باشندوں اور افغانستان وسط ایشیا اور ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں بسنے والوں نے مل جل کر کی تھی۔ یہ تہذیب ہندوؤں کی بھی تھی اور مسلمانوں کی بھی اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اردو کا پہلا اخبار اُن صحافیوں اور ادیبوں کا رہین منت ہوا جو مذہباً ہندو تھے، لیکن ہندوستانی تہذیب کے دلدادہ اور جذبۂ حب وطن میں سرشار تھے۔ لالہ سدا سکھ اور ہری ہر دت نے مارچ ۱۸۲۲ء میں جام جہاں نما نکالا اور ہندوستان کو یورپ کی سائنسی ترقی سے آگاہ کیا۔ ۱۸۲۳ء میں موہن مشرا اور منی رام ٹھاکر نے شمس الاخبار نکالا۔ راجہ رام موہن رائے نے بھی اخبار نکالے تو وہ بھی اسی تہذیب کے نمائندے بنے۔

یہ اخبارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی مملکت کے دارالسلطنت کلکتہ سے نکلتے تھے آج کل کے معیار کے مطابق یہ بڑے اخبار نہ تھے۔ اُن کا سرکولیشن چند سو سے آگے بھی نہ بڑھا۔ پڑھنے والوں کی تعداد بھی سینکڑوں تک محدود رہی مگر انھوں نے ملک میں وہ چراغ روشن کیا کہ اس کی روشنی سے سینکڑوں شمعیں چمک اُٹھیں اور ملک میں سونے والوں کو جگا دیا۔

۱۸۳۳ء میں آگرہ اخبار نکلا اور انگریزوں کی زیادتیوں کے پول کھولے ۱۸۳۳ء میں سلطان الاخبار نکلا اور اس نے فرنگی حکومت کو بے نقاب کرنا شروع کیا۔ اس کے ایڈیٹر رجب علی لکھنؤ بڑی ہمت والے تھے ۹ اگست ۱۸۳۵ء کو جب نواب لوہارو نواب شمس الدین خاں اور اُن کے ایک ساتھی کریم خاں کو دہلی میں

برطانوی ریذیڈنٹ ولیم فریزر ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کے قتل کے جھوٹے الزام میں پھانسی دی گئی تو اس اخبار نے ان کو سرکاری قتل پر محمول کر کے ہندوستانیوں کی ترجمانی کی۔ ہزاروں کی تعداد میں اُن کی قبروں پر پھول چڑھانے اور چراغ جلانے معتقد جاتے رہے۔

گلشن نو بہار غالباً ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا اور چند ہی مہینوں بعد حکومت فرنگ کے عتاب کا شکار ہو کر بند ہو گیا کیوں کہ اس میں سرکار انگریزی کے مطابق "انتہائی باغیانہ مضامین چھپ رہے تھے"۔

مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے دہلی اُردو اخبار نکالا، مولوی محمد باقر اُن مجاہدین میں تھے جنہوں نے اپنا سر دے کر جذبۂ آزادی کو پروان چڑھایا تھا، دہلی اُردو اخبار ملک کی سیاسی مجلسی اور تمدنی زندگی کا آئینہ دار تو تھا ہی انگریزوں کی حکومت کی بے ایمانیوں، عہد شکنیوں کا بھی پردہ فاش کرتا تھا۔ عوام پر انگریز تاجروں کی حکومت کے مظالم اور اہل ملک کی بے چارگی و افلاس کی عکاسی اس اخبار میں ہوتی تھی۔ اردو اخبار ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کا بیباک سپاہی تھا۔ جب ہندوستان میں مولوی احمد اللہ شاہ اور اُن کے ساتھیوں کی قیادت میں جہاد آزادی کا علم بلند ہوا تو مولوی محمد باقر کے قلم نے تیغ و سپر کا کام کیا۔ وطن کی قسمت میں اُس وقت آزادی نہیں تھی مجاہدین آزادی کو شکست ہوئی اور مولوی محمد باقر راہ آزادی میں شہید ہوئے۔

شہدائے وطن میں کتنے ایسے ہیں جو برسوں گمنام رہے جن کے ناموں سے اس دور کے لوگ واقف نہیں ہیں۔ مولانا امداد صابری قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ضعیفی اور علم ماندگی کے باوجود اُردو اخبار نویسوں میں سے بہت سے مجاہدوں کے نام تلاش بسیار کے بعد گمنامی سے نکالے ہیں، ان میں صوفی امبا پرشاد کا نام ایک درخشاں تارے کی طرح چمکتا نظر آتا ہے جنھوں نے ۱۸۹۰ء میں مراد آباد سے جامع العلوم اخبار نکالا اور سلطنت برطانیہ کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ آج کل کے اخباروں کی طرح اس وقت کے اخبار ذریعہ آمدنی نہیں تھے بلکہ مالی اور جانی قربانیوں کی دعوت دیتے تھے۔ صوفی امبا پرشاد عجیب دل گردہ کے آدمی تھے۔ نہ کوئی حامی نہ مددگار۔ ایک جابر اور ظالم حکومت سے تنہا برسر پیکار رہے۔ بار بار گرفتار ہوئے، دو بار باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں دو دو برس قید با مشقت کی سزا کاٹی۔ آخر کار برطانیہ نے "ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے" ۱۸۹۷ء اُن کا پریس ضبط کر لیا اور اخبار بند کر دیا۔

صوفی امبا پرشاد مراد آباد چھوڑ کر پنجاب گئے، اور گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے اخبار ہندوستان میں کام کرنا شروع کیا۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ہندوستان کے مالک دینا ناتھ اور ایڈیٹر پنڈی داس کو باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور سات سات سال کیلئے سزایاب ہوئے۔ صوفی امبا پرشاد روپوش ہو گئے ۱۹۰۶ء میں نیپال سے گرفتار کر کے لاہور لائے گئے۔ مقدمہ چلا عدالت میں جرم ثابت نہ ہو سکا اور رہا کر دیئے گئے۔ وسعت نظر ایسی تھی کہ کسی بھی ملک میں سامراج کے خلاف جنگ ہو وہ اس کو اپنی ہی جنگ سمجھتے تھے۔ جذبۂ حریت ایسا تھا کہ ہندوستان کی فضا کو سازگار نہ پا کر ایران چلے گئے۔ یہاں برطانوی سامراج شہنشاہ ایران کی نام نہاد آزاد حکومت کے ذریعہ مجاہدین آزادی کو کچلنے میں مشغول تھی۔ صوفی امبا پرشاد زبان اردو کے صحافی اور انشا پرداز ہی نہیں، انگریزی، فارسی اور عربی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ایران پہنچے تو آزادی کے متوالوں میں گھل مل گئے، اور مجاہدین آزادی کی صفوں میں شریک ہو گئے، وہاں میدان جنگ قائم ہو چکا تھا۔ شیراز کے قریب ایک مورچے پر غنیم کا مقابلہ کرتے ہوئے قتل کا حکم ہوا۔ زندان ہی میں تھے کہ راہی ملک عدم ہوئے۔

شمیم اشفتگان منزل عجب دیوانۂ طلب ہیں
قدیم بڑھانا ہے کام اُنکا صلیب دیکھیں نہ دار دیکھیں

ہندوستان آزاد ہوا تو آزادی اپنے ساتھ کتنے ہی مسائل لائی۔ اُن میں اردو زبان اور ثقافت اور اُس تہذیب کی زندگی کا بھی مسئلہ ہے جو صدیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ملک میں تعمیر کی تھی اور جس کے خوشنما نقوش آج مٹائے جا رہے ہیں۔ اُردو صحافت کی کسمپرسی بھی اسی بڑے مسئلے کا ایک جز ہے

پورے بھارت میں اردو کے چند ہی اخبار ایسے ملیں گے جو موجودہ صحافتی معیار کے کسی قدر نزدیک نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ نزدیکی صرف ظاہری ہے، یعنی سفید کاغذ پر خوشنما چھپائی تک۔ اُنھیں سے دوچار اخبار پریس ٹرسٹ اور یونائیٹڈ نیوز کی خبریں بھی لے لیتے ہیں اور یہاں تک آکر سب ختم ہو جاتی ہے، اردو جس تہذیب اور جن لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے اُن کے بارے میں کوئی خبر ہو یا نہ ہو اس سے اُن کو دلچسپی نہیں۔

ملک کے سماجی اور اقتصادی مسائل پر اگر خبر رساں ایجنسی نے کوئی خبر بھیج دی تو کبھی چھپ گئی، ان اخباروں میں کسی کو یہ توفیق نہیں کہ ان مسائل کا خود مطالعہ کریں اُن کا تجزیہ کریں ان مسائل کے پیچھے جو طاقتیں کام کر رہی ہیں ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور اپنے پڑھنے والوں کو اُن مسائل کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں جن سے اُن کو ہر وقت سابقہ رہتا ہے ان اخباروں میں کہیں ہندوستان کی غربت، اقتصادی نابرابری lingua لسانی مذہبی اور علاقائی تناؤ کے بارے میں خود اُن کا کوئی تحقیقی مضمون نظر نہ آئے گا کسی اخبار نے بہت تیزی دکھائی تو کسی انگریزی اخبار کے کسی مضمون کا ترجمہ چھاپ دیا اور خوش ہو گئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اُردو کے اخبارات میں خبریں تو چھپتی ہیں مگر خبر لانے والے نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ ایک ایڈیٹر صاحب مباحثہ کے دوران اپنے اخبار کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے "اور خبریں تو ایجنسی سے آتی ہی ہیں" گویا ایجنسی کی خبر ہوا اور روشنی کی طرح کوئی قدرت کی پیداوار ہے جو اُن کے اخبار میں خود بخود پہونچتی رہتی ہے۔ اُن کو یہ نہیں معلوم کہ خبر رساں ایجنسی بھی اُن ہی جیسے آدمیوں کی ہوتی ہے جو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے خبریں بھیجتے ہیں یا نہیں بھیجتے ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور جس خبر کو چاہتے ہیں نظر انداز کر دیتے ہیں آپ کسی اخبار میں چلے جائیں آپ کو reference لائبریری reference ریفرنس لائبریری تک نظر نہ آئے گی۔

آج ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارو کا سرکولیشن ہزاروں سے گذر کر لاکھوں میں پہونچ گیا ہے مگر اُردو کے کسی اخبار کا سرکولیشن ۲۰ - ۲۵ ہزار سے بھی آگے نہیں بڑھ سکا ہے لیکن ان اخباروں کے ایڈیٹر اسی پر بہت خوش نظر آتے ہیں۔

اس کی بہت بڑی وجہ وہ نفرت اور عناد کا جذبہ ہے جو اردو کے خلاف پیدا کیا گیا ہے۔ اُردو کو ختم کرنے کی وہ مسلسل کوششیں ہیں جو ۱۹۴۷ء سے برابر جاری ہیں اس کی ایک مثال حکومت اتر پردیش کا وہ حکم ہے جو ۱۹۴۸ میں جاری کیا گیا تھا۔ جس میں اُردو اخباروں کو سرکاری اشتہارات دینا ممنوع قرار دیدیا گیا تھا یہ حکم اگرچہ چند سالوں بعد واپس لے لیا گیا، مگر اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ حکومت نے یہ حکم تو واپس لے لیا لیکن ہندوستان کے سرمایہ دار جو تقریباً سب کے سب وہ ہیں جن کا اُردو سے کوئی تعلق نہیں اُردو اخباروں کو اشتہارات دینے سے گریز کرتے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو اخبارات میں Talented اعلا قابلیت کے نوجوان ان سے گریز

کرتے ہیں جو آتے بھی ہیں وہ مجبوری سے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارت میں اُردو اخبارات کا معیار اونچا نہ ہوسکا۔

وہ اب بھی اُن ہی مسائل سے دوچار ہیں جو ۱۹۴۷ء میں تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اب بھی اس کی تعلیم پر قدغن ہے، سرکاری دفاتر اور سرکاری کاروبار سے وہ کب کی نکالی جاچکی ہے۔

ان زبردستیوں اور زیادتیوں کو دور کرنے کے وعدے تو بہت ہوئے مگر ایفائے وعدہ کبھی نہ ہوا۔

ہندوستان میں اُردو زبان اس کی تہذیب کی حفاظت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے حل کے ساتھ ہی اُردو صحافت کے مسائل حل ہوسکتے ہیں لیکن ہر مسئلے کے حل کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے لیکن ایسے مردِ میدان اب کہاں ہیں؟

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق!

۱۹۸۲ — عالمی صحافت کے لیے سیاہ سال

بین الاقوامی ادارۂ صحافت (آئی۔پی۔آئی) کی رپورٹ کے بموجب ۱۹۸۲ء کے دوران دنیا بھر میں کسی نہ کسی شکل میں اخبارات کی آزادی کو پامال کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس رپورٹ میں ۶۷ ممالک کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پریس کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔

آئی۔پی۔آئی کے ڈائرکٹر پیٹر گلیسر نے اپنی ۴۴ صفحہ کی رپورٹ میں ایران، ترکی، ارجنٹائنا اور ہندوستان کا اس ضمن میں خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ تاہم مسٹر پیٹر نے ہندوستان میں بہار کے پریس بل کے خلاف صحافیوں کے اتحاد کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے ایران کی پُرزور الفاظ میں مذمت کی ہے جہاں ۳۰ سے زیادہ صحافیوں کو پھانسی دی گئی، ۲۰ صحافی لاپتہ ہیں اور ۳۰ سے زیادہ صحافی جیل میں ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۶۰ ممالک کے تقریباً ۱۲۰ ایڈیٹر اور پبلشر آئی۔پی۔آئی کے رکن ہیں۔

ایران میں صحافتی آزادی پر حملہ کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ "کیہان" جیسے اہم روزنامہ کی تعدادِ اشاعت جو چار سال قبل ۱۱ لاکھ تھی اب صرف ۱۵۰۰۰ ہزار رہ گئی ہے۔ وہاں غیر اہم خبروں کو بھی مذہبی رنگ دے کر پیش کیا جاتا ہے۔

پریس کی آزادی کا نام نہاد مبلغ برطانیہ بھی فاک لینڈ کی جنگ کے دوران جنگی نامہ نگاروں کی خبریں سنسر کرکے اور غیر ملکی نامہ نگاروں کے وہاں داخلہ پر پابندی عائد کرکے بے نقاب ہو چکا ہے۔

اظہار احمد

صحافی کو درپیش چیلنج اور آج کے مسائل

نئی دہلی کے وگیان بھون میں جو چند روزہ قبل بین الاقوامی تعلقات، عالمی سیاست معیشت اور ایٹمی جنگ کے خطرات پر بحث و مباحثہ کا مرکز بنا تھا وہاں حال ہی میں صحافت کے رول اور صحافت کو درپیش چیلنج پر ایک سہ روزہ سیمنار میں اور باتوں کے علاوہ، صحافیوں کے فرائض اور حقوق، خبر حاصل کرنے کا حق، میڈیا اور بین الاقوامی تعلقات، میڈیا، اور پارلیمنٹ، میڈیا، بیوروکریسی اور عدلیہ، میڈیا اور سماجی معاشی تبدیلی اور میڈیا پر دباؤ کے مسائل پر عالمانہ بحث و مباحثہ ہوا۔

نیشنل میڈیا سنٹر کے زیر اہتمام اس کانفرنس میں مختلف اخباروں کے مدیروں سرکردہ صحافیوں، قانون دانوں، ممبران پارلیمنٹ، دانشوروں اور سماجی کارکنوں نے شرکت کی اس کانفرنس میں سری لنکا اور پاکستان کے نمائندوں کے علاوہ یونسکو ریجنل کمیونیکیشن ایڈوائزر مسٹر ایس ایم علی اور صحافیوں کی بین الاقوامی تنظیم کے سکریٹری ڈاکٹر ایس فرڈینے بھی شرکت کی۔

نیشنل میڈیا سنٹر کے صدر عشرت علی صدیقی نے اپنی صدارتی تقریر میں کئی ایسے مسائل کا ذکر کیا جو موجودہ دور میں صحافت اور صحافت کے میدان سے تعلق رکھنے والوں کو درپیش ہیں انھوں نے کہا کہ جمہوری نظام اور جمہوری معاشرہ کی بنیاد بحث و مباحثہ ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں ان مسائل کے بارے میں پوری واقفیت ہو جن پر آج بحث کی جاری ہے۔

اختلاف رائے جمہوریت کی روح ہے لیکن سنجیدہ اور ایماندارانہ اختلاف رائے تب ہی ممکن ہے جب خبر حاصل کرنا اور خبر دینا بنیادی حق تصور ہو جہاں تک علم حاصل کرنے کا سوال ہے وہ صرف زبان کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے اس لیے ملک کی مختلف زبانوں کی ترقی اور فروغ نہایت ضروری ہے اور اگر کسی زبان کو دبایا جاتا یا اس کی نشو و نما کے لیے ساز گار ماحول مہیا نہیں کیا جاتا تو علم حاصل کرنے کا حق سلب ہوتا۔ جمہوری نظام میں کلچر تسلط اتنا ہی مضر اور غیر صحت مند ہے جتنا سیاسی اور معاشی غلبہ اور زبان کلچر کا ایک اہم ترین جز ہے۔

ذرائع ابلاغ کو کاروبار کا ذریعہ بنانا یا میڈیا کو سیاست میں اُلجھانا دو ایسے خطرات ہیں جن سے دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ صحافت اثر انداز ہوسکتی ہے ایسے اخبارات جن کا تعلق کسی خاص سیاسی جماعت سے ہوتا ہے نہ صرف اپنی جماعت کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں بلکہ مخالف نظریات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مسٹر عشرت علی صدیقی نے سرکاری خفیہ دستاویزات اور اطلاعات سے متعلق ایک ایکٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کبھی کبھی انتظامیہ اس ایکٹ کا سہارا حقائق پر پردہ ڈالنے کیلئے کرتی ہے اس لیے خبر حاصل کرنے کے بنیادی حق کے لیے اس ایکٹ میں ترمیم ضروری ہے، اس کے علاوہ پارلیمنٹ یا مجالس قانون ساز کی رپورٹنگ میں سب سے بڑی رکاوٹ مراعات شکنی کا سہارا لیا جانا ہے اس لیے مراعات شکنی کی بھی وضاحت ضروری ہے، اُنھوں نے کہا کہ پریس کی آزادی جنگل کی آزادی نہیں ہے نفرت پیدا کرنے یا تشدد پر اکسانے کی تحریر غیر ذمہ داری ہے اور اس کو پریس کی آزادی نہیں کہا جاسکتا لیکن کبھی کبھی قابل اعتراض تحریر پر روک لگانے کیلئے سنجیدہ اور ذمہ دارانہ تحریر کو بھی دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اور بہار پریس بل اسی کی تازہ مثال ہے

یونسکو کے مشیر مواصلات ایس ایم علی نے بھی اپنی تقریر میں پریس کی آزادی معلومات حاصل کرنے کا حق اور بین الاقوامی صورتحال میں صحافیوں کی ذمہ داری کا ذکر کیا۔ مسٹر علی نے خیال ظاہر کیا کہ اصولی طور پر بہت سے ملک معلومات حاصل کرنے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں لیکن عملی طور پر صورتحال اس سے کہیں زیادہ مختلف ہوتی ہے۔

سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس ایچ آر کھنہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزاد پریس کا بنیادی کام محکوموں کی خدمت ہے نہ کہ حاکموں کی اسی لیے پریس کو اپنی آزادی کا استعمال برسراقتدار طبقہ کے لوگوں کے پروپیگنڈے اور دباؤ کی سازشوں کے خلاف کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے کہا کہ ذرائع ابلاغ کے لوگوں کے لیے درحقیقت امتحان کی گھڑی تب ہوتی ہے جب حالات غیر معمولی اور ہنگامی ہوں اور جب خوف اور دہشت کا ماحول موجود ہو۔

اُنھوں نے کہا کہ اسی وقت کبھی براہ راست اور بالواسطہ طور پر برسراقتدار طبقے کی جانب سے اخبارات پر دباؤ ڈالے جاتے ہیں، ان حالات میں دباؤ اور دہشت کا اثر قبول نہ کرنا پریس کی آزادی کا سب سے اہم اور قیمتی لمحہ ہوتا ہے۔

ممتاز سماجی کارکن مسز تارا علی بیگ نے افسوس ظاہر کیا کہ ہم ابھی تک سماجی انقلاب کے لیے لازمی سماجی شعور پیدا نہیں کرسکے ہیں۔ اُنھوں نے شکایت کی کہ اخبارات سماجی کارکنوں کے اچھے کاموں کو اپنے یہاں خبروں میں زیادہ جگہ نہیں دیتے۔

تین روزہ سیمینار میں مختلف موضوعات پر باقاعدہ بحث و مباحثہ ہوا اور مقررین نے تفصیل سے اپنی باتوں کو پیش کیا۔ مقررین کی اکثریت اس حق میں تھی کہ پارلیمنٹ کی خصوصی مراعات ختم ہونی چاہئے چیف الیکشن کمشنر مسٹر ایس ایل شکدھر نے جو پارلیمنٹ کے سابق سکریٹری جنرل بھی ہیں کہا کہ پارلیمنٹ کی مراعات کا نظریہ اور مراعات شکنی کے لیے سزا دینے کے اس کے اختیارات بنیادی طور پر برطانوی نظریہ ہے

یونیسکو کے مشیر مواصلات ایس ایم علی

> **ذرائع ابلاغ کو کاروبار کا ذریعہ بنانا یا میڈیا کو سیاست میں اُلجھانا دو ایسے خطرات ہیں جن سے دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ صحافت اثر انداز ہوسکتی ہے۔**

نے کانفرنس میں اعلان کیا کہ یونیسکو اخبارات اور اخبار نویسوں کے مسائل پر اس سال تین مطالعات کرا رہا ہے ان میں سے ایک مطالعہ اخبارات میں اشتہارات کی صورت حال اور جرائد پر دباؤ سے تعلق رکھتا ہے دوسرے مطالعے مختلف زمروں کے اخبارات میں آزادی کا جائزہ لیا جائے گا تیسرے مطالعے کا موضوع مخالف دباؤ، خبروں میں رنگ آمیزی کو روکنے کے لیے اخبارات کے ارباب اقتدار ات کے کردار سے متعلق ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ مطالعے یونیسکو ممتاز تحقیقی تنظیموں کے ذریعے کرائے گی تاکہ مطالعہ کی مثبت نوعیت برقرار رہے۔

اخبارات کے دفتروں میں ایک طرح کی ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے اور بڑے صحافیوں کے اندر خود نمائش اور انانیت کا جذبہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ نئے صحافیوں کو برابر ان کے ہدف کا نشانہ بننا پڑتا ہے

تین روزہ کنونشن کے اختتام پر اخبار نویسوں کی مختلف تنظیموں سے اپیل کی گئی کہ توہین عدالت اور سرکاری رازداری قوانین کا جائزہ لیا جائے اور ان کی اصلاح کے اقدامات کیے جائیں۔

جائزے میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے استحقاق سے متعلق قوانین اخباری صنعت میں تقرریوں، اور اخبارات اور سبھی ذرائع ابلاغ کی اندرونی کارکردگی کا بھی احاطہ کیا جائے۔ کنونشن نے یہ سفارشیں ایک قرارداد میں کیں جسے اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

کنونشن نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ مباحثہ کا خلاصہ اخبار نویسوں کی تنظیموں کو ان کے تبصروں کے لیے بھیجا جائے اور صحافیوں کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنے میں ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

اخبار نویسوں کے اندرونی مسائل

کنونشن کا سب سے دلچسپ مذاکرہ ۱۲ مارچ کو ہوا جب بہت سے نوجوان اخبار نویسوں نے خود اخبارات کے اندرونی ماحول کا تفصیل سے ذکر کیا اور اخبار نویسوں کے کردار کا احتساب کیا اس موقع پر مختلف تقریروں میں یہ تاثر پیش کیا گیا کہ اخبار نویس دوسروں پر تو سختی سے سخت حملے کرتے ہیں لیکن خود اپنے اوپر کوئی تنقید یا نکتہ چینی برداشت نہیں کرتے اخبار نویسوں میں انا کا جذبہ اس قدر غالب ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ تقریروں میں کہا گیا کہ جرنلسٹوں کے لیے شراب بھی اتنی مہلک نہیں ہے جتنی ان کے اندر انا کا جذبہ ہے

نوجوان جرنلسٹوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے انڈین ایکسپریس کے سدیپ مجومدار نے کہا کہ اخبارات کے دفتروں میں ان کی حیثیت یرغمالوں جیسی ہے۔ ان پر سینیئر جرنلسٹوں کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ کچھ بھی نہیں کر پاتے، ٹائمس آف انڈیا کی کرد ستارائے نے بھی تقریباً انھیں احساسات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ سبھی سینیئر جرنلسٹوں میں انانیت اور خود نمائش کا جذبہ اتنا غالب ہوتا ہے کہ وہ کچھ جاننا چاہتے ہی نہیں۔

کالم نویس کے آر سندر راجن نے کہا کہ اخبارات کے دفتروں میں ایک طرح کی ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے اور بڑے صحافیوں کے اندر خود نمائش اور انانیت کا جذبہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ نئے صحافیوں کو برابر ان کے ہدف کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ بڑے صحافیوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے اور سنگین سے سنگین مسئلہ پر بھی کوئی اطلاع حاصل کرنے کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔

●●●

اردو صحافت کا مسئلہ

عثمان غنی

اردو صحافت کے مسائل کا ذکر کرتے وقت جو بات سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے اور جو سوال اٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس بحث کو صرف روزناموں تک محدود رکھا جائے یا اس کے دائرے میں ہفت روزہ جریدوں ماہناموں کو بھی لایا جائے؟

روزناموں اور ہفت روزہ جرائد کے مسائل پر غور کرتے وقت ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہے لیکن اگر ماہناموں کے مسائل کو بھی اس میں شامل کرنا ہے اور صحافت کی تعریف کا دائرہ وسیع کر کے اس میں ادبی اور فلمی صحافت بھی شامل کرنا ہے تو بحث کا دائرہ بہت بڑھ جائے گا اور اس بحث کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس بحث کو اردو روزناموں اور ہفت روزہ جریدوں تک ہی محدود رکھا جائے۔

یوں تو اردو صحافت کے مسائل اردو کے مسائل سے جڑے ہوئے ہیں جن مسائل کا سامنا اردو زبان کو ہے ان مسائل ہی کا سامنا اردو اخبارات و رسائل کو بھی ہے لیکن اخبارات کی حد تک کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو اردو کے مسائل کے علاوہ ہیں، پہلے ان کا ذکر ہو جائے۔

اب سے ڈیڑھ سو برس قبل کے اخبارات جن کی یادگار منانے کے لیے ہم یہاں جمع ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آج کی اخباری دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ بنیادی فرق اگر ملحوظ رہے تو بہت سے معاملات کو اس کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ اب صحافت دراصل ایک صنعت ہے اس کے معنی صرف خبروں اور اداریوں کو فراہم کرنا اور ان کو ایک مخصوص ڈھنگ سے چھاپ دینا نہیں بلکہ یہ ایک منظم شکل اختیار کر گئی ہے جس میں ادارتی اور نامہ نگاری کے شعبوں کے علاوہ سرکولیشن، اشتہارات اور انتظام کے علاحدہ علاحدہ شعبے آتے ہیں اور اس کی حیثیت ایک منظم ادارے کی ہوتی ہے۔ اخبار کو صنعت کے طور سے نکالا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ سرمایہ کاری کا معقول منافع ملے، ممکن ہے کہ

اس کو پرانی اقدار کی کسوٹی پر صحافت کا ایک غیر اخلاقی تصور سمجھا جائے) لیکن اور اسباب سے یہ ضروری ہے کہ صحافت کو صنعت بنایا جائے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی اخبار محض (مدیر یا لکھنے والوں کے) ایک حلقے کی رایوں اور افکار کی ترویج کے لیے نہیں نکالا جاسکتا۔ خبروں کے حصول کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ یہ کسی فرد کے بس کا کام نہیں ایک اہم بلکہ ایک ایسی منظم جماعت کا کام ہے جس میں ہر فرد کی ذمہ داریاں اور اس کے حلقے کار کا واضح تعین ہو۔ خبر رساں ایجنسیوں کی خدمات حاصل ہوں، اضلاع میں۔ اور اگر اخبار ملکی سطح کا ہے تو مختلف زبانوں میں اور اگر بہت بلند سطح کا اخبار ہو تو مختلف ملکوں میں اس کے اپنے نمائندے ہوں پھر ان مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں کی خوبی و خرابی۔ ان کے لائق اشاعت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے۔ ان کو خوبصورت زبان میں بیان کرنے ان کے لیے پرکشش سرخیاں تجویز کرنے اور ان کی سیاسی وسماجی اہمیت کے لحاظ سے ان کا رنگ و روپ متعین کرنے کی غرض سے ایک لائق اور منظم ادارتی عملہ ہونا چاہیے۔

صحافیوں کی اس جماعت کو سرکاری اُجرت بورڈوں کے بموجب مناسب اجرت دینے کا بندوبست بھی ہونا چاہیے اور یہی دوسرا سبب ہے کہ صحافت کو اطباعہ صنعت قرار دینا ضروری ہو گیا یعنی معاشی اور مالیاتی اسباب اخبار کے کاغذ روشنائی اور دوسری اشیاء کی مہنگائی کے سبب سے اخبار کو معاشی اعتبار سے خودکفیل بنانا ضروری ہے، اگر روزناموں یا ہفت روزہ اخبار کی فی اخبار لاگت نکالی جائے تو وہ اس قیمت کا تقریباً تین یا چار گنی ہوگی جس قیمت پر اخبار بکتا ہے، یہ لاگت صرف سرکولیشن سے نہیں نکالی جاسکتی اور اسی لیے اشتہارات کی ضرورت ہے اور اسی لیے صحافت کو صنعت بنانا ضروری ہے جہاں تک اردو اخبارات کا سوال ہے اس کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مجموعی طور پر ابھی صنعت نہیں بن سکے ہیں ـــــ کیوں؟

اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔

اس بنیادی مسئلہ کے علاوہ اردو صحافت کو بعض اور مسائل بھی درپیش ہیں۔ ہمارے اخبار کے پاس مضمون نگاری، اور نامہ نگاری کی ایسی جماعت کی قلت ہے جو جدید موضوعات پر طبع زاد چیزیں لکھ سکیں مثلاً آپ کو کسی اردو اخبار میں بجٹ یا منصوبہ یا سائنس یا سیاسی تجزیے بارے میں طبع زاد اور تجزیاتی مضامین بایدوشاید ہی ملیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اردو اخبارات کا فکری دائرہ محدود ہو کر رہ گیا ہے مذہبی نوعیت کے مضامین کثرت سے مل جائیں گے ان مسائل پر مضامین مل جائیں گے جن کا تعلق اردو یا فسادات یا مسلمانوں کے دوسرے مسائل سے ہو لیکن وسیع تر پس منظر والے مضمون کم ملیں گے اس کے کئی اسباب ہیں اول تو یہ کہ اخبارات کو اپنے قارئین کے مزاج معیار اور رجحان کا خیال رکھنا پڑتا ہے دوسرے یہ کہ باوجود اُردو سے محبت کے اظہار کے دانشور طبقہ، اردو اخبارات کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتا تیسرے خود اخباروں کے مالکوں کی کوتاہی۔ ان اسباب کا اثر یہ ہوا ہے کہ اردو اخبارات کا فکری معیار محدود ہو گیا ہے۔

معیار کے کم ہونے کا ایک اور سبب ہے اور اس کا تعلق بھی اس بات سے ہے کہ اردو اخبارات اب بھی صنعت نہیں ہیں شخصی ملکیت ہیں اور مالکان اخبار سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی غرض سے اول تو صحافیوں کو اجرت بہت کم دیتے ہیں اور چنانچہ زیادہ باصلاحیت لوگ اخبارات میں ملازمت سے کتراتے ہیں اور اخبار اسی بات پر مجبور ہوتا ہے کہ ملکی مسائل پر کسی مضمون کا ترجمہ چھاپ دے۔

چنانچہ معیار کا مسئلہ اردو اخبارات کا دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔

ان دو بڑے مسائل کے علاوہ اردو صحافت کے اور بھی چند مسائل ہیں جن میں سے ایک اشتہارات کا مسئلہ ہے، اردو اخبارات کو اشتہارات دوسری زبانوں کے

اخبارات کے مقابلے بہت کم ملتے ہیں، بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنیاں چند فلمی نوعیت کے ماہناموں کو چھوڑ کر اخبارات کو اپنی اشتہاری مہموں میں شامل نہیں کرتیں۔ سرکاری اشتہارات بھی بروقت ملتے ہیں، اس طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے اور اس مسئلہ پر اردو اخباروں کو خاص طور سے غور کرنا ہے۔

ان مسائل کے علاوہ، کتابت کے مسائل ہیں اچھے کاتبوں کی فراہمی دشوار سے دشوار تر ہوتی جا رہی ہے ان کی اجرت کے مسائل بھی درپیش ہیں، اس کے علاوہ پریس کا مسئلہ ہے، زیادہ تر اردو کے بڑے اخبار والوں نے اب آفسیٹ پر چھپائی کا طریقہ اختیار کر لیا لیکن آفسیٹ کی چھپائی لیتھو کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہنگی ہے اس طریقے کے اختیار کیے جانے کے بھی چند مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔

آفسیٹ کی طباعت کے باوجود اردو اخبارات چھپائی کی اس نئی تکنیک سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں، مثلاً رنگین طباعت کے معاملے میں) اردو اخبارات بہت پیچھے ہیں۔ اب تو انگریزی اور ہندی روزناموں نے بھی اپنے اتوار کے میگزین سکشن میں رنگین طباعت کا طریقہ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے لیکن اردو اخبارات ابھی تک اس تکنیک کو مختلف وجوہ سے نہیں اپنا پائے ہیں۔

اردو اخبارات کی بعض دشواریاں وہ بھی ہیں جن کا تعلق اردو زبان کے مسائل سے ہے ملک میں اردو میں خبریں فراہم کرنے والی کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں ہے روزمرہ کے سرکاری پریس نوٹوں کے علاوہ دوسرے اہم سرکاری کاغذات وغیرہ اردو میں دستیاب نہیں ہیں، جو اردو زبان کا معیار کم ہوا ہے جس کا اثر اردو پڑھنے والوں پر اور ان کے توسط سے ان اخبارات پر پڑا ہے

ان تمام مسائل کے باوجود اس میں بھی شک نہیں کہ

اردو اخبارات کی اشاعت آج پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے ان کی تعداد بھی زیادہ ہے اس لیے صورتحال مایوس کن نہیں ہے اُردو اخبارات کے مالکان اور صحافی دونوں اگر مزید لگن سے کام لیں تو اردو صحافت اعلا معیار تک پہونچ سکتی ہے اور اُردو اخبار بطور صنعت کامیاب ہو سکتے ہیں۔

•••

شجاعت علی سندیلوی :-

اردو صحافت

آسان اردو نثر کی طرح اردو صحافت کا آغاز بھی کلکتہ (مغربی بنگال) سے ہوا، اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار جام جہاں نما مئی ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے اس کے چودہ برس بعد شمالی ہند کا پہلا اخبار "دہلی اردو اخبار" مولانا محمد باقر کی ادارت میں اور دوسرا "سید الاخبار" سید محمد کی ادارت میں شائع ہوا۔ ۱۸۳۷ء ہی میں خیر خواہ ہند، مرزا پور یوپی سے جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر پادری ماتھر تھے اردو اخبارات سے پہلے ۱۷۷۰ء سے انگریزی میں اخبارات شائع ہونا شروع ہو گئے تھے اور ۱۸۳۳ء تک انگریزی میں ۴۸ اخبارات شائع ہو چکے تھے۔ انگریزی کے بیشتر اخبارات ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کی مدح و ستائش کے لیے وقف تھے اس کے باوجود انگریز اخبارات آزادی کے سخت مخالف تھے اور دیسی اخبارات کی آزادی کو تو وہ کسی صورت سے برداشت نہیں کرسکتے تھے ان کے خیال میں:

"جس سلطنت میں غیر ملکیوں کی حکومت ہو وہاں حقیقی معنوں میں آزاد اخبار جاری کرنا اور تھوڑے عرصے تک اس کو برقرار رکھنا ناممکن ہے ہماری حکومت سے پہلے اعلا طبقے کے مسلمانوں کی ساری ہندوستان میں عملداری تھی اور اسی لیے فطرتاً وہ ہماری حکومت سے بیزار ہیں۔ پھر ان کے ہاتھ میں اخبارات کی آزادی دے دینا کیا قرین مصلحت اور دانش مندی ہے"

(اقتباس از تقریر سرجان مالکم مورخہ ۹ جولائی ۱۸۲۲ء)

اس سے قبل تھامس منرو نے ۱۸۲۲ء میں صاف صاف یہ تنبیہ کی تھی۔

"ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی ہے اور نہ کبھی دی جائے گی اخباروں کی آزادی اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو نہ تو ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں اور نہ مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں"

اس مخالفت کا اثر اتنا تو ہوا کہ دیسی اخبار بہت تاخیر سے شائع ہونا شروع ہوئے اور ان کے ایڈیٹر بہت محتاط رہے لیکن انگریزی اخباروں نے ہندوستانیوں میں اخبار بینی کا شوق اور اخبار نویسی کا مذاق پیدا کر دیا تھا، اس لیے ہندوستانی زبانوں میں اخبارات کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زبانوں میں اخبارات شائع ہونے لگے، بنگالی، گجراتی، فارسی، اردو، مرہٹی اور ہندی

انوں میں اخبارات نکلنے لگے دو یا اس سے زیادہ زبانوں کے بارات بھی شائع ہونے لگے ایک اخبار مارتنڈ تو پانچ زبانوں ریزی، بنگلہ، فارسی اُردو اور ہندی میں کلکتہ سے شائع ہوتا ا اس کے ایڈیٹر نصیرالدین تھے۔

جہاں تک اُردو اخبارات کا تعلق ہے، انگریزی اخبارات بعد ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی، اور یہ قریب قریب ملک کے علاقے سے شائع ہوتے تھے۔ کلکتہ، دہلی، لکھنؤ، مدراس، حیدر، بمبئی، اندور، بھوپال، مرشدآباد، سہسرام، رت پور، کراچی، گوالیار، سیالکوٹ، لاہور، سورت، پشاور، رات، ملتان، راولپنڈی، وغیرہ ہر جگہ سے اُردو کے اخبارات نے لگے تھے۔

ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو اخبارات سب سے زیادہ تعداد میں نکلے ان کی تعداد ۳۵ ں، اُردو کے بعد دوسرا نمبر بنگالی اخبارات کا تھا جہاں تک ہندی اخبارات کا تعلق ہے ان کی تعداد صرف بارہ تھی۔ یو پی سے کل پانچ اخبارات ہندی کے نکلتے تھے جبکہ اُردو کے اخبارات ۳ شائع ہوتے تھے یہ تھا ایک سرسری جائزہ ۱۸۵۷ء تک دو کے اخبارات (استفادہ از ہندوستانی اخبار نویسی عتیق مرحوم) ۱۸۵۷ء میں انقلاب عظیم آیا۔ پہلی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں شکست ہو گئی۔ ہندوستان غلام ہو گیا، کمپنی بہادر کے جائے حکومت برطانیہ کا قبضہ ہو گیا اور جدید نظریات و تعلیمات جو اہر ہندوستان میں آ گئی تھی وہ اس سیلاب سے گئی قدیم ی و ادبی، معاشی و اقتصادی، سیاسی و سماجی اور مذہبی لریات و رجحانات اس میں بہنے لگے، مشرق و مغرب کی شکش زیادہ شدت اختیار کر گئی ہر شعبہ حیات اس سے متاثر ہوا، ساتھ ہی ساتھ احساس غلامی بھی شدت اختیار کرتا گیا، اردو کے شاعر ادیب، صحافی، معلم، محقق، علماء، وغیرہ پہلے ہی جنگ آزادی کی تحریک میں شریک ہو چکے تھے، ۱۸۵۷ء کے بعد انھوں نے مختلف طریقوں سے آزادی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اخبارات ہی سب سے بہتر اور موثر ذریعے تھے، اور اُردو زبان ہی ملک گیر زبان تھی اس لیے ہندوستان کے کونے کونے سے اخبارات شائع ہونے لگے۔ ان کی تعداد ہزاروں تک تھی، بیسویں صدی میں اردو اخبارات نے بڑا موثر اور اہم رول ادا کیا، مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال والبلاغ، مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد، مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار، خلافت کمیٹی کا خلافت، انقلاب، انجام جانے کتنے اخبارات نے پورے ملک میں آزادی کے لیے مرنے کی تڑپ پیدا کر دی، حکومت نے ان کو ضبط کیا ان کے ایڈیٹرس کو قید کیا، لیکن حریت کا جو جذبہ ان اخبارات اور ان کے مدیروں نے پیدا کر دیا تھا وہ کم ہونے کے بجائے اور زیادہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا تو یہ عقیدہ تھا۔

نعزیرِ حرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب!
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حصول آزادی میں اُردو کے اخبارات کا، ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں سب سے زیادہ موثر حصہ ہے، ملک کی آزادی انھیں اخبارات کے پیدا کیے ہوئے جذبات حریت اور قوت عمل کی بہت کچھ مرہون منت ہے۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا جس کا علم و گمان بھی نہ تھا، اردو کو گردن زدنی قرار دیدیا گیا اس کو غداروں کی زبان کہا گیا اور اُردو والوں کو پھانسی کا حقدار بنا دیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان وادب، تعلیم و تدریس اخبارات و رسائل تصانیف و تالیف سب پر ادبار آتا گیا اردو اخبارات کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی، اسی شہر لکھنؤ میں ۱۹۴۷ء تک اردو اخبار ہمدم، حقیقت، حق، تنویر، قومی آواز، چھ روزنامے نکلتے تھے لیکن اب صرف دو رہ گئے قومی آواز اور عزائم۔ اسی طرح دوسرے مقامات کے اُردو اخبارات کا حال ہوا غیروں کی حکومت میں باوجود سختیوں

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

جرنلسٹس پبلی کیشنز کے زیر اہتمام یوم صحافت کا انعقاد

اُردو اخباروں کا مسئلہ

دراصل اُردو زبان کی بقا کا مسئلہ ہے

اُردو صحافت کی ۱۶۰ ویں سالگرہ کے موقعہ پر لکھنؤ میں گذشتہ ۵ راپریل کو "یوم صحافت" کے ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا — ہندی بھون میں ہونے والے اُردو صحافیوں اور دانشوروں کے اس جلسہ کا اہتمام جرنلسٹس پبلی کیشنز نے کیا۔

یوم صحافت کی اس خصوصی تقریب کا افتتاح الہ آباد ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج اور اُتر پردیش کے موجودہ لوک آیکت مسٹر جسٹس مرزا محمد مرتضیٰ حسین نے کیا، اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے حکومتُ اتر پردیش کے ایک سینیئر وزیر ڈاکٹر عمار رضوی نے شرکت کی۔ خطبہ صدارت نامور بزرگ صحافی اور قومی آواز کے سابق ایڈیٹر حیات اللہ انصاری ایم، پی، نے دیا، اس کے علاوہ اخبار نویسوں کی صوبائی تنظیم یو پی ورکنگ جرنلسٹس یونین کے صدر جناب صلاح الدین عثمان جنرل سکریٹری کامریڈ اوم پرکاش ترپاٹھی سماچار بھارتی کے بیورو چیف مسٹر گیانندر شرما نو بھارت ٹائمس کے نمائندہ خصوصی مسٹر رمیش شاہ دیا سنکار، امرت پربھات کے اسٹاف رپورٹر سلیش کمار، بلٹز کے نمائندہ مسٹر پردیپ کپور، بزرگ اُردو صحافی مجیب سہالوی، مولانا شمس علوی پروفیسر مرزا رفیع الدین۔ پروفیسر پی ڈی کا شر سیمالی، ڈاکٹر ایس، این مصرا، سردار کرم جیت سنگھ، شری وسی، این کپور، اور اُردو اکادمی کے صدر جناب علی جواد زیدی جیسی ممتاز شخصیتوں نے بھی اس جلسہ میں شرکت کی۔

یوم صحافت کے جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے جسٹس مرتضیٰ حسین نے فرمایا کہ اُردو صحافت کی ترقی اُردو زبان سے جڑی ہوئی ہے انھوں نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ حکومت کی پالیسی اور خود اُردو والوں کی عدم توجہی اور تساہلی سے اردو زبان رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے کہ جب ہم اپنے بچوں سے اُردو پڑھنے کے لیے کہتے ہیں تو وہ آنکھیں دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اُردو کیوں پڑھیں؟۔

جسٹس مرتضیٰ حسین نے خبردار کیا کہ اگر اس ملک سے اُردو زبان ختم ہو گئی تو ہمارا بیش قیمتی ثقافتی ورثہ تباہ ہو جائے گا اور سیکولرزم کا تصور کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اخبار نویسوں کے رول کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس مرتضیٰ حسین نے کہا کہ وہ فرقہ وارانہ منافرت، اور لسانی و علاقائی تعصب

کی بنیاد پر کھڑی کی گئی دیواروں کو توڑ کر عدم تشدد اور سیکولرزم کی بنیاد پر ایک نئے سماج کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مہمان خصوصی کی حیثیت سے وزیر تعمیرات عامہ ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ ملک کی آزادی کے لیے سب سے پہلی آواز اُردو اخباروں نے اُٹھائی تھی اُنھوں نے کہا کہ تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں اُردو اخبارات کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر رضوی نے کہا کہ الیکشن مینی فسٹو سے منحرف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فیصلہ تو ہو چکا ہے صرف کارروائی باقی ہے۔

جناب حیات اللہ انصاری نے اپنے خطبہ صدارت میں اردو اخباروں اور اخبار نویسوں کے مسائل کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اخبارات تاریخ بناتے ہیں لیکن اخبار کا کاغذ اس لائق نہیں تا ہے کہ عرصہ دراز تک اُردو اخباروں کو محفوظ رکھا جاسکے۔ اس لیے حکومت کو چھپے ہوئے اخباروں کی مائیکرو فلم بنانے کی جانب توجہ دینی چاہیئے، اُنھوں نے کہا کہ دراصل اخباروں کا مسئلہ دراصل اُردو زبان کی بقا کا مسئلہ ہے اس سلسلے میں اُنھوں نے تعلیم بالغان کی اہمیت پر خاص طور پر زور دیا۔ جرنلسٹس یونین کے کمشنر

جناب افضال احمد انصاری نے اُردو صحافت کی تاریخ کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ اُردو زبان کا پہلا اخبار جام جہاں نما مارچ ۱۸۲۲ء میں لالہ سدا سکھ اور ہری ہر دت کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہوا ۱۸۳۳ء میں موہن مشرا اور منی رام ٹھاکر نے شمس الاخبار نکالا ۱۸۴۴ء میں سلطان الاخبار کی اشاعت شروع ہوئی یہ پہلا ہندوستانی اخبار تھا جس نے انگریزوں کے مظالم کے خلاف کھل کر آواز اٹھائی، اور اس اخبار کے ایڈیٹر رجب علی لکھنوی کو کمپنی سرکار کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ مولوی باقر نے ۱۸۳۷ء میں دہلی اُردو اخبار نکالا اور کمپنی سرکار کی بھرپور مخالفت کی جب اس اخبار کی اشاعت پر پابندی لگائی گئی تو مولوی محمد باقر اس ملک کے پہلے اخبار نویس تھے جنہوں نے اطلاعات کی فراہمی اور عوام کو باخبر رہنے کے حق

Right of Information

And right to know

کے لیے جہاد کیا بالآخر اس مرد مجاہد نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں جام شہادت نوش کیا۔

مسٹر انصاری نے کہا کہ جہاں ۱۸۵۷ء میں انگریزی کے بعد سب سے زیادہ ۱۴ اُردو کے اخبارات دوسرے نمبر پر بنگالی کے بارہ اور ہندی کے ۲ زبان میں

شائع ہوئے تھے وہیں آج ہندی کے اخبارات نے زبردست ترقی کی ہے اور اُردو زبان کے اخبار آج بھی ڈیڑھ سو سال پُرانی تکنیک پر چھپتے ہیں جبکہ ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات جدید الیکٹرانک اور کمپیوٹروں کے ذریعہ چھپ رہے ہیں۔

اس سے قبل سابق وزیر اطلاعات مسٹر کاشی ناتھ مصرا نے خطبہ استقبالیہ دیتے ہوئے کہا کہ ملک کی آزادی کے لیے جن دھار دار ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا ان میں اُردو زبان بھی ایک دھار دار ہتھیار رہی ہے۔

مسٹر مصرا نے کانگریس (آئی) کے انتخابی منشور کا حوالہ دیتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں وہ اپنے وعدہ کو فی الفور پورا کرے اُنھوں نے کہا کہ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو اُردو عوام آئندہ انتخابات میں یقیناً اسے ٹھکرا دیں گے کیونکہ وعدوں کی بنیاد پر کسی کو زیادہ دن تک بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔

اس موقع پر موجود کانگریس (آئی) کے ممبر اسمبلی مسٹر منظور احمد (میرٹھ) نے بھی ان کی ہمنوائی کی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر عمار رضوی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی کارروائی کرنے کیلئے حکومت کو مجبور کریں۔

جلسہ کی نظامت کے فرائض معلم اُردو کے ایڈیٹر جناب اظہار احمد نے انجام دیئے اور آخر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور اعلان کیا کہ جرنلسٹس یونین کمشنر ہر سال اس موقع پر یوم اردو صحافت کا انعقاد کیا کرے گی

بچا ہوا گلاب

شفق

شادی کے صرف تین ماہ بعد میرے دونوں شانوں میں آگ لگ گئی۔

اور گزرتے دنوں کے ساتھ یہ آگ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے لگتا ہے میں اپنے دونوں شانوں پر دہکتی ہوئی دوزخیں لیے گھوم رہا ہوں۔ آگ، شعلے اور چنگاریاں، روشنی اور اتنی تیز روشنی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ جانا کہیں ہوتا ہے منزل کہیں ہوتی ہے مگر راستے پہچانے نہیں جاتے۔ منزل پر پہونچکر حیرانی کا لمحہ اور پھر نئی جستجو ٹٹول ٹٹول کر طے کیے جانے والے راستوں کا لمس، کنکریاں سنگریزے، لہولہان پاؤں، لہولہان دل، آنکھوں کی روشنی کو ایک نقطے پر مرکوز کر کے میں نے بارہا سفر شروع کیا ہے مگر کچھ دور چلنے کے بعد ہی گمرہی کا احساس جاگ اٹھتا ہے تو پھر واپسی کا سفر۔

میں نے تو داہنے شانے پر رنگین اور مہکتے ہوئے پھولوں کے باغ لگانے چاہے تھے اور اس فکر میں جنگلی گلاب اور بے مہک دار پودوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا قصور میرا نہیں اُس تیز دوزخی روشنی کا ہے جس نے اچھے اور بُرے کی تمیز چھین لی ہے ورنہ وہ معمولی سی ملازمت تو ہمارے چھوٹے سے خاندان کے لیے ابر رحمت تھی ٹھنڈک چاندنی تھی۔ دسمبر کی دھوپ تھی ہمارا سب کچھ تھا، اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے میں نے اُسے چھوڑ دیا کیوں کہ یہ جنگلی پھول اور لتر دار پودے میرے خوابوں کی تعبیر نہیں تھے وہ رنگین خواب جو دل کی گہرائیوں میں کئی سالوں سے مچل رہے تھے وہ سپنے جو ہم دونوں نے بارہا دیکھے تھے اب اُن میں رنگ بھرنے کا زمانہ آیا تھا۔

چھ ماہ پہلے ایک سہانی سی شام اُسے سرخ جوڑے میں لپیٹ کر ہمارے گھر لے آئی۔

میرا خواب، میرا خوشتریاں، میری تمنا میری آغوش میں تھی اور مجھے لگتا تھا کہ میں نے خدا سے اسے مانگ کر سب کچھ مانگ

…یا ہے اور خدا نے اُسے دیئے مجھے سب کچھ دے دیا ہے صبح ہم
…نوں نے اپنے آنگن کو غور سے دیکھا
سیم، کدو کی بیلیں، انار پپیتے کے درخت، بیلے کی اُجڑی ہوئی
…شاخیں، جنگلی گلاب۔

آپ نے بھی غضب کیا ہے گھر کو جنگل بنا دیا ہے ان جنگلی
…پودوں میں خوشبو نہیں ہوتی اور یہ سیم کی بیلیں، آپ دیکھیئے گا میں
…اس آنگن کو چہکتا ہوا باغ بنا دوں گی، یہاں کھڑکی کے نیچے رنگ
…رنگے گلاب کی کیاریاں، نل کے بغل میں چنبیلی کا درخت، دروازے
…کے اوپر جوہی کی بیلیں، یہاں بیلا، نرگس اور موسمی پھول۔

میں تنہا کیا کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی بزدلی کا احساس ہوا
مگر جنت کی تعمیر میں مجھے تنہا نہ چھوڑ دیجیے گا۔
ہمارے خواب مشترک ہیں تو پھر اس کا کیا سوال۔
ماں نے گہری نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں
…ن نے حالے کیا تھا، منہ سے تو کچھ نہیں بولی خموشی سے چھالیاں کرتی
…رہی مگر اُس کے کان ہماری باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

کمرے کی دیواروں سے نمک لگی مٹی جھڑ رہی ہے اگر آپ
…ایک اینٹ کی دیوار گھٹوا کر پلاسٹر کرا دیں تو وہ نہ صرف ڈرائنگ
…روم بلکہ ہمارا بیڈروم بن جائے ایک طرف ٹیبل، کرسیاں دیوار سے
…لگا کر مسہری کے سرہانے کتابوں کی الماریاں تپائی اور ٹیبل لیمپ۔

میں نے ماں کے چاندی جیسے بالوں کی طرف دیکھا پھر چھپر کی
…طرف، پھر اپنی بیوی کی طرف پھر آسمان کی طرف۔ اب کے برسات
…بڑی زوردار ہے، آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ان بادلوں کے
اندر چھپا ہوا سورج کتنا پریشان ہوگا۔ کتنا تھکا ہوا کتنا اداس مگر
سفر مقدر ہے اس لیے نکل کر غروب ہوتا ہے غروب ہو کر پھر نکلتا
ہے مگر میں تو تھکا ہوا سورج نہیں کہ میں نے ایک بار بھی اپنے اندر
کسی طوفانی لہر کا دکھ نہیں جھیلا تھا کبھی کوئی لہر کسی چٹان سے
نہیں ٹکرائی۔ کبھی زمین نے قدم نہیں تھامے۔ کبھی راستوں میں گری
ہوئی دیواروں کے ملبے نہیں۔ ملبے دور میں جانے پہچانے راستوں
پر آہستہ آہستہ چلتا رہا مگر اب میرے اندر کی پرسکون جھیل

بارش کی رُت میں ہے اب مجھے طلوع ہوتا ہے تاکہ پہاڑ کی شبنم
سورج کی روشنی میں قوس قزح بن جائے۔
میں نے بیوی کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔
سب ٹھیک ہو جائے گا تم اسی طرح مسکراتی رہو۔
دن گزر جاتا۔ راتیں آتیں۔ گہری سیاہ راتیں۔ شاید اس کی زلفیں
بکھر کر رات کو اور گہرا کر دیتیں۔ اُس کے ہونٹوں کے دیئے روشن
ہو جاتے اور پھر نشیب و فراز کے سفر، سر ہوتی ہوئی بلندیاں اور پستی
جانے انجانے راستے ادھر . .

آپ ایم۔ اے کیوں نہیں کر لیتے
ایم۔ اے کیوں؟
مجھے کالج کے پروفیسر بہت اچھے لگتے ہیں، میرے محلے میں راحت
صاحب ہیں نا۔ کتنی عزت ہے اُن کی، اسکوٹر کی آواز سُن کر سب سمجھ
جاتے ہیں کہ . . تب آپ بھی اسکوٹر سے آئیں گے اور میں اسکوٹر
کی آواز سن کر آپ کو دروازے پر ریسیو کروں گی۔

گلاب کی جڑ کی مٹی ملائم کرتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے
میں نے الگنی پر ٹنگی ہوئی چادر کی طرف دیکھا پھر اپنی سائیکل کی طرف
جو کئی سالوں سے میری رفیق تھی مگر جس کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا تھا
ایم۔ اے۔ پروفیسر۔۔ اسکوٹر۔۔ کلاسز اور لکچر۔۔۔
لڑکوں کی بھیڑ بھاڑ۔ مومن میر غالب اور اقبال، کرشن، بیدی
منٹو، عصمت سیلاب کی تباہ کاریاں، سائنس کے کارنامے
ہماری آواز اور ہم، دروازے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ،
میری بیوی کی آنکھوں میں التجا تھی۔
" مگر ایم۔ اے کر لینے کے بعد کیا پروفیسری مل جائے گی؟
آپ تو افسانہ نگار ہیں۔

میں نے اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے لو وہ تو گہری،
گہری سانسیں لیتی ہوئی پیاسی بیل بن گئی۔
اور ایک دن ہمارے آنگن کے گلابوں میں پھول کھلے، میں
نے اسے بتایا ڈالیوں کے ان گلابوں سے بہتر تو تمہارے
گالوں کے گلاب ہیں۔

ہنسنے لگی۔
یقین نہ ہو تو یہ دیکھو، میں نے گلاب کا پھول اُس کے گال پر رکھ کر آئینہ سامنے کر دیا اور اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
سنئیے جی جب ہمارے یہاں منا ہوگا تو..
تمہیں بچوں کا بہت شوق ہے؟
ہر عورت پہلے بیوی بننا چاہتی ہے پھر ماں...
مگر تمھاری جڑیں تو پہلے ہی دل کے بہت اندر دفن ہیں
کیا تم خوفزدہ ہو؟
خوفزدہ... نہیں تو.... میں مکمل ہونا چاہتی ہوں۔
مگر میں تو کچھ سالوں تک اپنی مملکت کے بٹوارے کے حق میں نہیں ہوں۔

خلوت میں شوخ تبسم کے جلتے ہوئے دئیے کے درمیان ایک ہنگامہ، خاموش، کتابیں نوٹس اور کاپیاں آنگن میں کھلتے ہوئے گلاب، پرواز کے لیے پھڑپھڑاتے ہوئے بازو خوابوں کے نئے باب، تخیل میں اسکوٹر کی پھڑپھڑاہٹ اور کلاسر میں بکھرے رنگوں میں بوند بوند اُترتی ہوئی ہونٹوں سے نچوڑی ہوئی توانائی۔

مگر بائیں شانے سے چنگاریاں اُٹھنے لگی تھیں۔
ماں خوشی سے چھالیاں کترتی رہتی مگر اُس کی آنکھوں میں بادل خیمہ زن ہو گئے تھے اور میں ڈر رہا تھا یہ بادل کب برسیں گے اور برسیں گے تو کیا ہوگا۔ سیلاب آئے گا اور گلابوں کی جڑیں سڑ جائیں گی، طوفان اُٹھے گا اور جوہی کی شاخیں ٹوٹ کر بکھر جائیں گی، بجلیاں چمکیں گی اور سہری بھری شاخیں جھلس جائیں گے طوفان کب آئے گا۔
بادل کب برسیں گے، بجلیاں کب کڑکیں گی؟
ماں! میرے شانے میں شدید درد ہے۔
موسم خراب ہے بیٹا! ابھی اور خراب ہوگا تم احتیاط کرو ورنہ یہ شانے کا درد ... میں تیل گرم کر کے پالش کر دوں گی۔

رہنے دو ماں۔ آشی سے کرا لوں گا۔
آشی سے ... ماں نے طویل سانس لی تو مجھے بارش کا شور کہیں قریب ہی سنائی دینے لگا اور میں جلدی سے اُٹھ گیا کہ کتابیں مجھے بلا رہی تھیں۔
مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ آپ فرسٹ کلاس سے پاس کریں گے، آشی مجھے پاگلوں کی طرح چوم رہی تھی۔ اُس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے پھر گلابوں کا خیال آیا۔
ہماری ہر تمنا اسی طرح پوری ہوگی۔
مگر شادی کو پانچ ماہ ہو گئے ابھی تک۔
بس ایک سال تک اپنی مملکت کی حفاظت کروں گا۔
آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں؟
بعد میں پچھتانے سے کیا ہوگا۔
مقامی کالج کے پرنسپل نے میری ڈگریاں دیکھیں، پبلشڈ ورک دیکھا اور مطمئن انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا بہت خوب میرے یہاں ایک جگہ خالی ہے آپ جوائن کر سکتے ہیں مگر...
کہیے سر... میرا دل دھڑکنے لگا۔ مجھے خدمت کر کے خوشی ہوگی۔

بات یہ ہے کہ یہ ایک نیا کالج ہے اس لیے آپ کو اپنی چھ ماہ کی تنخواہ کالج فنڈ میں (Donate) کرنی ہوگی۔
چھ ماہ کی مگر...
سب نے ایسا ہی کیا ہے آپ کو منظور ہو تو ٹھیک ورنہ
چھ ماہ پلک جھپکتے گزر جائیں گے، آشی نے میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے سمجھایا۔ پھر سوچئے تو ایک شاندار مستقبل کے لیے کیا یہ قربانی بہت ہے جب کہ لوگ برسوں ٹھوکریں کھاتے ہیں۔
کلرک سے پروفیسر تک کا سفر اتنی آسانی سے طے ہو گیا میں حیران رہ گیا۔ کہاں وہ دفتر میں صاحب کی پھٹکار کہاں آپ سے آپ جھکتی ہوئی پیٹھ، مارننگ سر، گڈ ایوننگ سر، آداب سر، دروازے پر نیم پلیٹ لگ گئی۔

مگر میرے دونوں شانے یکبارگی سلگ اٹھے دو ماہ کا عرصہ گزرتے گزرتے گلابوں میں آگ لگ گئی اور اس آگ میں پہلے سائیکل اور پھر گھڑی جل گئی تو میری ہمت گلابوں کی طرف دیکھنے کی نہیں ہوتی۔ یہ گلاب اتنے دہک کیوں رہے ہیں، لپٹیں کیسی اٹھ رہی ہیں، اتنی سرخی کہاں سے آ گئی، ان کا اور آشی کے گالوں کا مقابلہ ہی کیا۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے گلابوں سے ہٹ کر آشی کے گالوں پر نظر پڑ جاتی تو مجھے مرجھائے ہوئے پھولوں کا خیال آتا اور میرا دل چاہتا میں آئینہ کہیں دور پھینک آؤں، کہیں آشی تنہائی میں موازنہ کرنے بیٹھ جائے۔

پھر ماں کی آنکھوں میں خیمہ زن بدلیاں پگھل گئیں، مجھے پٹنہ کے سیلاب کا خیال آتا جہاں لوگ مکانوں کی چھتوں پر پناہ گزیں تھے مگر میرا گھر تو مٹی اور کھپریل کا ہے گلاب کے پودے سیلاب میں سڑ گئے جوہی کی لتیں ٹوٹ کر بکھر گئیں، بیلے نے خودکشی کر لی اور آشی گردن تک سیلاب میں ڈوبی ہوئی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

اور میرا دل فلسطین کی دھرتی بن گیا، میں بمباری کے خوف سے اندر ہی اندر سمٹتا جا رہا تھا اور میرے چاروں طرف آگ، گرد اور تپش زخموں سے رستا ہوا خون، درد ٹیسیں، درجلن راتوں کو آنکھیں بند کر کے بظاہر سو جاتا مگر جاگتا رہتا کہ کہیں بمباری ننھی پھلی دھرتی کا بھی چیتھڑا نہ اڑا دے، تھکی ماندی آشی میرے گلے میں باہیں ڈالے سوتی رہتی اور میں آنکھیں بند کیے جاگتا رہتا۔ وہ آنکھیں کھولے سوتی رہتی۔

آنے والا کل.. پرسوں پورے چھ ماہ کا ان باس۔

اور عید کو صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔

میں کالج ختم کر کے گھر نہیں گیا، یہ پہلی عید ہے جو آشی میرے گھر کر رہی ہے، لوگ آئیں گے، رشتہ دار آئیں گے۔ ایک پروفیسر کی بیوی کا پرانی ساڑی پہنے ہوئے یہ پہلا عید اور محرم کی طرح، خوشی کے دن آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو، جھکی اور پشیمان نظریں، کمرے میں مقید حبس اور چلتی پھرتی پرچھائیں۔ شادی سے پہلے دیکھے ہوئے عید کے دن کے مشترک خواب، میں اس سے کیا کہوں گا کس طرح

اس کی پیشانی چوم کر عید کی مبارکباد دوں گا، کس بات کی وہ کس بات کی مبارکباد" اس کی بربادی کی، خواہشوں کی تباہی کی، تمناؤں کے خون کی، ماں کی دوا، پیٹ کا دوزخ، بجلی کا بل، بھائی کی فیس عید کے کپڑے اور سیونگ اکاؤنٹ میں صرف پانچ کا ہندسہ جب ہمارے یہاں منا ہوگا تو .... ہر عورت پہلے بیوی بننا چاہتی ہے پھر ماں .. میں مکمل ہونا چاہتی ہوں۔ شادی کو پانچ ماہ ہو گئے پیوورا ابھی تک۔ جب ہمارے یہاں منا ہوگا تو .. جب منا۔۔

میرے قدم فیملی پلاننگ سنٹر کے دروازے پر رک گئے ہیں۔

"ڈاکٹر میرے ایک بچہ ہے اور میں ....

اس رات مجھے تیز بخار رہا۔

شانے کا دوزخ پورے بدن میں پھیل گیا تھا مگر ہسپتال سے باہر نکلتے ہی مجھے موسم کی خوشگواری کا احساس ہوا، آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے اور دور ٹیلے پر سورج پگھل پگھل کر بہہ رہا تھا ہوا میں خنکی تو نہیں تھی مگر مجھے اپنے شانوں کی دوزخیں ٹھنڈی ہوتی معلوم ہوتی تھیں میرا داہنا جیب میں رکھے ہوئے نوٹ مجھ سے دوکان کی طرف چلنے کو کہہ رہے تھے، شوکیس میں سجی ہوئی، مٹھائیاں۔ لہراتے ہوئے رنگین آنچل میڈیکل اسٹور، دوکانوں پر سویاں، بچے، عید کارڈ اور خوشبوئیں دوکانوں پر کتنی بھیڑ ہے اور مجھے کتنی چیزیں خریدنی ہیں، ساڑیاں، دوائیں اور نہ جانے کیا کیا۔ آشی گردن تک سیلاب میں ڈوبی ہوئی تھکی تھکی سی جدوجہد کرتی ہوئی میری راہ دیکھ رہی ہوگی، مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں کے بچے ہوئے گلاب مسکرانے کی کوشش کریں گے مگر میں اسے سیلاب سے نہیں نکالا، میرے بازو، میرا سینہ، میرا دل مسلسل بمباری سے لہولہان ہے، زخموں میں درد اور ٹیسیں ہے، انگلیوں کے پوروں سے خون ٹپک رہا ہے، اس لیے میں اس کا ہاتھ تھام کر سہارا نہیں دیتا کہ وہ پوروں سے ٹپکتا ہوا خون دیکھ کر ہمت ہار دے گی، میں اس سے آنکھیں نہیں ملاتا کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھ سے سوال کریں گی۔

سہارے وہ گلاب کیا ہوئے ؟

جوہی بیلا اور مالتی کے پودے لتیں، شاخیں اور پھول سب کہاں چلے گئے، خواب پتھر پر گرے کانچ کے برتن کی طرح چکنا چور کیوں ہو گئے، تمھارے سہارے تو میں نے بلند بال سر کرنے کا عزم کیا تھا مگر آج سیلاب میں گھری ہوئی ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں میرے پاؤں کیچڑ میں دفن ہوتے جا رہے ہیں مجھے ایسا لگتا ہے میں ایک دن اسی طرح اپنے گلابوں کی لاش اپنے کاندھوں پر لیے کیچڑ میں دفن ہو جاؤں گی، کھو جاؤں گی، تم کب آؤ گے ؟ کب وعدے پورے کرو گے ؟

شام کچھ اور گہری ہو گئی تھی، دوکانوں پر قمقمے جگمگانے لگے، میں نے دو معمولی ساڑیاں خریدیں، دوا خریدی رکشہ والے کو میں نے رکشہ دھیرے چلانے کی تاکید کی تھی میری نظریں رکشہ والے کی پسینے میں بھیگی ہوئی پیٹھ پر جمی ہوئی تھیں جو دھیرے دھیرے کوئی فلمی گیت گنگنا رہا تھا۔

تم روز کتنا کما لیتے ہو ؟

رکشے والے کو اس سوال پر حیرت ہوئی اُس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلی مگر مجھے سنجیدہ دیکھ کر دھیرے سے بولا یہی کوئی آٹھ دس۔ آپ تو کالج میں پڑھاتے ہیں نا۔ میں آپ کو پہچانتا ہوں۔

میں اپنے دل میں انگڑائی لیتے ہوئے خیال سے سہم گیا اُنگلیاں جیب میں بچے ہوئے نوٹوں سے کھیلتی رہیں اور نظروں کے سامنے خود بخود دیکھتی ہوئی بھیڑ میں جانے پہچانے چہرے، کلاسز، لکچر، اور دوڑ کر پاس آتا ہوا عید کا دن۔ جا نگھوں میں دھیرے دھیرے اُٹھتی ہوئی ٹیسیں، طیاروں کی گڑگڑاہٹ، بمباروں کا شور، آگ، دھواں، گرد، اور لہولہان، دھرتی سیلاب میں گڑے ہوئے آشی کے پاؤں، ماں کی آنکھوں سے گرتی ہوئی بجلیاں، طوفان، سیلاب، میں آپ کو پہچانتا ہوں آپ کالج میں۔۔

رکشہ والے رکشہ تیز چلاؤ مجھے جلدی ہے۔

تیز چلنے سے دھچکے لگے گا اور تکلیف . . .

تیز چلنے سے دھچکا تو لگ چکا میرے دوست اور یہ دھچکا لہولہان دھرتی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ کا غسل دے دیا گیا ہے، آگ سرد ہونے پر بھی، تیز بارش ہونے پر بھی، گرد اُڑنے پر بھی سیلاب آنے پر بھی دھرتی کی جلی ہوئی کوکھ سونی کی سونی رہے گی۔ اس دھرتی میں کبھی ہل نہیں چلے گا۔ کیاریوں میں قل قل کی آواز کرتا ہوا پانی نہیں بہے گا بیجوں سے ننھے ننھے پودے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف نہیں دیکھیں گے، زمین کی طرف دیکھیں گی آشی میری طرف دیکھے گی اور اُس راستے کو جس سے کوئی ننھا منا وجود دوڑ کر آنے والا ہوگا . . . دور تک سناٹے میں کوئی آواز نہیں کوئی سایہ نہیں، آگ صرف آگ۔ . .

سنتے ہو جی، جب ہمارے یہاں منا ہوگا تو . . .

شادی کو پانچ ماہ ہو گئے ابھی تک

ہر عورت پہلے بننا چاہتی ہے پھر ماں۔ میں مکمل ہونا چاہتی ہوں۔

گھر پہنچا تو آشی نے میرے بغل میں دبے ہوئے پیکٹ کی طرف دیکھا پھر دواؤں کی طرف، اُس کی آنکھوں میں چراغوں کی لو جلی مگر جب اُس نے میرے زرد چہرے کو دیکھا تو گھبرا گئی۔

کیا ہوا جی ! آپ ایسے کیوں ہوئے جا رہے ہیں اماں دیکھیے تو

گھبراؤ نہیں ذرا سا بخار ہو گیا ہے۔

مگر آپ کے ہاتھ تو بالکل سرد ہیں۔

بخار اندر ہے۔ ڈاکٹر نے یہی بتایا ہے تم نہیں سمجھو گی

میں اُس کے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ جب وہ کام ختم کر کے میرے پاس آئی تو اندر کی آگ باہر پھیل گئی تھی اور میں تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ اُس رات میری آنکھیں جب بھی کھلیں وہ جاگتی ہوئی میرا سر دباتی ہوئی میرے چہرے کو چومتی ہوئی ملی۔ میں نے کئی بار اُسے سو جانے کے لیے کہا اُس کی آنکھیں دیکھ کر چپ رہ جانا پڑا۔

آپ کے پاس تو پیسے نہیں تھے پھر یہ کپڑے دوائیں

اور . . .

ایک دوست نے قرض لوٹایا ہے۔

مگر میرے پاس تو۔

میں اور سارے دکھ تو خوشی سے جھیل سکتا ہوں مگر آشی کے چہرے کی شکن آنکھوں کی پریشانی سہن نہ کرسکوں گا، میں نے اُس کی پیشانی چوم لی اور وہ سحرزدہ سی میری باہوں میں پڑی سرگوشیاں سنتی رہی۔

تین دنوں تک مجھے گھر میں رہنا تھا تمام دن گھر میں بچوں کا شور، ارمی، نیفی، شانی اور بولی "آمی میری گڑیا" "گڑیا ... کھلونے" "آشی نانی" "آشی طوطے مینے والی کہانی" ...

میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں مگر آوازیں تو ان کھڑکیوں دروازوں میں سے گزر کر مساموں سے میرے اندر ... میں ... اور ایک کے بعد ایک کھلتے دریچوں سے نکل کر ... آشی گڑیا کھلونے کہانی اور ...

سیلاب کا زور کم ہوگیا تھا۔ بمار طیارے ... آشی کے چہرے کے گلاب دیکھنے لگے تھے میرے ... دور غیبی ... ہوگئیں تھیں مگر دونوں حاملکھوں کے ... تھی اور رگوں میں دوڑتے ہوئے راگ دماغ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آشی کو بچوں کا بہت شوق ہے اور میرے اپنی ملازمت کی ایک سال تک حفاظت کرنے کا عہد کیا تھا مگر اب آشی سے کیا کہوں گا، کیسے کہوں گا کہ میں نے اپنی ... اب ساری زندگی اسی گھر میں اس آنگن میں بڑوس کے بچوں کے درمیان بوڑھی آشی کہانیاں سنائے گی۔ گڑیوں کا بیاہ رچائے گی، ٹافیاں اور کھلونے تقسیم کرے گی اور تب ... کے سینے میں ... سی اُٹھے گی وہ جب کسی بچے کو اپنے سینے سے بھینچے گی تو اُس کی پیاسی چھاتیاں کسی کے نرم و گرم ہونٹوں کی منتظر چھاتیاں پکڑ جری آواز سننے کے منتظر کان اور وہ سسکتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھے گی تو میں ...

میں نے خود کو کہہ ... باتیں کرنے کا حکم ...

کم موقع، کم سے کم وقت اپنے اندر کے چور سے ڈرا ہوا سہما ہوا اگر اُس نے اپنی تمنا کا اظہار کیا بچوں کی باتیں کیں تو؟ میرے جھوٹے بہانوں میں پڑی گہری دراریں صاف نظر آجائیں گی مگر میں اس طرح کب تک صلیب پر لٹکتا رہوں گا۔ کب تک مصروفیت کا بہانہ کروں گا کاغذ کی ناؤ کتنی دور چلے گی اور تب ... کہیں وہ مجھے ...؟

پرنسپل صاحب نے میری لگن اور کالج کی ترقی کے لیے میرے کام دیکھے تو ایک ماہ کی تنخواہ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے آپ کے Donation کی معیاد تیسرے ماہ ہی ختم کر دی گئی اور ... آپ ہر ماہ اپنی تنخواہ لیں گے۔

آشی تو جیسے پاگل ہوگئی، ماں کی آنکھوں کی بدلیاں کبھی چھپ گئیں اور پورے آنگن میں دھوپ پھیل گئی، آشی فرصت کے لمحات میں ملبوں کے نیچے دبی ہوئی گلاب بیلے اور جوہی کی جڑیں تلاش کرتی رہتی۔ کچھ نہیں بچا ہوگا سب سڑ گل گیا ہوگا نئے پیڑے درخت لگانے ہوں گے مٹی ملائم کرنی ہوگی

میں مجرم بنا اس کی مشغولیت دیکھتا رہا اندر ہی اندر سلگتا رہا جیسے کوئی دیا بند کمرے میں جلتا ہوا اور باہر اندھیرے میں پانی برستا رہتا ہے ...

اُس نے مجھ سے کچھ کرنے کو نہیں کہا جو کچھ کرکے آتی مجھے دکھاتی، بتاتی، مشورہ طلب کرتی اور میں خاموش تکا ہوں سے دیکھتا رہتا۔

وہ بڑے اعتماد سے کہتی ہمارے سارے خواب پورے ہوں گے اب تنخواہ ملے گی تو میں کچھ روپے پس انداز کروں گی تب نا آپ اسکوٹر لے سکیں گے مگر آپ اتنے چپ چپ سے کیوں رہنے لگے ہیں۔ پریشان، پریشان، مجھ سے کوئی غلطی ہوئی یا اب پچھتا رہے ہیں کہ میں نے اس سر پھری لڑکی سے کیوں ...

میں نے اپنے ہونٹوں سے اُس کے ہونٹ بند کر دیئے۔

تمہیں میری محبت میں کمی معلوم ہوئی کیا؟

اور میں نے اپنی محبت، اپنے وجود کے ہونے کا یقین دلانے

لیے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کا سایہ قائم کر دیا۔ اُسے اُس کی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کسی تمنا کا اظہار کرے رات گئے دیر تک گہری گہری سانسوں کے درمیان میں اور وہ اُن راستوں پر چلتے رہتے جو اب انجانے نہیں رہے تھے جن کے ایک ایک لمس ایک ایک اسرار پستی و بلندی نرمی و سختی اور مدتوں سے ہم آشنا ہو چکے تھے پھر بھی بڑی راحت بخش بڑی لذت بھری جانی پہچانی وادی میں آبشار کا شور، ہوا کی گنگناہٹ، پھولوں کی نرمی، شبنم کی آنچ اور ہم دونوں مسرتوں کے حصول کے لیے آگے اور آگے کی طرف، تب ٹھوکر لگتی ہم گرتے گرتے سنبھلتے آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور وہ تھکی تھکی سی آواز میں بند ہوتی آنکھوں کے درمیان سرگوشی کرتی آپ تو دیوانے ہو گئے ہیں کبھی کوئی ایسے بھی۔

وہ سو جاتی اور میں صلیب پر سے اتر آتا۔ ایک دن اور بیت گیا ایک جگ اور بیت گیا، رات ڈھلے گی اور صبح ہو گی دن ڈھلے گا شام ہو گی پھر رات اپنی زلفیں بکھرائے گی اور میں اپنے اندر سے نچوڑ نچوڑ کر قطرہ قطرہ حرارت جمع کیے چلا گیا اور اُسے مشین کے استعمال کے لیے تیل کی طرح استعمال کروں گا صلیب پر ٹنگی ہوئی ایک رات کے لیے پھر اسی طرح مسلسل راتیں لمس بکھراتے جا رہے ہیں پھولوں کی خوشبوئیں اڑتی جا رہی ہیں، آبشار کا بے ہنگم شور، ہوا کی گنگناہٹ ذہن میں ڈنک مارنے لگی ہے اس بکھراتے ہوئے لمس کو قوت ارادی کی گرمی کب تک متحرک رکھ سکے گی، ایک دن حرارت کا آخری قطرہ بھی خشک ہو جائے گا اور تب... ذہن میں پھیلتی ہوئی لکیریں کشادہ دراڑیں بن کر آسنی سے کہہ دیں گی کہ سیلاب میں گلاب جوہی، چنبیلی، کی جڑیں ہی نہیں سڑیں تمھارے تمناؤں کے چمن میں بھی آگ لگ گئی تھی اور اب وہاں جلی ہوئی دھرتی میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں کہ پیاسے کے ہونٹوں پر امرت بنے، تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو بھاگتی رہو گی اور ایک دن تمھارے چہرے پر لاتعداد جھریاں ہوں گی اور جھریوں میں ریت کے ذرّے۔ تمھارے بال چاندی ہو جائیں گے اور تم پیاس کا صحرا بنی کاندھوں پر سوار آرام گاہ کی طرف لے جائی جاؤ گی آخری آرامگاہ کی طرف۔۔

مگر آسنی نے عید کے بعد پھر کبھی مکمل ہونے کی بات نہیں کی، بچے کی باتیں نہیں کیں اور جب نیند گزرتے گزرتے اُس نے مجھ سے بھی کترانا شروع کر دیا۔ میں اُسے خوابوں کے جزیرے پر سفر کی دعوت دیتا، ساز پر موسیقار کی انگلیاں متحرک ہوتیں مگر کوئی لہر نہ اُٹھتی، کوئی احساس نہ جاگتا، وہ میری کہانیوں کے آنگن میں لگے پودوں کی کالج کی اسکوٹر کی اور دنیا جہان کی غیر متعلق باتیں شروع کر دیتی، میں لکھتا رہتا پڑھتا رہتا وہ بستر پر کہنی کے بل اٹھی لیٹی ہوئی ایک ٹک مجھے دیکھتی رہتی، تب میری رگوں میں دوڑتے ہوئے ناگ نوچ نوچ کر میرا مغز کھانے لگتے۔

کیا آسنی نے میری جاگتی آنکھوں پر کھلے گلاب دیکھ لیے؟ میں نے تو یہ وہ پوشی کی پوری کوشش کی تھی، سفر ہمیشہ اندھیرے میں شروع اور ختم ہوا۔ نہ جانے کی جگہ سیدنگ ٹراکزر تے لی تھی پھر کب کہاں اور کیسے یہ کچھ ہوا، پوچھنے پر وہ کچھ نہیں کہتی اور میں بے چین رہتا کیسے اُس کے خیالات میرے ذہن میں ٹرانسمٹ ہو جائیں چاہے وہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں، گالیاں، طعنے جو کچھ سوچوالا لکھی ہیٹ توڑے چاہے سب کچھ جھلس جائے سب فنا ہو جائے مگر یہ دوریاں یہ فاصلے کھویا کھویا پن اُلجھی اُلجھی نظریں یہ بے چینیاں کسی ساحل سے ہمکنار ہو جائیں۔

اور اُس رات حملہ آور طیاروں نے پھر فلسطین کی دھرتی پر بمباری کی، تب آسنی نے اپنے بکس سے ڈھیر سارے کپڑے نکالے چھوٹے چھوٹے کپڑے۔ رنگ اونی سوئٹر، ٹوپی، جرابیں، چڈیاں فراکیں اور قمیص۔۔۔

آگ لگا دو ان میں، جلا دو ان کپڑوں کو، پھر لوگرم راکھ اپنی مانگ میں کہ اس گھر میں ان کو پہننے والا کبھی نہیں آئے گا، میں چیخ رہا تھا۔ میں نے عید کے دل کے لیے اپنی مملکت ڈیڑھ سو روپیہ میں فروخت کر دی ہے۔ اب یہ گھر جنتہ شونا

آلی عفو ہیہ

پیغمبر

فخرالدین عارفی

دائرہ اور دائرہ .

میں، تم، وہ اور ہم سب .

ہاں ہم سب ایک دائرے کے قیدی ہیں۔ دائرہ جو آہستہ آہستہ تنگ ہو رہا ہے

. . . . .

دائرہ جو ہمیشہ سمٹ رہا ہے . . .

دائرہ، جس کے چاروں طرف سرخ شمعیں فروزاں ہیں۔

اور دائرہ جو یقیناً ایک روز اپنی شناخت کھو دیگا . . اور تب میں، تم، وہ اور ہم سب بھی صفر میں تبدیل ہو جائیں گے کہ دائرہ کا مقدر صفر اور صفر ہے . . .

دائرہ بے رنگ تھا .

دائرہ بے رنگ ہے اور

دائرہ بے رنگ رہے گا .

یہ ہماری آنکھوں کا دھوکا ہے کہ ہمیں ہر شئے رنگین نظر آتی ہے، قصور ہمارا ہے کہ ہم اشیاء کو اپنی آنکھوں پر عینک لگا کر دیکھتے ہیں اور کبھی دیکھی جانیوالی شئے پر غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دائرہ بے رنگ ہے . . .

دائرہ بے رنگ تھا . . . اور

دائرہ بے رنگ رہے گا . . .

. . . .

دنیا کے سبھی رنگ بے رنگ ہیں، ہر چہرے کو بے چہرگی کی دیمک چاٹ رہی ہے، خوش آئند مستقبل کا خواب اور حال کے روشن مینارے سب "لا" کے دائرے میں ہیں۔

لا۔ صفر

صفر۔ لا

ہم سب نقطوں کے قیدی ہیں اور حرفوں کا بوجھ ڈھو رہے ہیں۔ تنگ و دو کی ساری منزلیں خلاء میں ہیں اور خلاء کچھ بھی نہیں۔

صفر، صفر، اور صفر، . .

کل، آج اور کل . . . . (محاصرہ) صفر

صفر، صفر اور صفر . . .

اپنے درمیان کی چیزوں کو naked eyes سے دیکھو اور آنسو بہاؤ کہ فنا ہمارا مقدر ہے

لیکن کیوں؟ جبکہ ہم "اشرف" ہیں؟؟

میرے بھائی ہم خلاؤں میں بھٹک رہے ہیں، ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے پھر ہم کیسے حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں ۔؟

اس کے لیے تو ہمیں اپنی آنکھیں کھولنی ہی ہوں گی اور قدموں کو دھرتی پر جمانا ہوگا.

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ جب تک ہم ایسا نہیں کریں گے اصلیت ہم سے

پاشیدہ رہے گی اور ہم یوں ہی خلاؤں میں
بھٹکتے رہیں گے، گمراہ ہوتے رہیں گے۔"
پھر تم میری باتوں پر یقین کرو، اس لیے
کہ میں نے اپنی آنکھیں کھول کر اور اپنے قدم
کو زمین سے ٹیک کر سب کچھ دیکھ لیا ہے
میں جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔
"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب میں
بھی اپنی آنکھوں سے سب دیکھ رہا ہوں،
مجھے بھی نظر آنے لگا ہے۔ واقعی اب میری
آنکھیں کھل چکی ہیں۔۔۔
لیکن یہ کیا؟ اب میں ایک طرح کا
گھٹن محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے سانس لینے
میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔ میں اپنے
ارد گرد کسی سڑاند اور بدبو کا احساس کر رہا
ہوں۔ اُف۔۔۔ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔
ہاں یقیناً تمھارا دم گھٹتا ہوگا لیکن تم
یقین کرو کہ میں اسی گھٹن کے ساتھ ہزاروں
سال سے زندہ ہوں۔ دیکھو میں کیا تھا اور کیا
ہو گیا ہوں۔ کوئی میرے دکھ کا سمجھنے والا نہیں
تھا، کوئی نہیں جانتا ہے کہ میں اتنے دنوں سے
کس طرح زندہ ہوں۔ لیکن اب تم نے بھی میری
طرح حقیقت کا سراغ پا لیا ہے اب تم
میرے رفیق ہو۔ یقیناً تم میرے دکھ کو محسوس
کر رہے ہو گے؟ پھر بولو، میں جو کچھ کہتا تھا
کیا غلط کہتا تھا؟ جھوٹ بولتا تھا؟
"نہیں ہرگز نہیں ۔۔۔ تم نے جو کچھ کہا
ہے وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ ہم نے
ہمیشہ وہی کیا ہے، جو کچھ تم نے دیکھا۔۔۔
محسوس کیا ہے۔۔۔ باقی ۲۴ پر

تھی کہ ہم نے تمھاری باتوں کو جھوٹ سمجھا
لیکن آج میں تمھاری ایک ایک بات کی
تصدیق کرتا ہوں اور قسم کھا کر لوگوں کو
یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کہا
ہے وہ سو فیصد سچ اور مبنی بر حقیقت
ہے۔۔۔
ہاں یقیناً ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے،
زیادتی برتی گئی ہے، ہمیں فریب میں مبتلا
کیا گیا ہے، ہم سے ایک سنگین مذاق کیا گیا
ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سب کھلونے
ہیں اور کھلونا ٹوٹ جاتا ہے، ٹوٹنا ہی ہمارا
مقدر ہے۔ اس نے ہم سب کو دھوکا
دیا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان سب سے
افضل ہے۔ اس نے ہم سب کو دھوکہ
دیا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان سب
سے افضل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ
ان باتوں کا سچائی سے دور کا بھی رشتہ
نہیں۔ سب کچھ محض ایک قصہ ہے
خیال ہے، قیاس ہے۔۔۔ سچ تو یہ ہے
کہ ہم سب کھلونے ہیں اور ہمارا مقدر
ٹوٹنا ہے۔
"خیر خالق کا مخلوق سے محبت
کا فلسفہ؟"
"سب فلسفہ ہوتا ہے۔ فلسفے میں سچائی
کی تلاش بے سود ہے۔ فلسفہ کبھی سچ نہیں
ہوتا ہے، ہم دنیا کے تمام فلسفوں کو بھول
جائیں۔ فلسفے نے ہمیشہ دنیا کو گمراہ کیا ہے۔
ہم تو۔۔ جب آفتاب گھر پر ٹھہرا ہے
تو عوام کو روشنی اپنا سے مل سکتی ہے۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، تمھاری رائے
سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن آخر ہمارا کیا
ہوگا؟"
کچھ تو انجام ہوگا ہی۔۔۔
"لیکن کیا۔۔۔؟"
کبھی تم نے بچوں کو کھلونوں سے کھیلتے
ہوئے دیکھا ہے؟
"ہاں دیکھا ہے!"
تو پھر کھلونوں کو ٹوٹتے بکھرتے بھی
ضرور دیکھا ہوگا؟
"ہاں۔۔۔؟"
بس یہی ہمارا انجام ہے۔۔۔۔۔
ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جانا، ریزہ ریزہ ہو
جانا۔
"لیکن وہ کوئی بچہ تو نہیں ہے؟"
ہاں۔ وہ بچہ نہیں ہے لیکن ہم سب
تو کھلونے ہیں اور کبھی کبھی بڑے بھی کھلونوں
سے کھیلتے ہیں۔ کھلونا بہرحال ٹوٹ جاتا
ہے کہ کھلونے کا مقدر ہی ٹوٹنا ہے۔
"بڑی عجیب بات ہے۔۔۔"
ہاں، یہ بھی بات عجیب و غریب ہی
ہے۔۔۔۔
"تو گویا ہمارا وجود۔۔۔۔"
ہاں صفر، صفر اور صفر۔۔۔
صفر کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے،
ایک سے مل کر دس اور دس سے مل کر
سو بن جاتا ہے لیکن ہماری کوئی اہمیت
نہیں ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں صرف مٹی۔۔۔
"اُف میں پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔"

یہ بزدلی ہوگی اور ہم بزدل نہیں

اف بے شک ہم پر ظلم ہوا ہے،
ساتھ زیادتی برتی گئی ہے، ہم پہنچ
کرا رہے لیکن ہماری درد بھری
خانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ
ں رکھتی ۔ یہ یقیناً ظلم ہے، زیادتی
"
۔ ہمارے ساتھ انصاف نہیں
-
نا کا لوڑھا اثر در ہر لمحہ ہمارے تعاقب
لیا خبر کب کمزور لمحے ہمارا مقدر بن
..
ارے چاروں طرف تیز آندھی چل
طوفان کا زور ہے۔ ایسے میں بڑے
اور درخت گر جاتے ہیں۔ ایک
بساط ہی کیا ہے . . .
"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو!"
ہمنے ہمیشہ سچی باتیں کہی ہیں۔
دور میں مجھے جھٹلایا گیا ہے، میری
غلط ثابت کیا گیا ہے لیکن میں پیغمبر
یری باتوں پر یقین کرو۔
دیکھو سامنے سے ایک جنازہ آ رہا ہے
اس انسان کا ہے جو پورے ایک
تک زندہ رہ کر آج قید ہستی سے
گیا ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ
ی خوشی سے مرا ہے۔ ہرگز نہیں
ا اپنی خوشی سے نہیں مرتا ہے۔
ں تک زندہ رہنے کے بعد بھی جو شخص

مرا تھا وہ یقیناً اپنی خوشی سے نہیں مرا
ہوگا۔ سو سال کی زندگی ہی کیا ہوتی ہے؟؟

اور وہ دیکھو۔ اس جنازے کے دس
قدم پیچھے ہی ایک دوسرا جنازہ بھی ہے
یہ ایک نوزائیدہ بچے کی میت ہے جو
پیدا ہوتے ہی ختم ہو گیا ہے۔ جانے کیوں؟
چراغ جل رہا ہے، اندھیرے کی
دوسری چیزوں کو بھی تم دیکھ سکتے ہو:
دیکھو سامنے کے مکان میں ایک بیوہ عورت
اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی ہے اس کی
گود میں ایک ننھا بچہ بھوک کی شدت
سے تڑپ رہا ہے، ماں چاہتی ہے کہ اپنے
جگر کے ٹکڑے کو دودھ پلائے لیکن
وہ مجبور ہے، اس کی چھاتی میں دودھ
کہاں ہے؟ دودھ تو جب ہوتا کہ اسکے
پیٹ میں روٹی ہوتی، لیکن وہ بھوکی ہے
کئی دنوں سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے
شاید کہ کوئی اپنی آنکھیں بند کر کے زندگی
کی خیرات تقسیم کر رہا ہے
وہ عورت متواتر رو رہی ہے لیکن
اس کی آواز اس پڑوسی سیٹھ کے کتوں
کی بھوک میں دب کر رہ جاتی ہے، سیٹھ
کے کتے ہمیشہ شور مچاتے رہتے ہیں۔
جبکہ سیٹھ ان کتوں کا ہر طرح سے خیال
کرتا ہے، میں روزانہ دیکھتا ہوں کہ سیٹھ
دن بھر میں متعدد بار اپنے کتوں کی نگہبانی
کرنے آتا ہے، وہ جب بھی آتا ہے تو
اس کے ہاتھوں میں دودھ کی بالٹی اور
روٹیوں کی قاب ہوتی ہے۔ وہ اپنے
کتوں کو بھر پیٹ کھلاتا ہے اور پھر ان
کو گھنٹوں پیار کرتا ہے

محلے کا ہر آدمی کہتا ہے کہ سیٹھ بہت
اچھا آدمی ہے۔ وہ اپنے کتوں کا کتنا خیال
رکھتا ہے، اس لیے کہ وہ ان کا مالک ہے
اور تب ہماری آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں، میں
رونے لگتا ہوں۔

••

جام جہاں نما (بقیہ صفحہ ۹ سے آگے)

الغرض مبنہ اُردو اخبار یا متذکرہ
ہندوستانی اخبار کے بارے میں مثبت
تحریری ثبوت یا ان کے کسی شمارہ کی
عدم دستیابی کے باعث اسے" اردو
جام جہاں نما" پر تقدم حاصل نہیں ہو سکتا
جس کی کئی جلدیں نیشنل آرکائیوز دلی
میں محفوظ ہیں اور راقم الحروف کو ان
مطالعہ کا شرف حاصل ہے

اُردو صحافت (بقیہ صفحہ ۲۱ سے آگے)

اور پابندیوں کے اردو اخبارات کی تعداد
کیوں زیادہ تھی؟ اور ہر طرح کی سہولتیں
دینے کی مدعی انہوں کی حکومت میں یہ تعداد
کیوں کم ہو گئی؟ اسکا سبب یقیناً یہ ہے کہ
۱۹۴۷ء سے پہلے اردو زبان، اسکی تعلیم پر
کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور آزادی
آنے کے بعد لسانی آمریت اور تنگ نظری
نے اس کا خون کر دیا۔

ترکی افسانہ:-

سایۂ نجات سے

عزیز نیسن

ترجمہ — نہال الدین عثمانی

کسی زمانے میں کرۂ ارض کے کسی خطہ میں ایک ایسا ملک آباد تھا جس کا ذکر آج نہ جغرافیہ کے صفحات میں ملتا ہے اور نہ تاریخ میں۔

کہتے ہیں کہ ایسا وقت آیا جب دیکھتے ہی دیکھتے اس ملک کے باشندوں کی جسمانی ساخت میں کچھ واضح تبدیلیاں رونما ہونے لگیں پہلے تو لوگوں کے سر جھکنا شروع ہوئے اور جھکتے جھکتے شانوں کے درمیان اتنے دھنس گئے کہ گردنیں بالکل غائب ہو گئیں پھر ہر شخص کی کمر میں کوبڑ ظاھر ہونے لگا۔ آخر میں لوگوں کا زمین پر چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا جیسے پورے ملک کی آبادی کسی غیر معمولی بوجھ سے دبی جا رہی ہے اور عوام کے پیر بھاری بھرکم زنجیروں سے جکڑ دیئے گئے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ہر شخص نے کراہنا شروع کر دیا۔ سب کے منہ سے یہی جملے سنائی دیتے "آف! اب نہیں کھینچ سکتے! ہائے اب نہیں اٹھا سکتے! رفتہ رفتہ یہ جملے چیخ و پکار میں تبدیل ہو گئے۔

جب عوام کے کراہنے کی آوازیں ساتویں آسمان تک سنائی دینے لگیں تب کہیں یہ دل دوز آوازیں حاکم وقت کی توجہ کا مرکز بنیں۔ اس نے بیتاب ہو کر مصاحبوں سے دریافت کیا "ہماری میٹھی نیند میں خلل انداز ہونے والی یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟"

عرض کیا گیا بادشاہ سلامت! یہ آپ کی رعایا کی فریاد ہے۔ شروع میں جب یہ آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچی تھیں تو ہم نے انھیں ہوا کی سرسراہٹ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ جلد ہی وہ سراہٹ سسکی میں بدل گئی لیکن ہم نے پھر بھی توجہ نہ کی جب یہی سسکی بڑھتے بڑھتے شور میں تبدیل ہو گئی تو ہم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کہ شاید یوں ہی اس شور سے نجات مل جائے۔ اب یہی شور ہنگامہ کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ اگر جہاں پناہ حکم دیں تو شور کرنے والوں کی کچھ نسیں کاٹ دی جائیں

تاکہ لوگوں کی چیخ پکار آپ کو بے چین نہ کر سکے۔

بادشاہ نے ڈانٹ کر کہا، "ہم عہدِ بربریت میں نہیں، دورِ حاضر میں جی رہے ہیں۔ تم لوگ گزرے ہوئے زمانے کی بات نہ کرو۔ آج کا دن آتے ہی کل کا دن دس ہو جاتا ہے۔ منادی کرا دو کہ عوام دارالحکومت کے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں تاکہ ہم ان سے خطاب کر سکیں۔"

دوسرے ہی دن عوام میدان میں جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے پہلی بار عوام کے شانوں میں دھنسے ہوئے سر اور جھکی ہوئی کمریں دیکھیں۔ اس نے متحیر ہو کر ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا "بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے؟" عوام نے یک آواز ہو کر جملہ دہرایا "ہم نہیں کھینچ سکتے۔"

بادشاہ نے ان میں سے کچھ لوگوں کو پاس بلا کر دریافت کیا "صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟ تم لوگ کیا نہیں کھینچ سکتے؟" انھوں نے جواب دیا "عالم پناہ! ہم خود یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے پیروں میں بھاری زنجیریں ڈال دی گئی ہیں، جن کے بار سے ہم چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ یہ پُراسرار زنجیریں روز بروز وزنی ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو کچھ ہی عرصے بعد یہ پورا ملک معذور ہو کر رہ جائے گا۔"

بادشاہ مسکرا کر بولا "اچھا تو اب سمجھا، یہ لوگ کیا نہیں کھینچ سکتے، لیکن تم لوگ ایک دوسرا نعرہ بھی تو لگاتے رہتے ہو۔ وہ کیا چیز ہے جو تم لوگوں سے اٹھائی نہیں جاتی؟"

"شاہ سلامت! ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے سروں پر ایک پُراسرار بوجھ لاد دیا گیا ہے۔"

یہ سن کر بادشاہ نے کہا "میرے ہم وطنو! قطعاً فکر نہ کرو۔ ہم آج ہی ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کر رہے ہیں جو اس بات کی تحقیقات کرے گی کہ تمہارے پیروں کی زنجیریں اور سروں کا یہ پُراسرار بوجھ کیا ہے؟"

عوام کے چہروں پر رونق آ گئی۔ سبھی لوگ خوشی خوشی ہنستے ہنستے اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ گئے۔ ادھر بادشاہ نے فوراً ملک کے ماہرین کو جمع کیا اور ان سے کہا "ہمارے عوام سخت مشکل میں ہیں۔ آپ کو بھی اس کا احساس ہوگا۔ ایسے ہی غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم نے آپ کا تقرر کیا ہے۔ آپ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ کون سا پُراسرار بوجھ ہے جسے اٹھانے سے ہمارے عوام تنگ آ چکے ہیں۔ اس بار کو ہلکا کرنے کا کوئی حل پیش نہ کیا جائے تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں۔ آخر تمھارا اور ہمارا وظیفہ تو ہمارے اقتدار کا تحفظ کرنا ہے۔"

ماہرین نے جواب دیا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر، ہماری بس ایک التجا ہے اور وہ یہ کہ آپ ہمیں چالیس دن کی مہلت دیں۔ ان چالیس دنوں میں ہمیں چالیس بورے کشمش اور بادام کھلائے جائیں تاکہ ہمارے دماغ روشن ہو جائیں۔ ہم اکتالیسویں دن آپ کی حسبِ خواہش عوام کے بوجھ کی نوعیت اور اسے کم کرنے کا مناسب حل پیش کر دیں گے۔"

اس خیال سے کہ ماہرین اپنا قیمتی وقت فضول باتوں میں ضائع نہ کریں، بادشاہ نے انھیں محل کے ایک بہت بڑے کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگوا دیا۔ ہر روز کشمش اور بادام کی ایک بوری کمرے میں دھکیل کر کمرے میں دوبارہ تالا لگا دیا جاتا۔

ماہرین کشمش اور بادام کھا کر بند کمرے میں ہنسی خوشی اپنا وقت گزار رہے تھے۔ ادھر عوام کی چیخ پکار دوبارہ بادشاہ کے کانوں تک پہنچنے لگی۔ وہ بے چین ہو کر کمرے کی دیوار کے چھوٹے سے سوراخ سے اندر جھانکتا تو سب ماہرین کشمش اور بادام اڑانے میں مست نظر آتے۔ اس سے فرصت پا کر وہ قلابازیاں لگاتے اور طرح طرح کے کھیل کھیلتے۔

آخر اکتالیسویں دن بادشاہ نے ماہرین کو کمرے سے باہر نکالا۔ ان میں سے ایک نے بادشاہ سے کہا "جہاں پناہ، ہم نے چالیس دن اور چالیس رات کی سخت محنت اور غور و خوض کے بعد عوام کی تکلیفوں کی نوعیت کا پتہ لگایا ہے

ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ عوام کو جو دُہرا اسرار بوجھ پریشان کر رہا ہے وہ دراصل ان کے اپنے سایہ کا بوجھ ہے، عوام کا سایہ کسی بھی حالت میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہر وقت ان کے پیروں سے لپٹا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ آسانی سے قدم نہیں اُٹھا سکتے۔"

بادشاہ ماہرین کی اس رائے سے بہت خوش ہوا اور ان کی دانشمندی کی بڑی تعریف کی۔ پھر حکم دیا "ماہرین کی اس رائے سے فوراً عوام کو باخبر کر دیا جائے اور انھیں مشورہ دیا جائے کہ اگر وہ اس پُر اسرار بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے سایہ سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ سوچیں۔"

شاہی فرمان فوراً عوام کو سنا دیا گیا۔ عوام کے چہروں پر ایک بار پھر رونق دوڑ گئی۔ اسی دن سے ملک میں انسان اور اس کے سایہ کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو گئی۔ عوام اپنے سایہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے تیز تیز دوڑنے لگے

آخر تھک ہار کر زمین پر گر پڑے اُٹھتے تو سایہ بدستور پیروں سے لپٹا نظر آتا۔ لاکھ کوشش کے باوجود کوئی شخص اپنے سایہ سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ عوام نے گاڑیوں پر سوار ہو کر اپنے سایہ سے دور بہت دور بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن جہاں بھی رکتے سایہ ان کے ساتھ ہوتا۔ صبح سو کر اُٹھتے تو سایہ مغرب کی طرف ہوتا، اسی لیے لوگ مشرق کی طرف بھاگنا شروع کر دیتے دوپہر تک مشرق کی طرف بھاگتے رہتے، دوپہر کے بعد سایہ ان سے آگے نکل جاتا تو وہ اسے پیچھے چھوڑ کر مغرب کا رخ کرتے۔

پاگلوں کی طرح مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف بھاگنے والے اس ملک میں کچھ لیڈر پیدا ہوئے وہ ہر روز صبح عوام سے کہتے ہماری نجات مغرب میں ہے، آؤ سب مل کر مغرب کی طرف بھاگیں۔

کافی عرصے تک نجات کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے باوجود جب عوام کے مسائل حل نہ ہوئے تو لیڈروں کا ایک تیسرا طبقہ میدان میں آیا۔ اس نے عوام کو ایک نیا مشورہ دیا۔

"ساتھیو، جو لوگ تمھیں مشرق یا مغرب کی راہ دکھاتے ہیں وہ غدار ہیں تمھاری نجات مشرق اور مغرب کے عین درمیان میں ہے۔ لوگ اب مشورہ پر عمل کرنے لگے۔ دوپہر کے قریب جب ان کا سایہ چھوٹا ہوتے ہوتے ختم ہونے کو آتا تو وہ خوشی سے چیخ پڑتے "واہ! اب ان منحوس سایوں سے چھٹکارا ملا!"

لیکن ان بیچاروں کی خوشیاں عارضی ثابت ہوتیں۔ دوپہر گزرتے ہی سایہ پھر لمبا ہونا شروع ہو جاتا۔ اب لوگ پہلے کی طرح ہی پھر دوڑ لگانے لگتے۔ کسی کو بھی اپنے سایہ سے چھٹکارا نہ ملا تینوں سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کی آپس میں مارپیٹ تک کی نوبت آ گئی۔ عوام نے بیزار ہو کر نئے سرے سے چیخ پکار شروع کر دی۔

یہ آوازیں جب بادشاہ کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے ان کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا کہ یہ رعایا کی آوازیں ہیں، جنہیں اپنے سائے سے نجات نہیں مل سکی۔ بادشاہ نے اپنے چالیس ماہرین کو پھر جمع کیا اور ان سے اس مصیبت کا حل کرنے کے لیے کہا۔ ماہرین نے پھر وہی شرط رکھی اور چالیس دن کی مہلت طلب کی۔ اکتالیسویں دن جب باہر نکالا گیا تو ان میں سے ایک نے کہا بادشاہ سلامت! آپ کو معلوم ہی ہے کہ رات ہوتے ہی پرچھائیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے ہماری ناچیز رائے میں عوام کو ان کے سایہ سے نجات دلانے کے لیے رات کی تاریکی کا بندوبست کرنا ضروری ہے"۔

لیکن دن کی روشنی میں رات کا اندھیرا کیسے پیدا کرو گے؟"

"ہم دن کی روشنی کو رات کے اندھیرے میں رنگ دیں گے۔ اس کے لیے آپ ایک کام کیجیے۔ ایک ایسی کوٹھری بنوا دیجیے جس میں سورج کی کرن داخل نہ ہو سکے۔ پھر جو بھی فریاد کرے، آپ کے سکون میں خلل انداز ہو اسے اُٹھا کر اس کوٹھری میں ڈال دیا جائے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے سایہ سے نجات مل جائے گی اور وہ چیخ پکار بند

کو دے گا

بادشاہ نے ماہرین کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ایک کوٹھری بنوائی جس میں سوئی کے ناکے کے برابر بھی سوراخ نہ چھوڑا۔ جو شخص چیخ و پکار کرتا ہوا، سنائی دیتا اسے پکڑ کر کوٹھری میں ڈال دیا جاتا۔ ان لوگوں کی چیخ پکار کو در کنار آواز نکلنا تک بند ہو جاتی۔ اس طرح کوٹھری کے اندر والوں کو تو نجات مل جاتی لیکن جو لوگ باہر تھے وہ صبح ہوتے ہی کراہنا شروع کر دیتے

آخر کتنے لوگوں کو کوٹھری میں ٹھونسا جا سکتا تھا! کچھ ہی عرصہ میں کوٹھری کھچا کھچ بھر گئی۔ بادشاہ کے حکم سے اسے بڑا کر دیا گیا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کوٹھری میں پھر جگہ نہ رہی۔ بادشاہ نے دوبارہ اسے بڑا کرا دیا یہی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ پورا ملک ایک وسیع و عریض کوٹھری میں تبدیل ہو گیا۔

سورج کی روشنی اب صرف گنی چنی جگہوں پر پہونچتی تھی، جہاں خود بادشاہ، ملازم اور درباریوں کے علاوہ کوٹھری میں ٹھونسے جانے والے لاکھوں انسانوں کی پرچھائیاں رہ جاتیں یہ پرچھائیاں راتوں کو کبھی نظر نہیں آتیں لیکن سویرا ہوتے ہی زمین پر رینگنے لگتیں۔ برسوں انسان کے سایہ کا کردار ادا کرتے کرتے اب یہ پرچھائیاں بھی انسانوں کی طرح نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن ان میں انسانوں کی طرح نظر آنے لگی تھیں۔

لیکن ان میں ... انسانوں کی طرح ... پیدا ...

کھڑے ہونے کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ گنے چنے لوگ بھی اب تک کوٹھری کے باہر تھے لیکن انھوں نے خوف کی وجہ سے وجہ سے اپنی زبانوں پر تالے لگا رکھے تھے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ اب ہم نہیں کھینچ سکتے۔ یا "اب ہم نہیں اٹھا سکتے"

کئی موقعوں پر تو بے چارے بغیر پوچھے ہی اکثر یہ کہتے ہوئے سنے گئے "اب ہم عادی ہو گئے ہیں۔ اب تو ہم کھینچ بھی سکتے ہیں اٹھا بھی سکتے ہیں"

اس کے بعد اس ملک میں عوام کی چیخ و پکار بادشاہ کے کانوں تک نہ پہونچی اور نہ کبھی اس کی نیند میں خلل پڑا۔

نچا ہوا گلاب (صفحہ ۳۱ سے آگے)

رہے گا اب تمھاری گود ہمیشہ خالی رہے گی۔ تمھاری چھاتیاں دودھ سے کبھی نہیں چھلکیں گی تمھارے ہونٹ لوریاں نہ گائیں گے۔ اس گھر میں کسی بچے کی رونے کی آوازیں نہیں گونجیں گی میں نے تمھاری تمناؤں کا خون کر دیا۔ میں خونی ہوں میں .. میں نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

آشی رونے روتے ہنس پڑی دیر تک ہنستی رہی پھر سسک سسک کر رونے لگی کپڑوں کو چھوڑ کر انھیں سینے سے لگا کر انھیں چوم چوم کر......

اور دوسرے دن اخبار میں ایک حادثہ کی خبر شائع ہوئی تھی۔





آخری صفحہ

فری سائز مقالے

"ابے او ننھے!"
"جی حضور!"
"ذرا پِّے لانا"
"یہ لیجیے ... سرکار، کیا پھر کوئی سیمنار ؟"
"ہاں ... دیا نرائن نگم پر ہے!"
"مگر سرکار پِّے حسرت موہانی پر ہے!"
"ابے تو رہے گا بونگے کا بونگا ... حسرت موہانی صحافی تھے ؟"
"جی تھے!"
"نگم بھی صحافی تھے ؟ — ابے بول — تھے کہ نہیں ؟"
"جی — وہ بھی صحافی تھے!"
"حسرت اردوئے معلی، اور مستقل نکالتے تھے ؟"
"جی نکالتے تھے!"
"ابے اب بھی نہیں سمجھا!"
"جی بالکل سمجھ گیا مضمون میں جہاں جہاں حسرت کا نام آیا ہے اس کی جگہ دیا نارائن نگم لکھنا ہے، اور جہاں اردوئے معلی یا مستقل، کا نام آیا ہے اس کی جگہ کہیں، زمانہ، اور کہیں، آزاد، لکھنا ہے۔ لیکن سرکار چار دن بعد مولانا محمد علی جوہر پر بھی تو سیمنار ہونے والا ہے، اس دن کیا پڑھیے گا ؟"
"بُدھو کہیں کا — ساری رامائن سن لی" پھر پوچھتا ہے رام کون تھے!! اس مضمون میں نگم کی جگہ جوہر اور زمانہ اور آزاد کی جگہ، ہمدرد، اور کامریڈ، کا نام داخل ہو جائے گا
— اور ہاں — آئندہ بُدھ کو نیچے بندوں کے مسائل پر ایک سیمنار ہے، اس میں بھی پِّے چلے گا"
"سرکار، اس مضمون کا نیچے بندی سے کیا تعلق ہے ؟"
"ابے دتی یو میرا مقالہ کا سائز ہے!!"

معلم اردو
لکھنؤ

JULY
1983

اس شمارہ میں



جنرلسٹس پبلی کیشنز کے زیر اہتمام منعقدہ استقبالیہ جلسہ
صدر جلسہ پروفیسر سید نسیم الحسن نوہروی
صدارتی تقریر فرماتے ہوئے
ڈائس پر تشریف فرما ہیں (دائیں سے بائیں)
جناب اظہار احمد ایڈیٹر معلم اردو جناب انتظار حسین
جناب شبیہ الحسن صدر جلسہ، جناب ڈاکٹر جمیل جالبی ۔
جناب افضال احمد انصاری اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرلسٹس پبلی کیشنز



سامعین کا ایک منظر

پہلی صف میں دائیں سے بائیں
بیگم ... جناب ڈاکٹر سید مسعود
... سادات الزمن عمر
بیگم حامدہ حبیب اللہ
... شاہین اظہار

معیار اردو

لکھنؤ

ماہنامہ

ایڈیٹر
اظہار احمد

منیجنگ ایڈیٹر
افضال احمد انصاری

تاریخ اشاعت ۹
جولائی ۱۹۸۳ء
جلد : (۲)
شمارہ (۸)

قیمت

سالانہ : ـــــ پندرہ روپے
فی پرچہ : ـــــ ڈیڑھ روپے

جنرلسٹس پبلی کیشنز ۱۹/۵۰۰، راما دھین سنگھ روڈ ـ لکھنؤ ۷

اظہار احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و مالک نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپواکر ۵/۱۹ راما دھین سنگھ روڈ لکھنؤ سے جاری کیا

اس شمارہ میں

اداریہ :

مضامین :

رپورٹ :

سفرنامہ :

افسانہ :

منظومات :

تصاویر :- ٹائیٹل کی پشت پر

دائیں سے بائیں : پہلی صف۔ (۱) جناب اظہار احمد ایڈیٹر معلم اُردو، مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے (۲) محترمہ شاہین اظہار ایڈیٹر کھوج خبر بیگم جمیل جالبی کی گل پوشی کرتے ہوئے۔ دوسری صف : (۱) بیگم انتظار حسین (۲) برہم دت بڈیا لنکار نامہ نگار خصوصی نو بھارت ٹائمس۔ جناب اظہار احمد ایڈیٹر معلم اُردو، جناب سنیل شاستری وزیر محنت و روزگار حکومت اُتر پردیش۔ جناب انتظار حسین مہمان خصوصی۔ جناب اقبال احمد، منیجنگ ایڈیٹر جرنلسٹس پبلی کیشنز۔

تیسری صف : (۱) جناب جمیل جالبی کو کھوج خبر کا شمارہ پیش کرتے ہوئے جناب اظہار احمد و جناب سنیل شاستری انتظار حسین اور بیگم انتظار حسین کھانے کی میز پر۔

دو باتیں

معلم اردو " کا یہ شمارہ انتظار حسین، جمیل جالبی، افتخار عارف، احمد فراز اور رضا علی عابدی (بی۔بی۔سی کے ممتاز اناؤنسر) کی لکھنؤ آمد کے سلسلے میں اظہار تشکر کا ایک حقیر اظہار ہے۔

پاکستان اور لندن میں رہنے والے یہ سبھی مصنفین اور شعراء ایک ایسی زبان سے جڑے ہوئے ہیں جبکی سرکاری حیثیت سرحد کے اس پار کچھ ہے تو سرحد کے اس پار کچھ اور ہے سرحد کے اُس پار یہ زبان سرکاری حیثیت اختیار کرنے کے باوجود علاقائی زبانوں سے ابھی تک ہم آہنگ نہیں ہوسکی ہے، وجہ صرف یہ ہے کہ اس بدنصیب زبان کو جس ملک کی سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے، وہاں کی علاقائی زبانیں اس زبان کو ابتک اجنبی اور غیر ہی سمجھتی ہیں، پھر بھی سرکاری سرپرستی کیوجہ سے اس زبان کو بظاہر بہت فروغ مل رہا ہے۔ اس ملک میں شائع ہونے والے فوٹو آفسیٹ اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے شاندار اڈیشنوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوئے بنا نہیں رہتا کہ یہ زبان کافی ترقی کر رہی ہے۔

اس کے بعد جب ہم سرحد کے اس پار اس زبان کی سرکاری حیثیت پر نظر ڈالتے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اتنے بڑے ملک میں اسی زبان کو سرکاری سرپرستی محض ایک ایسے علاقے میں حاصل ہے۔ جہاں کی علاقائی زبان کوئی دوسری ہی ہے۔ ملک کے بقیہ علاقوں میں اگرچہ اس زبان کو بخوبی سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ تمام علاقوں میں عوام کے رابطے کی زبان یہی ہے۔ عام لوگ اظہار خیال اسی زبان

میں کرتے ہیں مگر کسی بھی علاقہ میں اسے سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے
اگر کسی ریاست نے اِسے سرکاری حیثیت سے تسلیم کرنے کا ارادہ
ظاہر کیا بھی تو ایسا شدید ردِعمل ہوا کہ اس سربراہِ ریاست کو عاجز آکر
اپنی کرسی ہی سے دست بردار ہونا پڑا۔

اس کے برعکس جب ہم برصغیر کے باہر اس زبان کی کرشمہ سازی پر
غور کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ امریکہ اور کناڈا وغیرہ
بڑے بڑے ملکوں میں اس کی ترقی کی راہیں تیزی سے کھل رہی ہیں۔
مگر جس ملک نے اس غیر ملکی زبان کو سب سے زیادہ گلے لگایا وہ برطانیہ
ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ لندن کو اُردو کا نیا گہوارہ قرار دیا جا رہا ہے
جہاں افتخار عارف کی کوششوں سے "تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام
پیکاڈلی کے شاندار علاقے میں "اُردو مرکز" قائم ہوا ہے۔ دراصل اس
"اردو مرکز" کو "بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل" (B.C.C.I) کی
سرپرستی حاصل ہے۔ لندن میں اُردو کے شعراء ادباء بڑی تعداد میں رہ رہے
ہیں اور بی بی سی کے صدر دفتر بش ہاؤس جہاں رضا علی عابدی اپنے رفیقوں
کے ساتھ نستعلیق اُردو میں بی بی سی کی اُردو سروس کے لیے بہترین پروگرام
پیش کرتے ہیں، کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ "اُردو مرکز" لندن کے
زیر اہتمام بڑی بڑی ادبی تقریبات کا انعقاد تو عمل میں آتا ہی ہے،
ساتھ ہی ساتھ علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اس تضاد پر غور کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اردو کا رابطہ
جب تک عوام سے براہ راست قائم ہے اُسے انتہائی کوششوں کے
باوجود مٹانا تو مشکل ہے مگر اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھ کر ملال بھی
ہوتا ہے کہ سرحد کے اِس پار اُردو کا دانشور طبقہ اس قدر شدت
کے ساتھ مطلب پرستی، خودغرضی اور چاپلوسی کے ہنر میں یکتا ہوا جا رہا
ہے کہ اس سے زبان و ادب کے لیے کسی بھی بہتری کی توقع قائم کرنا محض
فضول ہے۔ مختلف ریاستوں نے اپنی اپنی ریاستوں میں اردو کی ترقی
کے لیے جب اُردو اکادمیاں قائم کی تھیں تب یہ توقع بنی تھی کہ
ان اکادمیوں کے ذریعے اُردو زبان کی بہتری کی کوئی صورت نکلے گی
مگر دس برس کے اندر ہی اندر ان اکادمیوں پر پروفیسران غرض مند اور

دانش وران بے ہنر اس طرح سے قابض ہو گئے کہ اب یہ اکادمیاں اُن پروفیسروں اور دانشوروں کی خودغرضیوں، رسہ کشیوں مجادلہ آرائیوں اور مقابلہ بازیوں کے اکھاڑے بن کر رہ گئیں ہیں۔ بعض نامور اکادمیوں نے کتابوں کی اشاعت کا شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے۔ مگر ان کے پاس اس سوال کا کوئی بھی جواب نہیں ہے کہ آئندہ دس برسوں میں ان کتابوں کے پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے جب اُردو رسم الخط سے واقفیت رکھنے والے پورے ہندوستان بھر میں اُنگلیوں پر گنے جانے لگیں گے؟

ان حالات میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین ادبی اور ثقافتی رابطوں کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہونے لگی ہے کہ رابطے کا ٹوٹا ہوا پُل پھر سے جوڑا جائے اور دونوں طرف کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک دوسرے سے ملنے اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کا موقع ملے۔ "معلم اُردو" کے انھیں صفحات پر ہم پاکستان کے ممتاز شاعر اور اخبارنویس جناب رئیس امروہوی کا مضمون "ہندوستان میں چند روز" اس توقع کے ساتھ شائع کر رہے ہیں کہ اُنھوں نے ثقافتی رابطوں کی بحالی کی جو تجاویز رکھی ہیں ان سے ہندوستان کے سبھی ادیب اور دانشور اتفاق کریں گے کہ وہ سفر ہندوپاک کو سیاحت کا درجہ دے کر آزادانہ ثقافتی اور ادبی رابطوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں۔

اظہار احمد

مزید آبپاشی صلاحیت تیار کرنے کی کوششوں میں کامیابی

اُتر پردیش میں کسانوں کے لیے موجودہ آبپاشی کی سہولیات میں لگاتار اضافہ کیا جا رہا ہے۔ مندرجہ ذیل حقائق اس کے ثبوت ہیں۔

- ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۳ ہزار ہیکٹر رقبہ میں فاضل آبپاشی کی سہولیات کا نشانہ تھا اور اس کیلئے ۲۱۰ کروڑ روپیہ خرچ کرنیکا انتظام کیا گیا تھا جبکہ مقررہ نشانہ سے زیادہ یعنی ۳۰،۷ ہزار ہیکٹر رقبہ میں مزید آبپاشی کی سہولیات فراہم کی گئیں۔
- سرکاری چھوٹی سینچائی اسکیموں کے تحت ۸۰-۱۹۷۹ء تک ریاست میں ۱۶۶۲۲ ٹیوب ویل کام کر رہے تھے۔ چھٹے منصوبے کے پہلے دو سال کی مدت میں ہی ۲۹۸۲ کے سرکاری ٹیوب ویل لگا دیے گئے۔
- مالی سال رواں ۸۴-۱۹۸۳ء میں بڑی اور چھوٹی آبپاشی اسکیموں کے لیے ۱۹۲/۹۲ کروڑ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس مدت میں عالمی بنک کی مدد سے دوسرے مرحلہ میں ۲۲۰۰ کے سرکاری ٹیوب ویل لگانے کی تجویز ہے۔
- ہر سال زیر تعمیر ٹیوب ویلوں کا پندرہ فیصد شیڈیولڈ کاسٹ اور شیڈیولڈ ٹرائبس والے علاقوں میں لگانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔
- ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۳۰ ہزار ہیکٹر مزید علاقہ کو سیلاب سے تحفظ فراہم کیا گیا۔ سال رواں میں بھی اتنے ہی علاقے کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھا جائے گا۔
- ریاستی حکومت ہر کھیت کو پانی کا نشانہ حاصل کرنے کے لیے برسرپیکار ہے۔
- اس طرح ۸۰-۱۹۷۹ء سے تین سال کی مدت میں سرکاری ذرائع سے ۱۱۶۱ ہزار ہیکٹر فاضل رقبہ میں آبپاشی کی سہولیات فراہم کی گئیں۔

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ حکومت اُتر پردیش کی جانب سے جاری کیا

ہندوستان میں چند روز



فارسی زبان کی مشہور کہاوت ہے کہ "فیل مارا ہندوستان یاد آید" یعنی ہمارے ہاتھی کو ہندوستان کی یاد آئی! چنانچہ ایک دن اس جانب کے ہاتھی کو بھی چھتیس سال قبل کا ہندوستان یاد آنے لگا۔

بہت دنوں سے قدم کبھی جدھر نہ اُٹھے تھے
بہت دنوں میں ادھر کا خیال کیوں آیا

ستر کروڑ کی آبادی اور لاکھوں مربع میل کا رقبہ رکھنے والے ملک میں چند ہفتے گذارنا زندگی کا یادگار تجربہ تھا۔ ان چند ہفتوں ہی میں میں نے ہزار میل کا سفر کیا۔ سیر و سفر کے جتنے وسائل ممکن تھے۔ ہاتھی سے لیکر ہوائی جہاز اور بیل گاڑی سے لیکر انسانی گاڑی و سائیکل رکشا تک ان سب کا تجربہ ہوا اس تھکا دینے والے سفر کے دوران زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد سے بالمشافہ گفتگو کا موقع ملا۔ کسان مزدور پڑھئی والا، خونچہ فروش، مٹھائیاں بیچنے والا ہوٹل کا بیرا، ریل کا ہمسفر قلی، اخبار فروش کتب فروش اخباری رپورٹر، ایڈیٹر، شاعر ادیب، مصنف، محقق ممبران پارلیمنٹ، وزرا فلم ساز، فلمی اداکار، غرض بھانت بھانت کی بولیاں سُنیں۔ طرح طرح کے لہجے کان میں پڑے نئے نئے مسئلے چھڑے سب سے پہلے تو اس امر کا براہ راست تجربہ اور مشاہدہ ہوا کہ جنوبی ہند سے لیکر شمالی ہند تک واحد عوامی زبان وہی اُردو ہے۔ جسے ہندوستان کا ایک محدود طبقہ بدیسی زبان قرار دیتا ہے۔ ہندوستان بھر میں اردو کا رواج ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اردو رسم الخط ہی بقا کے لیے زبردست کوشش کر رہا ہے دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے پچھلے ۳۵ برس میں ہندوستان کی آبادی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا تجربہ قدم قدم پر ہوسکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء تک دہلی میں کوئی بھیڑ بھاڑ نہ تھی لیکن اب اس شہر کی تنگ گلیوں میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ دلی شہر آدمیوں کا صحرائے اعظم ہے۔

چراغ دلی سے بہ عافیت گزر جانا پل صراط کو عبور کرنے سے کم نہیں۔ ایشیائی کھیلوں (ایشیاڈ) کے سبب اس زمانے میں دلی دلہن بنی ہوئی تھی پچھلے چھتیس سال میں اس شہر کے ہر طرف جو پر پرزے نکلے ہیں۔ اور دہلی سے غازی آباد تک جتنے نئے شہر وجود میں آگئے ہیں۔ ان کا شمار آسان نہیں۔ میں نے دیہات میں بھی خود سینکڑوں میل سفر کیا ہے بہت سے دیہات بجلی کی روشنی سے جگمگانے لگے ہیں۔ دیہات میں بہت سی گھریلو صنعتیں وجود میں آگئی ہیں چھوٹے بڑے پیمانے پر بہت سے کارخانے قائم ہو گئے ہیں۔ اور قائم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر صنعتی ترقی کا یہی عالم رہا تو کچھ عرصہ بعد ہندوستان کا تاروں بھرا چمکدار نیلا آسمان کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں سے تیرہ و تار ہو جائے گا۔ جنوبی ایشیا میں ہندوستان کی طرح کہاوت کی حیثیت رکھتی ہے۔

بے شک ہندوستان غریب ملک ہے لیکن نیم فاقہ کشی نے ہندوستانیوں کے جسموں کو ضرور کمزور کر دیا ہے۔ ان کی روحوں کو مضمحل نہیں کیا وہ آدھے پیٹ کھا کر بھی اعتماد و اطمینان کے ساتھ زندہ ہیں۔ ان کی مثالیں کم ملیں گی۔ صبر و سادگی اور سادہ مزاجی عام ہندوستانیوں کا شعار ہے۔ اور ان کے یہی اوصاف ہیں جنہوں نے انہیں بدترین حالات میں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔

غلط فہمیاں :

میں نے دیکھا میں نے سنا کہ عام ہندوستانیوں کی پاکستان کے بارے میں یہ عام رائے ہے کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی نیت کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس میں غلط فہمی اور بدگمانی کے اسباب نفسیاتی بھی ہیں تاریخی بھی سیاسی بھی۔ افسوس ہے کہ اس سلسلے میں ہندوستانی اخبارات کا رویہ کسی طرح بہتر نہیں اور انہیں جس طرح پاکستانی اخبارات کے آئینے میں ہندوستان کا چہرہ مسخ نظر آتا ہے اور اس کی ہمہ گیر اور ہمہ رنگ صنعتی اور معاشی ترقی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ اسی طرح آپ ہندوستانی اخبارات پڑھ کر صرف اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پاکستان میں جنگی جنون، مذہبی منافرت، اسلحہ بندی اور ہندوستان دشمنی کے علاوہ امن پسندی، صلح جوئی اور مصالحت طلبی کی کوئی خواہش موجود نہیں۔ ستر کروڑ ہندوستانیوں میں مشکل سے سو ہزار افراد ایسے ہوں گے جو پاکستان کے سیاسی سماجی اور ثقافتی موقف سے واقف ہوں۔ بالعموم پاکستان سے جو شاعر اور ادیب ہندوستان جاتے ہیں وہ مشاعروں اور ادبی اداروں میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں ان میں ان کا قصور بھی نہیں کیونکہ ان کے میزبانوں کی خواہش اور اصرار یہی ہوتا ہے۔ ہندوستان لاکھوں دیہاتوں اور ہزاروں شہروں کا ملک ہے۔ صرف شعری و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کر کے اس خوبصورت عظیم اور حیرت پیدا کرنے والے دیس کو سمجھنا ممکن نہیں۔ ہندوستان میں بے شمار نسلیں آباد ہیں ان گنت بولیاں بولی جاتی ہیں دراوڑین کلچر سے انڈو ایرانی اور انڈو ایرانی سے اینگلو انڈین (بلکہ انڈو اینگلو امریکن) کلچر تک۔ ہر قسم کا تہذیبی نمونہ اور سماجی سانچہ پایا جاتا ہے۔ یہ موسموں، نسلوں، عقیدوں، نظریوں، رویوں، قوموں اور تہذیبوں کا ایک زخار زندہ سمندر ہے جو ہمالہ سے راس کماری تک موجیں مار رہا ہے۔ اس سمندر کی پیمائش بیک نظر ممکن نہیں۔ ہندوستان کی ایک اپنی تمدنی روح ہے جو نہ صرف فنون لطیفہ بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں اپنا اظہار چاہتی ہے۔ میں نے اس روح کو سرسبز کھیتوں، گھنے جنگلوں،

بے شک ہندوستان غریب ملک ہے لیکن نیم فاقہ کشی نے ہندوستانیوں کے جسموں کو ضرور کمزور کر دیا ہے ان کی روحوں کو مضمحل نہیں کیا۔ وہ آدھے پیٹ کھا کر بھی اعتماد و اطمینان کے ساتھ زندہ ہیں۔ ان کی مثالیں کم ملیں گی

بہتے دریاؤں، ہند جو ہڑوں، کائی سے ڈھکی ہوئی جھیلوں اور ہندوستان کے لقودق ریگ زاروں میں حلوہ گر دیکھا اس کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس تمدنی روح کے ماتھے پہ انڈین ایرین کلچر و مشترکہ ہندو مسلم تہذیب کا سنہری کامکٹ جگمگا رہا ہے۔

ہندوستانی مسلمان :

۱۹۴۷ء سے پہلے بہت سے زلزلے آئے تھے اور ۱۹۴۷ء کے بعد بھی اتھل پتھل، شکست وریخت اور کشاکش وکشمکش کا سلسلہ جاری رہا۔ تقسیم کی آندھیوں میں دونوں ملکوں کے اندر جو پودے اپنی جگہ سے اکھڑ گئے تھے وہ دوسری زمینوں پر جاکر جم گئے اور جڑ پکڑ لی۔ لیکن بہت سے لوگ زبردست ہلچل کے باوجود اپنی جگہ قائم رہے اور پھل پھول رہے ہیں — ہندوستانی مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں اتنا ہی بااعتماد اور حوصلہ مند اور اتنا ہی قوی عزم رکھتا ہے۔ جتنا مضبوط حوصلہ دوسرے ہندوستانیوں کا ہے۔ ہندوستان میں فسادات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن بنائے فساد مذہب نہیں ہوتا۔ بلکہ سیاسی نعرے اور اقتصادی مفادات ہوتے ہیں، عام ہندو، عام مسلمان، عام سکھ اور عام عیسائی کو فرقہ وارانہ اختلاف سے کوئی دلچسپی نہیں —

۲۸ اکتوبر کو ہندوستان بھر میں عاشورہ محرم اور دسہرہ ایک ساتھ منایا گیا لیکن کہیں بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۵ نومبر کی رات میں پورا ہندوستان دیوالی کے قمقموں سے بقعۂ نور بن گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ روشنیوں کے ایک تابناک، خوش رنگ اور خوبصورت سمندر میں ہندو بھی نہا رہے ہیں مسلمان بھی جس طرح بے چارے بھولے بھالے ہندوستانیوں کو یہ معلوم نہیں کہ پچھلے چھتیس سال میں پاکستانی قوم نے صنعت تجارت، بینکنگ، انشورنس، بزنس، ایڈمنسٹریشن بھاری انڈسٹری، سماجی منصوبہ بندی اور اجتماعی بحالی و آبادکاری کے میدان میں کیسی حیران کن ترقی کی ہے۔ اسی طرح عام پاکستانیوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی سست رفتار مگر ہمہ گیر پیہم رفعت کا اندازہ ہے وہ اس جذبے اس یقین اور عزم بیکراں کے ولولے کو سمجھ سکتے ہیں جس کا اظہار یہاں کے مسلمانوں نے پچھلے سالوں میں کیا ہے عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان میں نظام مصطفےٰ کے نفاذ کا نعرہ سیاسی مطالبے کے طور پر کبھی بلند نہیں کیا گیا لیکن میں نے ہندوستانی مسلمانوں میں مذہب سے جو شغف مساجد سے جو والہانہ لگاؤ مجالس دینی سے جو بے پناہ تعلق اور اسلامی شعائر کی مکمل پابندی کا جو ولولہ اور شرعی وضع قطع قائم رکھنے کا جو جذبہ پایا اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ہم ہندوستان میں چنڈی گڑھ سے لیکر بنگلور اور بمبئی سے لیکر روہیل کھنڈ تک اس سوال کا تعاقب کرتے رہے کہ آخر وہ کون سی نفسیاتی رکاوٹ ہے جو عظیم تر ہندوستان اور معاہدہ عدم جنگ کی پیش کش کرنیوالے پاکستان کے تعلقات کے درمیان حائل ہے

چند ہزار سرپھروں کے علاوہ ہندوستان کا ایک فرد بھی پاکستان سے الجھنا نہیں چاہتا اور حکومت پاکستان تو اصرار کے ساتھ، تاکید کے ساتھ بتسلسل کے ساتھ نو وار پیکٹ (ہم لڑنا نہیں چاہتے) گلدستہ پیش کر رہی ہے۔ مجھ سے پاکستان کے ایک اعلا ترین نمائندے نے کہا کہ عجیب بات ہے ہندوستان کے عوام و خواص دونوں پاکستان سے گہرے سماجی، سفارتی، انتظامی اور معاشی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ آخری لمحے میں کوئی نحس ستارہ ان تعلقات کے محور میں داخل ہو کر شکوک یا شبہات اور خوف کے اندھیرے کو اور گہرا کر دیتا ہے اور بجنسہٖ یہی بات مسز اندرا گاندھی کی مجلس وزارت کے ایک اعلا ترین رکن نے کہی ہے۔ کیسا عجیب توارد و اتفاق ہے یہ!

چنڈی گڑھ بہت خوبصورت اور دلآویز شہر ہے چنڈی گڑھ کو دیکھ کر اسلام آباد کی یاد تازہ ہو گئی۔ وسعت کو دیکھ کر گھر یاد آیا۔ چنڈی گڑھ کا عظیم الشان ٹیگور تھیٹر خوش ذوق سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ وہ پاکستانی مہمانوں کو دیکھنے کے اس قدر مشتاق تھے گویا ہم لوگ مریخ سے نازل ہوئے ہیں اس عظیم الشان اجتماع میں غزل خوانی کے علاوہ تقریریں بھی ہوئیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے حاضرین سے ان کے دین دھرم کی قسم دلاکر پوچھا کہ جو لوگ پاکستان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں وہ ہاتھ اٹھائیں اس سوال کو تین مرتبہ اصرار کے ساتھ دہرایا

گویا کہ جو لوگ پاکستان سے دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں وہ ہاتھ اٹھا دیں۔ یکایک ہزاروں ہاتھ عالم شوق میں بلند ہو گئے اور ٹیگور تھیٹر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ فرید کوٹ کے اجتماع میں بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ مشرقی پنجاب کے وزیر تعلیم نے اس یادگار موقع پر نہایت خوبصورت مرصع اور ادبی نقطہ نظر سے معیاری تقریر کی۔ پاک ہند پریم سبھا کے نائب صدر جناب بزم انصاری نے تفصیل کے ساتھ ہمارے مقاصد کی وضاحت کی۔ ہمارے مقاصد واضح ہیں ہم چار پانچ سال سے کوشش کر رہے ہیں کہ نہرو لیاقت پیکٹ اور عہد نامہ شملہ کی روشنی میں عوامی سطح پر دونوں خود مختار، آزاد اور خود کفیل ملکوں کے درمیان قریب ترین روابط قائم کیے جائیں۔ دونوں ملکوں کے اخبارات ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ پروپیگنڈہ (جس کا مرکزی مقصد نفرت و عداوت کے جذبات ابھارنا ہوں) بند کر دیں۔ یہ پابندی ختم کر دی جائے کہ ہندوستان سے پاکستان آنے والا صرف ایک شہر میں محدود مدت تک قیام کر سکتا ہے اور پاکستانی ہندوستان کے صرف تین شہروں میں جا سکتے ہیں یہ شرط کس قدر غلط اور احمقانہ ہے ہمارا مطالبہ ہے کہ بغیر کسی پابندی کے دونوں ملکوں کے سفارتخانے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ویزے جاری کریں اور یہ مجرمانہ قید ہے کہ وہ اور آپ پولیس تھانہ میں جا کر اپنی آمد اور روانگی کی رپورٹ لکھوائیں۔ اس مجرمانہ قید کو فوراً ختم کر دیا جائے۔ اب رہا مسافران ہند اور حاضرین پاکستان کیلئے نہ دیجئے ڈاک کا مسئلہ بھی ایک مشکل مسئلہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ سفر ہندوستان سفر پاکستان کو سیاحت کا درجہ دے دیا جائے۔ سیاحت جدید دور میں صنعت کی حیثیت رکھتی ہے اور بہت سے ملک اس صنعت (سیاحت) کے ذریعے لاکھوں ڈالر کما رہے ہیں۔ کیا صورت ہو کہ ہندوستان اور پاکستان کا سفر بھی زرخیز سیاحت میں تبدیل ہو جائے۔ دونوں طرف سے کتابوں کی آزادانہ تجارت، کلچرل ایکسچینج (فنکاروں کا تبادلہ) شرح ڈاک میں تخفیف اور دوسرے مطالبات پر زور دیا جا رہا ہے۔ آخر وہ وقت کب آئے گا کہ ان انسانی مطالبوں کو درخور اعتنا سمجھا جائے گا سب سے اہم تر مطالبہ یہ ہے کہ کھوکھرا پار کا راستہ کھولا جائے۔ عام آدمی کے لیے واہگہ اور اٹاری کے راستے سفر سخت تکلیف دہ تشویش انگیز اور طویل ہے۔ کھوکھرا پار کا قدیم راستہ بحال کر دیا جائے تو لاکھوں ہندوستانیوں اور لاکھوں پاکستانیوں کی ۹۰ فیصدی مشکلات سفر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ میں ہندوستان میں دس ہفتے تک گھومتا رہا۔

اخبارات کا رول:

ہندوستانی اخبارات میں پاکستان کی جو تصویر کشی کی جاتی ہے (جنگی جنون، مذہبی منافرت، بات بات پر تازیانوں سزا، امریکہ دوستی، سامراج پرستی، سرمایہ دارانہ مفادات کا تحفظ) وہ شاعرانہ بلکہ صحافیانہ مبالغہ آفرینی پر مشتمل ہوتی ہے میں نے بھی چند معروضات پیش کیں اور عرض کیا کہ نہ صرف ہندوستانی اخبارات و رسائل کے آئینے میں پاکستان کا چہرہ دھندلا نظر آتا ہے بلکہ ہزار افسوس یہ ہے کہ ہم پاکستانی صحافی بھی اہل ہندوستان اور اس کے عظیم الشان صنعتی، ترقیاتی، سماجی، فنی اور جمہوری کارناموں سے بے خبر ہیں اور اس لیے بے خبر ہیں کہ ہمیں ہندوستان کے بارے میں جو خبریں ملتی ہیں وہ صرف بڑودہ اور میرٹھ کے فسادات، پنجاب میں اکالیوں کی تحریک مزاحمت، آسام کی گڑبڑ، میزورم اور مغربی بنگال کے ہنگاموں پر مشتمل ہوتی ہیں بے شک یہ تمام نقائص ہندوستان میں پائی جاتی ہیں لیکن پورے چھ لاکھ دیہات، چونتیس ہزار قصبوں اور تین سو سے زیادہ خوبصورت شہروں کے ہندوستان میں اور بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ہندوستان کا رقبہ جغرافیائی میں ۳۳ ہزار کلومیٹر ہے تو ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ملک میں فسادات بھی ہوں گے، ہنگامے بھی ہوں گے، ڈاکے بھی پڑیں گے، چوریاں بھی ہوں گی، ہڑتالیں بھی ہوں گی، بجلی پانی اور اشیائے ضرورت کا قحط بھی پڑے گا یہ سب کچھ ہوگا اور ہونا چاہیے۔ کیوں کہ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ، تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہندوستان کے مقابل دس گنا زیادہ جرائم ہوتے ہیں۔ اسی تقریر میں اس خاکسار نے تجویز پیش کی کہ زیادہ سے زیادہ ہندوستانی صحافیوں کو پاکستان

کا دورہ کرایا جائے تاکہ وہ اپنے دل کی آنکھوں سے نہیں کھوپڑی کی آنکھوں سے دیکھیں کہ ۳۵ سال میں اس قوم نے جس کی حکومت کی ابتدا بوسیدہ خیموں میں ہوئی تھی کیا کارنامے دکھائے ہیں ہندوستان کے اخبارات پاکستان (جیسا کہ وہ ہے) کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ہم پاکستانی اخبارنویس غلیظ تر ہندوستان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں جیسا کہ انصاف کرنے کا حق ہے! بس آنکھیں بند کر کے ایک دوسرے کو گالیاں دیئے جا رہے ہیں۔

مشترکہ کلچر:

سوال یہ ہے کہ اس طویل پرازہنگامہ اور پرلطف سفر (لطف ضرور تھا مگر راحت مفقود تھی) ہم نے ہندوستانی دوستوں سے کیا سنا اور ہم نے ہندوستانی دوستوں سے کیا کہا؟ ہم نے سنا کہ دونوں ملکوں کا کلچر زبان، روایات اور تاریخی سرمایہ ایک ہے ہم نے کہا کہ یہ آدھی سچائی ہے۔ پوری سچائی یہ ہے کہ گو دونوں ملکوں کا کلچر میں یک گونہ مناسبت پائی جاتی ہے لیکن اگر کلچر، زبان، نسل، تاریخی ورثے اور تہذیبی روایات کا اشتراک اتنا ہی اہم اٹوٹ اور اٹل ہوتا تو ۱۹۴۷ء کی تقسیم عمل میں نہ آتی۔ یہ کہنا کہ آج سے ۳۵ سال قبل سیاست نے دونوں ملکوں کے درمیان علیحدگی کی جو دیوار کھڑی کر دی تھی اس کو ڈھا دینا چاہیئے پاکستان کے وجود کی نفی کرنا ہے ہم ہندوستان کے ساتھ ہر سطح پر بہترین تعلقات چاہتے ہیں لیکن اس کی یہ قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں کہ پاکستان کے نظریاتی تہذیبی اور قومی تشخص کو کسی نہ کسی انداز میں جھٹلانے کی کوشش کی جائے۔ کوئی خوددار خودمختار اور غیور قوم اس طرح اپنے اجتماعی وجود کی قربانی پیش کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ ہر باشعور ہندوستانی نے ہمارے نقطۂ نظر کو سراہا اور اعتراف کیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان ذہنی سمجھوتہ اسی طرح ہو سکتا ہے (ذہنی سمجھوتہ ہر عملی سمجھوتے کی بنیاد ہوا کرتا ہے) کہ وہ جو نفسیاتی بدگمانی کی فضا اس قسم کے بیانات سے پیدا ہو جاتی ہے اس کو نہ پیدا ہونے دیا جائے اور حقیقت کو حقیقت کی طرح قبول کر لیا جائے۔

●●

سچائی یہ ہے کہ گو دونوں ملکوں کے کلچر میں یک گونہ مناسبت پائی جاتی ہے لیکن اگر کلچر، زبان، نسل، تاریخی ورثے اور تہذیبی روایات کا اشتراک اتنا ہی اہم، اٹوٹ اور اٹل ہوتا تو ۱۹۴۷ء کی تقسیم عمل میں نہ آتی۔

حافظے کی بازیافت

(بقیہ صفحہ ۴۹ سے آگے)

پر زندہ ہیں۔ یہ المیہ ان تمام لوگوں کا ہے جو اپنی آگ کی زد میں آئی ہوئی عمارت سے شیخ علی ہجویری کی تمثیلی حکایت کے ہراساں چوہے کی طرح اماں کے لیے باہر بھاگ گئے اور یوں اپنے عنصر جدا کر ہو کر ایک مہیب تر اور تاریک تر آگ میں بے نام و نشان ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ روایت کے باہر کوئی زندگی نہیں چنانچہ جہاں "سیڑھیاں" اور "اپنی آگ کی طرف" یادداشت کے گم ہو جانے اور اس کی بازیافت کی خواہش کا نقشہ پیش کرتے ہیں، وہاں آخری دور کے افسانے مثلاً، "وہ جو کھوئے گئے"، "شہر افسوس" وغیرہ حافظے کے زوال اور اس کی آمل فنا کو پس منظر میں لاتے ہیں۔ ان دونوں ادوار کے عین مابین ایک عجیب لیکن ضروری وقفہ بھی آتا ہے اس وقفے میں لکھی گئی کہانیاں مثلاً "آخری آدمی"، "زرد کتا"، "کایا کلپ" وغیرہ آدمی کی شخصیت کے اخلاقی انحطاط کا منظر پیش کرتی ہیں، اور اس طرح ذات کے قعر گمنامی کی طرف رواں ناٹک۔ وسطی کی اور بڑا ضروری کڑی بن جاتی ہیں۔ یہ ناٹک کیا ہے؟ یادداشت کے ایک شعوری عمل کے ذریعے ماضی کی بازیافت کی کوشش ناکامی اور زوال، اور آخر خود تخلیقی شخصیت کی موت۔ ●

اُتر پردیش میں زرعی ترقی کے نئے امکانات

- زرعی پالیسی کو عملی سمت دینے کیلئے تجربہ گاہوں کے نتائج کاشتکاروں تک پہنچانے کی خصوصی جدوجہد۔
- نتائج کے طور پر پورے ملک میں ربیع کے تحت کل ۴۰۰ لاکھ میٹرک ٹن گیہوں پیدا ہوا جس میں صرف اترپردیش میں ۱۴۲ لاکھ میٹرک ٹن کی پیداوار ہوئی۔
- ۱۹۸۲،۸۳ء میں کل خریف کی پیداوار ۴۷٫۰۲ رہی جو کہ زبردست کامیابی ہے اگرچہ قدرتی حالات مخالف تھے
- بیشتر ڈویژنوں میں فی ہیکٹر پیداوار میں اضافہ ہوا ہے اس لیے چالو خریف میں ۹۲٫۴۰ لاکھ میٹرک ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔
- اس نشانہ کے حصول کے لیے مناسب مقدار میں کیمیاوی کھاد۔ اچھے بیج اور قرض کی سہولیات ایک ہی جگہ پر فراہم کی گئیں۔
- ۱۹۸۳،۸۴ء میں کل ۲۷۴ لاکھ میٹرک ٹن غذائی پیداوار کا نشانہ ہے۔ غذائی پیداوار بڑھانے کیلئے پردیش کی زرعی یونیورسٹیوں اور ڈویژنل صدر مقاموں پر کسان سیمناروں کا انعقاد کیا گیا جن کے ذریعے کسانوں کو نئی قسم کے گیہوں کے بیجوں کے بارے میں معلومات کرائی گئی۔
- گیہوں کی پیداوار میں اضافہ کی اسکیم کے تحت ۱۸ فیصد غیر آبپاشی والے علاقہ میں خشک کھیتی کا طریقہ اپنایا گیا جس سے گیہوں کی پیداوار اور گذشتہ سال کی پیداوار ۱۲۷٫۲۹ لاکھ میٹرک ٹن کے مقابلہ میں بڑھ کر ۱۵۹٫۸۶ لاکھ میٹرک ٹن ہوگئی۔
- اس سال کیمیادی کھاد کی تقسیم کا نشانہ ۷ لاکھ میٹرک ٹن کر دیا گیا ہے جبکہ گذشتہ برسوں میں کیمیاوی کھاد کی زیادہ سے زیادہ تقسیم کا نشانہ ۴٫۲۴ لاکھ میٹرک ٹن ہی تھا
- کسانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے فصل بیمہ اسکیم کی بھی شروعات کی گئی ہے۔

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش کی جانب سے جاری کیا

انتظار حسین اور جمیل جالبی کا سفر لکھنؤ

شین، میم

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رسل و رسائل کے سبھی ذرائع تقریباً بند ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ایک عجیب قسم کی محرومی کا احساس دونوں طرف کے دانشور طبقے کو محسوس ہوا مابین رابطہ کا جو پل بنا ہوا تھا وہ ٹوٹ گیا اور عرصئہ دراز تک ایک دوسرے کے حالات جاننے کے لیے دونوں ہی طرف کے دانشور اور ادیب کافی بے قرار رہے سرحد کے اس پار سے لیکر اس پار تک ایک اضطرابی کیفیت قائم رہی۔ ہو سکتا تھا کہ تاشقند معاہدہ کے بعد حالات سدھرتے مگر ۱۹۷۱ء کی جنگ نے تو صورتحال اور بھی زیادہ سنگین کر دی۔

۱۹۷۷ء میں جب ہندوستان میں ایک نئی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو اچانک دونوں ملکوں میں تلخیوں کو بھلا کر ایک دوسرے سے گلے ملنے کا جذبہ عود کر آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی دانشوروں کو پاکستان اور پاکستانی دانشوروں کو ہندوستان آنے کی آزادیاں ملنے لگیں۔ اسی زمانے میں جب فیض ہندوستان آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے برسوں سے بنی مصنوعی خلیج اچانک پٹ گئی ہو۔ کھل کر ملنے کے سامان بہم ہوئے تو شہر شہر ادبی تہوار منعقد ہونے لگے۔ سارے ہندوستان کا دورہ کرکے جب فیض لکھنؤ آئے تو انھیں دیکھنے اور ان سے ان کا کلام سننے کے لیے خلقت ٹوٹ پڑی۔ معلوم ہوتا تھا فیض نہ ہوں کوئی بڑا سٹار شہر میں آگیا ہو۔

۱۹۸۰ء میں کانگریسی حکومت کے دوبارہ قیام کے بعد بھی یہ خوشگوار صورتحال برقرار رہی اور ثقافتی رابطوں کے اس سلسلے نے اس وقت ایک یادگار شکل اختیار کر لی جب جامعہ میں افسانوی ادب پر ایک بڑا سیمنار منعقد ہوا اور اس میں کافی تعداد میں پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں کو شرکت کرنے کی اجازت ملی۔ اس سلسلے میں انتظار حسین اور احمد ہمیش کو اتر پردیش کی اردو اکادمی نے لکھنؤ کا مہمان بننے پر راضی کر لیا اور ان حضرات کی آمد کے سلسلے

میں کتنی ہی یادگار تقریبیں منعقد ہو گئیں۔

۱۹۸۸ء میں ایک بار پھر جامعہ ملیہ کے شعبہ اردو نے تیسری ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا اور اس میں بھی پاکستان سے بعض ممتاز دانشوروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی معلوم ہوا جیسے سارے ہندوستان میں کوئی ادبی تہوار منایا جا رہا ہو۔ کیونکہ پاکستان سے آئے ہوئے مصنفین میں سے انتظار حسین اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہندوستان کے بڑے بڑے ادبی مراکز کا دورہ شروع کر دیا۔ اور اس مرتبہ بھی اتر پردیش اردو اکادمی نے ان دونوں مہمانوں کو لکھنؤ کا مہمان بننے پر راضی کر لیا۔ احمد ہمیش کو لوگ انتظار حسین کی طرح نہیں جانتے تھے مگر ڈاکٹر جمیل جالبی انتظار حسین سے کم مقبول نہ تھے۔ ہماری نسل کے بیشتر پڑھے لکھے نوجوانوں نے " ایلیٹ کے مضامین " کا اردو ترجمہ پڑھ کر ہی ادب اور تنقید کی صحیح سمتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، مگر پھر " تاریخ ادب اردو جلد اول " (جس کی دوسری جلد بھی اب پاکستان میں شائع ہو گئی ہے) کی اشاعت کے بعد تو ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام معتبر ترین اہل قلم کی حیثیت سے مشہور ہو چکا ہے۔ جہاں تک انتظار حسین کا سوال ہے تو ان کے افسانوں کی تو دھوم تھی ہی، لیکن " بستی " کی اشاعت کے بعد (اس ناول کا ہندی میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے) تو انہیں ایک معتبر ناول نگار کی حیثیت سے بھی جانا جانے لگا ہے۔ یہی نہیں ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے " علامتوں کا زوال " کی اشاعت نے انہیں ایک سنجیدہ ناقد کی حیثیت سے بھی مشہور کر دیا ہے اگرچہ انتظار حسین خود کو تکلفاً ناقد نہیں مانتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ بس یونہی کچھ لکھ لیتا ہوں۔

اس مرتبہ دونوں قلم کار تین دن کے لیے لکھنؤ تشریف لائے اور یہ تین دن اس طرح پر لگا کر اڑ گئے کہ ہم لوگوں کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ کب ۸ اپریل ۱۹۸۸ء کی ایک خوشگوار صبح دونوں مہمانوں کا ان کی نستعلیقی اہلیاؤں کے ساتھ ہم نے چار باغ اسٹیشن پر خیر مقدم کیا اور کب یہ لوگ ہم سے رخصت ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی اہلیہ کے ہمراہ ۱۰ اپریل ہی کو علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور انتظار حسین بھی دوسری صبح ہوائی جہاز پر بیٹھ کر پھر سے پٹنہ کے لیے اڑ گئے۔

یہ تین دن ادبی نشستوں، ہنگاموں اور مباحثوں کے لحاظ سے یادگار رہے مہمان ادیبوں کے اعزاز میں پہلا جلسہ ادیبوں کو انعام تقسیم کرنے والی ایک انجمن کی جانب سے منعقد ہوا جس میں اگرچہ کم لوگوں نے شرکت کی اور جلسہ بھی خاصا روایتی رہا۔ تاہم انتظار حسین کی مختصر تقریر نے خاصا لطف پیدا کر دیا۔ ان سے پاکستان میں افسانوی ادب کے تازہ رجحانات کے متعلق اظہار خیال کرنے کی درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے نہایت انکساری کے ساتھ اس اعتراف کے بعد کہ وہ کوئی ناقد نہیں اس لیے ممکن ہے لوگوں کو ان کے خیالات پسند نہ آئیں، ترقی پسند افسانے سے لے کر تجریدی اور جدید افسانے تک اردو افسانے کے سفر پر نپے تلے انداز میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ جدید اور علامتی افسانے کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں رطب و یابس کی کثرت ہے، مگر نئے تجربے کی حیثیت سے اس تجربہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انتظار حسین نے یہ کہا کہ اس رطب و یابس کے باوجود اگر جدید افسانے میں ایک نئی معنویت پیدا ہو سکتی ہے تو اس رطب و یابس کو بھی گوارا سمجھ کر قبول کرنا چاہیئے۔

اس تقریب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک مختصر مضمون پیش کیا جو نئی شاعری اور جدید شاعری سے متعلق تھا۔ جمیل جالبی کے پورے مضمون پر ناصحانہ انداز حاوی تھا اور رلکے کے حوالے سے انھوں نے یہ سمجھانا چاہا کہ جدید شاعری میں صنعتی زندگی کی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ پورے مضمون میں وہ یہ واضح کرنے میں قاصر نظر آئے کہ ان کے نزدیک جدید شاعری اور نئی شاعری میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ کیا ہے؟

مہمان ادیبوں کے اعزاز میں دوسرا بڑا جلسہ ۹ اپریل کو اردو اکادمی ہال میں منعقد ہوا۔ دراصل یہی وہ جلسہ تھا جس کے لیے مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ جلسہ میں شہر کے ادیبوں اور شاعروں نے خاصی تعداد میں شرکت ضرور کی مگر بعض بدانتظامیوں کی وجہ سے یہ جلسہ خاصا روایتی بن کر رہ گیا

اول تو اردو اکادمی کے ٹھہرے داروں کی بے جا تقاریر سُن کر ہی سامعین خاصے بور ہوئے پھر اچانک بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے دیر تک سامعین کو گرمی اور اندھیرے میں بیٹھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جلسہ کی نظامت جو صاحب سرانجام دے رہے تھے۔ ان کی اکھڑی اکھڑی اور اٹک اٹک کر بولی جانے والی تقریر سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مہمانوں سے قطعی ناواقف ہیں۔ پھر چیرمین اردو اکادمی نے حالات سنبھالنے کی کوشش کی مگر اُن کا چہرہ جانے کیوں دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ صدر اُردو اکادمی نے جالب دہلوی کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے تعارف پر زیادہ زور صرف کیا غالباً وہ انتظار حسین کے متعلق زیادہ واقفیت نہ رکھتے ہوں گے۔

ان خاص روایتی باتوں کے بعد جب انتظار حسین اپنا مشہور افسانہ "رات" سنانے کے لیے ڈائس پر تشریف لائے تو لکھنؤ کے بزرگ ادیبوں کو بھی اُن کا یہ علامتی افسانہ نہایت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتے دیکھا گیا انتظار حسین نے اس افسانہ میں یاجوج ماجوج کہانی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ افسانہ موجودہ زندگی کی ناآسودگیوں کی بھرپور علامت بن گیا ہے۔

اس جلسے کی دوسری دلچسپی ڈاکٹر جمیل جالبی کے طویل تنقیدی مقالے کے چند اجزا تھے اگرچہ اُن کے اس مقالے پر بھی ناصحانہ انداز حاوی تھا مگر انھوں نے اُردو تنقید نگاروں پر خاصے سخت اور تلخ لہجے میں حملہ کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ تنقید محض اچھالے جانے کے لیے لکھی جا رہی ہے ہر حلقہ کا آدمی اپنے حلقے کے آدمی کی تعریفیں کر رہا ہے جس کی وجہ سے اُردو تنقید میں شدید قسم کی یکسانیت پیدا ہو گئی ہے۔ انھوں نے ناقدوں کے اس رویے کی بھی سخت لہجے میں تنقید کی کہ وہ نام و نمود کی لالچ میں پڑ کر اکثر غیر معیاری ادب کی بھی خوب تعریفیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے لہجے کی تلخی یہ بتا رہی تھی کہ وہ اُردو کی روایتی اور غیر معیاری تنقید سے سخت نالاں ہیں دراصل اردو میں فی زمانہ ایک آدھ کو چھوڑ کر کوئی بھی اچھی تنقید نہیں لکھ رہا ہے۔ بعض پیسے والے ادیبوں نے بڑے بڑے ناقدوں کو خرید رکھا ہے اور جمیل جالبی ناقدوں کے اس رویے کے شاکی تھے۔

ان جلسوں کے علاوہ مہمانوں کے اعزاز میں چھوٹے موٹے جلسے بھی منعقد ہوتے رہے ایک جلسہ ہندی کے ادیبوں کی طرف سے رائل ہوٹل میں منعقد ہوا جس میں مہمان ادیبوں سے پاکستان کی ادبی صورتحال پر متعدد سوالات پوچھے گئے۔ ایک دوسرا جلسہ خاتون ادیبوں کی انجمن "بزمِ اُردو" کی جانب سے منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تقریر کرتے ہوئے اس بات پر اظہارِ مسرت کیا کہ پاکستان میں بعض خاتون قلمکاروں نے اپنی ناولوں اور افسانوں میں خواتین کی نفسیاتی کشمکش کی عکاسی بہت عمدگی سے کی ہے۔ انھوں نے پاکستانی شاعرات عذرا عباس، عشرت آفریں اور فاطمہ حسن کا حوالہ دے کر یہ کہا کہ یہ خواتین ایسے بے باک تجربوں کو بھی شعری گرفت میں لا رہی ہیں جو اب تک حیا کے پردے سے باہر نہیں آئے تھے۔

مہمانوں کے اعزاز میں آخری اور سب سے اہم جلسہ ہندی سنستھان میں ۱۰ اپریل کو جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا۔ یوں تو یہ جلسہ سب سے زیادہ کامیاب رہا مگر وقت کی کمی کی وجہ سے جلسہ کے اختتام پر سامعین کو یہ شکایت کرتے سنا گیا کہ اب جبکہ بحث دلچسپ رُخ اختیار کر رہی تھی جلسہ ختم ہو گیا۔ پچھلے جلسوں کی طرح یہاں بھی مہمانوں کے تعارف اور استقبال کا طویل و نحیف سلسلہ شروع ہوا جو کافی تھکا دینے والا ثابت ہوا لیکن جب نیر مسعود صاحب انتہائی اختصار کے ساتھ بولنے کھڑے ہوئے تو اکتائے ہوئے سامعین خاصی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔

اس جلسے میں انتظار حسین نے نئے افسانے پر اپنا تازہ مضمون سنایا جو خالص روایتی زبان میں ہونے کے باوجود اسلوب کی دلکشی کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا اس مضمون میں انھوں نے نئے افسانے کی صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن وجوہ سے بحث کی جو نئے اور جدید افسانے کی تخلیق کا باعث بنے۔ ترقی پسند افسانے کی اس بوطیقا سے کہ افسانہ کا اختتام بہرحال رجائیت پر مبنی ہونا چاہیے — اپنا اختلاف ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے اس الزام کو بھی قبول کیا کہ وہ قنوطی ہیں۔ جدید افسانے کے سلسلے میں ان کا مدعا یہ تھا کہ اگر اس نئے تجربے سے کوئی ٹھوس چیز سامنے آتی ہے تو اس کے لیے ہمیں برے افسانوں کو

برداشت کرنا چاہیئے۔

یہاں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مختصر سے مضمون میں افسانوی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہا کہ افسانہ کا افسانہ پن بہرحال برقرار رہنا چاہیئے۔ بعض جگہ اُن کے مقالے سن کر یہ محسوس ہوا کہ بحیثیت عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا جو بلند ترین مرتبہ ہے اس کے مقابلے میں اُن کی تنقیدی بصیرت بہرحال زیادہ معتبر نہیں قرار دی جاسکی۔

اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ روایتی طریقوں کے باوصف یہاں سامعین کو اس بات کا موقع بھی فراہم کیا گیا کہ وہ مہمان ادیبوں سے مختلف موضوعات پر سوالات پوچھیں اور ایک دلچسپ نوعیت کا ادبی مباحثہ ہو۔ مگر افسوس کہ اس تجربے میں زیادہ کامیابی اس لیے نہ مل سکی کہ طویل مباحثہ کا کوئی وقت نہ تھا اور پھر یونیورسٹی کے بعض اسکالروں نے بعض سوالات پوچھے بھی تو بظاہر اُن کے سوالوں میں کوئی واضح ربط نہیں تھا۔ لڑکے زیادہ تر انتظار حسین سے بھڑکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے اور اُن کے پے بہ پے حملوں کے جواب میں انتظار حسین نے انتہائی انکسار سے یہ کہہ دیا کہ "میں دانشوری جنگ کا قائل نہیں" اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے اوپر ہونے والے ہر اعتراض کو خندہ پیشانی سے تسلیم کر لیا۔ بعض طالب علم بار بار سوال پوچھنے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اس لیے صدر جلسہ پروفیسر شبیہ الحسن کو کلاس روم کا انداز اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح یہ گفتگو جسے نہایت دلچسپ ہونا چاہیئے تھا کوئی خاص تاثر پیدا نہ کر سکی تاہم اس گفتگو کی وجہ سے جلسہ میں ایک خاص قسم کی گرما گرمی اور گرمجوشی کا احساس ضرور پیدا ہوا۔ اس وجہ سے جرنلسٹس پبلی کیشنز کا یہ آخری جلسہ انتظار حسین اور جمیل جالبی کے تین روزہ سفر لکھنؤ کا سب سے کامیاب جلسہ قرار پایا۔

جمیل جالبی

ایم اے جلیس

میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں نواب بہادر یار جنگ، مولانا ابوالکلام آزاد یا سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا شعلہ بیان مقرر بن جاؤں چونکہ اپنے اسکول کے ایک انگریزی مقرری مقابلے میں جب میں نے اپنی زندگی کی پہلی تقریر کی تو اُردو کے عظیم مزاح نگار مرحوم رحمت اللہ بیگ نے جو ہمارے شہر میں چیف جسٹس ہونے کے علاوہ اس تقریری مقابلے کے بھی جیف جج تھے۔ مجھے یوں نصیحت کی کہ

..... وہ دن اور آج کا دن ہے میں نے تقریر سے تحریر کا رُخ کیا اور آج بھی اسی لیے میں اپنے عہد اور اپنی زبان کے ارسطو جمیل جالبی کے لیے اپنے وقت کی حسینۂ عالم قلو پطرہ کے سرخ چمکیلے گالوں جیسے دہکتے چمکتے عقیدت کے شفق رنگ پھول بھی اپنے قلم ہی سے پرو کر لایا ہوں۔

میں جمیل جالبی سے پہلی بار کب ملا مجھے اب یاد نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ پاکستان کے بالکل ابتدائی دن تھے۔ نو پاکستان پوری طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکا تھا اور نہ پاکستانی باشندے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکے تھے ایک نئے گھر کو جس طرح آہستہ آہستہ سمیٹ سمیٹ کر جمایا اور سجایا جاتا ہے ویسی ہی اتھل پتھل دھیرے دھیرے سارے ملک میں ہو رہی تھی۔ ان دنوں گھر کم اور سڑکیں زیادہ تھیں۔ اور جمیل جالبی سے پہلی ملاقات بلکہ پہلی مڈبھیڑ ایک فٹ پاتھ پر ہی ہوئی۔ اس سڑک پر اس ہفت روزہ جریدے "پیام مشرق" کا دفتر تھا جس کی طرف سے اخباروں میں سب ایڈیٹر کی ضرورت کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کو سب ایڈیٹر کی اور ہمیں روٹی روزگار کی ضرورت تھی۔ اس میں اتفاق کہ "پیام مشرق" کے دفتر سے متصل چھوٹی سی بیکری کا نام "چودھریاں دی بیکری" دوسری طرف امیروں کے لیے ایک بہت بڑا ہوٹل تھا "ساؤتھ جا کیفے" اور اس کے بالکل سامنے ایک خالص عوامی ہوٹل یعنی بھائی سے میرٹھی کا خوش لذیذ مہاجرین ہوٹل:

ہم دونوں کو بھی اس وقت بیک روزگار اور پھر روٹی ہی چاہیئے تھی

ہفت روزہ " پیامِ مشرق " سے روزگار ملنے کی اُمید تھی تو روٹی چھولا دی بیکری یا پھر بھائی منے پہلوان کے حوش لذیذ مہاجرین ہوٹل' نقد پیسے خریدنے ورنہ اُدھار اگلے چیک سے بہ آسانی مل سکتی تھی۔

ان دنوں پاکستان میں ہم دونوں کے لیے سب سے زیادہ دیدہ زیب اور پسندیدہ دو ہی عمارتیں تھیں۔ ایک دفتر پیامِ مشرق" اور دوسرا بھائی منے کا مہاجر ہوٹل جو تاج محل سے بھی اس لیے اول تھا کہ تاج محل ہی موت کے دہان کی ہولا دینے والی بو۔ تو بھائی منے کے خوش ذائقہ لذیذ مہاجرین ہوٹل میں سینکی جانے والی روٹیوں کی سوندھی سوندھی حیات افزا مہک۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف جب ایک ساتھ بہت " پیامِ مشرق " کے دروازے پر پہنچے تو جمیل جالبی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا ایڈیٹر صاحب اندر ہیں ؟"

میں نے جواباً عرض کیا۔

"آپ کے اشعار کے پیچھے میری طرف سے ایضاً"

جمیل جالبی صاحب نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے کہا

"اوہو' تو آپ بھی میری طرح روزگار کے متلاشی ہیں؟"

اس پہلے منہ چھپنے کے بعد جب ہم نے ایسے اپنے ناموں کا تبادلہ کیا تو بے اختیار یوں لپٹ گئے جیسے جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں ویسے اسم اسم سے تو واقعی ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔

اخبار کے ایڈیٹر فصیح الدین احمد مرحوم نے اپنا اخبار یوں ہم دونوں کے سامنے رکھ دیا کر سنبھالو یہ اخبار۔ خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔

ہم دونوں کو بھی یہی چاہیئے تھا۔

چھپنے کے لیے چار دیواری۔ چھپنے کے لیے اخبار اور کھانے کے لیے روٹی جو دھرپال دلا بیکری کی ڈبل روٹی اور بھائی منے کے مہاجرین ہوٹل کی چائے عمدہ کڑک ملائی دار۔ ویسے بھائی منے خود بھی ایک شاعر تھا۔ اب اُس کے سامنے بعد وہ پر نہیں کیا جاسکتا ایک کا شعر یاد رہ گیا ہے ؎

چاہئے عمدہ طعام لذت دار
جو ضرورت ہو لیجئے سرکار

صحافت جمیل جالبی کے خمیر میں نہیں تھی۔ وہ فنکار ہی رہنا چاہتا تھا "فنکار" بننا اسے قطعاً گوارہ نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن زندگی کے ایک دوراہے پر ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے مجھے تو شروع ہی سے اخبار نویسی کی چھینک لگی ہوئی تھی۔ میں صحافت کے بازار کی طرف مڑ گیا۔ تو جمیل جالبی پیشہ پیغمبراں یعنی معلمی اختیار کرنے بہادر یار جنگ ہائی اسکول کی طرف چلا گیا۔ جس سے ذرا آگے اردو ادب کے ایک تاریخ ساز ادبی جریدے " ساقی " کا بھی دفتر تھا۔ اس کے بعد میں نے جب بھی جمیل جالبی کو دیکھا تو شاہد بھائی یعنی شاہد احمد دہلوی کے پہلو سے لگا دیکھا۔

شاہد بھائی اور جمیل بھائی ایک جان دو تیر دانیاں — ان دنوں ایک مضمون کی پاداش میں مجھے جیل ہوگئی۔ یوں بھی ان دنوں صحافیوں کے لیے کوئی ویج بورڈ ایوارڈ نہ تھا۔ البتہ جیل میں سیاسی قیدیوں کو ڈیلی الاؤنس معقول ملتا تھا۔ اسی لیے گو سٹے میں کلاس کے مجھے آرام بہت تھا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد بڑی مدت تک جمیل جالبی سے تو ملاقات نہیں ہوئی البتہ ایک دن شاہد بھائی ملے تو میں نے پوچھا۔

"اے جان دوسری تیر دانی کہاں ہے؟"

تو شاہد بھائی نے جواباً ایک لطیفہ سنایا کہ ایک پہلوان نے ایک مجمع عام میں سنسنی خیز اعلان کیا کہ میرے علاوہ کوئی شخص ایک مالٹے کا ہاتھ کی ایک ہی گرفت میں اتنا رس نچوڑ دے کہ اس میں ایک قطرہ بھی نہ بچ رہے تو اُسے میری طرف سے ایک لاکھ سکۂ رائج الوقت نقد نقد انعام۔

مجمع میں سے ایک نہایت دبلا پتلا نحیف آدمی اسٹیج پر آیا اور تازہ مالٹے کے بجائے پہلوان کے نچوڑے ہوئے مالٹے ہی کو

دوبارہ اس طرح پھونک ڈالا کہ نیچے رکھا ہوا ایک گلاس لبالب بھر گیا پہلوان سمیت سارا مجمع حیران رہ گیا اور اخباری نمائندوں سمیت مجھ سمیت اس اجنبی شخص کے پیچھے پڑ گیا کہ "میاں تم کون ہو؟ کہیں جادوگر تو نہیں ہو؟"

مگر صاحب! میں بھی یہاں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ اجنبی شخص کون تھا کیوں کہ مجھے بھی جمیل جالبی سمیت سر انکم ٹیکس آفیسر سے ڈر لگتا ہے اور یوں بھی انکم ٹیکس ریٹرن داخل کرنے میں اب صرف ایک ہی مہینہ باقی رہ گیا ہے۔

جمیل جالبی جیسا کہ اُنھوں نے اپنے بارے میں خود بتایا ہے کہ وہ اپنے فن کو باجے تاشے کا محتاج نہیں سمجھتے بلکہ ۔ کم گولیس۔ کم آمیز شخص ہیں۔ البتہ بسیار خواں اتنے ہیں کہ میں نے دیکھ کے بعد اگر کسی کو کتابوں کا عاشق پایا تو وہ اپنے جمیل جالبی جان جالبی ہی تھے۔

لکھنے اور اپنے تخلیقات کی داد پانے کے بارے میں وہ بڑے ہی صابر انسان ہیں۔ عام ادیبوں کی طرح عجلت پسند نہیں کہ آج لکھا کل چھپوا لیا۔ برسوں تقریب رونمائی اور اثر سوں غور لیا۔

جمیل جالبی کی نہایت صبر آزما تخلیقی قوت کے دریا کو میں اس فقرے کے کوزے میں بند کرتا ہوں کہ جمیل جالبی اسی طرح صبر و ہمت کے ساتھ ادب تالیف کے لیے کتابیں لکھتے ہیں جس طرح ہم آپ زندگی کے بیمے کی قسطیں ادا کرتے ہیں۔ زندگی ہی میں کسی خوش نصیب کو بیمے کی رقم واپس مل جائے تو مل جائے ورنہ عام طور پر بیمے کی رقم ہو یا جمیل جالبی کی سی اعلا تخلیقات، وہ ہمیشہ صرف دوسروں ہی کی زندگیاں سنوارنے کے کام آتی ہیں۔

جمیل جالبی نہ انقلابی ہیں نہ ان کی کوئی لابی ہے اور اگر وہ انقلابی ہیں تو اس حد تک کہ برصغیر ہندوستان میں علم کے "انقلاب گھر" علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی اور انقلاب کے اولین گہوارے میرٹھ سے فارغ التحصیل ہوئے۔

جمیل جالبی نے اپنے تخلیقی سفر کے آغاز کا قصہ خود یوں بیان کیا ہے کہ:

دیکھتے دیکھتے ایک لمحہ ایسا آیا کہ اچانک ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ بالکل ایسے جیسے فیوز اڑ گیا ہو۔ میں نے ذہن کے تاروں کو جوڑنے کی بہت کوشش کی لیکن روشنی نہ آنی تھی نہ آئی کئی مہینے اسی عالم خواب میں گزر گئے اور خواب میں جاگنے والی کیفیت اسی طرح باقی رہی۔ اسی کیفیت میں ایک دن گاڑی چلاتے ہوئے ایک حادثہ ہو گیا۔ کار تو چکنا چور ہو گئی۔ میں زخمی بھی ہوا لیکن حادثے کے چند گھنٹوں بعد ہی یوں محسوس ہوا جیسے روشنی آ گئی ہے اور یہ روشنی اتنی تیز ہے کہ اب میں بہت دور تک دیکھ سکتا ہوں'۔

جمیل جالبی تو اب بہت دور تک دیکھ سکتے ہیں مگر میں بھی اب بہت دور کی سوچ رہا ہوں کہ اگر ایزک نیوٹن کے سر پر سیب نہ گرا ہوتا تو نہ تسخیر خلا ہوتی اور نہ چاند انسان کے زیر قدم ہوتا۔ اسی طرح جمیل جالبی کار کے حادثے میں نہ زخمی ہوا ہوتا تو یہ اردو ادب بھی ایک بہت بڑے عالم سے محروم رہتا۔

نواب بہادر جنگ تہور ی پٹھان تھے مگر انھوں نے علامہ اقبال رح کے بارے میں فرمایا تھا:

"اور دنیا کا تہور ی کوئی اور ہو تو ہو میرا تہور ی تو اقبال ہے"

اسی طرح میں بھی اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ

"اردو کا ارسطو کوئی اور ہو تو ہو اپنا ارسطو تو جمیل جالبی ہی ہے" میں نے اپنی زندگی کے نہاں خانے میں اپنی پسندیدہ شخصیتوں اور محبوب چیزوں کی ایک کارنس سجا رکھی ہے۔ اس کارنس پر میری محبوب شخصیتوں میں سے ایک شخصیت جمیل جالبی کی ہو سب اور ادب میں اپنی زندگی کے کارنس کے جمیل جالبی اور اس کارنس پر بیٹھے ہوئے جمیل جالبی میں صرف اتنا ذرا سا فرق محسوس کرتا ہوں کہ یہ جمیل جالبی فانی تو وہ جمیل جالبی لافانی ●●●

جدید اُردو افسانے کے رجحانات

جمیل جالبی

خدا نے جس دن انسان کو پیدا کیا اور شیطان سے سجدہ کرنے کے لیے کہا اسی دن ایک افسانہ پیدا ہو گیا۔ شیطان نے جب انکار کیا تو اسی کے ساتھ کشمکش کا عمل اور تصور بھی وجود میں آگیا۔

یہ کشمکش اس وقت نمایاں ہوئی جب شیطان نے ماں حوا کو ورغلایا اور ماں حوا نے وہ کام کیا جس کے لیے انھیں منع کیا گیا تھا۔ حوا کی بیٹیاں بفضل تعالیٰ آج تک یہی کام کر رہی ہیں۔ شاید پہلا افسانہ وہ تھا جو ماں حوا نے گندم کھانے کے بعد باوا آدم کو سنایا اور بتایا کہ کیسے ایک سانپ نے انھیں گندم کھانے پر آمادہ کیا اور وہ گندم اس عزیز کی قسم کیا مزیدار تھا۔ ماں حوا اسے باوا آدم کے پاس لے کر آگئیں اور غمزوں، عشووں اور اداؤں کے ساتھ کہا کہ وہ بھی اسے کھائیں۔ یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ اس دن سے لے کر آج تک اولادِ آدم جن نتائج تک پہونچی ہے انھیں ماں حوا کی طرح بیان کر دیتی ہے اور اولادِ آدم کا یہ بیان افسانہ ہو جاتا ہے۔

زندگی واقعات اور کشمکش سے معمور ہے اور ان کا بیان افسانہ نگار رہا ہے اسی لیے افسانہ انسانی فطرت اور اس کی زندگی کا اہم جزو ہے۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں یہ موجود ہے اور ہر شخص افسانے، کہانی سے کچھ نہ کچھ دلچسپی رکھتا ہے۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ لوگ بچوں کی طرح ہیں اور کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے کے ساتھ ساتھ کہانی کی شکل اور نوعیت بدل گئی ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پہلے پہلے افسانے محض واقعات ہوں گے

مگر بعد میں انسان اپنی مشکلات، اپنے مصائب اور مسائل کو دیکھ کر، ان کہانیوں میں دل خوش کرنے والے خواب بھی دیکھنے لگا ہوگا اور اسی طرح وہ "جو کچھ ہوا" کی منزل سے گزر کر "جو کچھ ہونا چاہیے" کی منزل تک آگیا۔ "جو کچھ ہونا چاہیے" کی خواہش میں مافوق الفطرت باتوں اور افراد کو جنم دیا۔ آگے چل کر بعد کے ادوار میں مذہب و اخلاق کے اثر سے ان کہانیوں میں تمثیل کا رنگ بھرا اور اسی طرح انسان کا یہ فطری رجحان "فن" کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جسے ہم "عقل کا دور" کہتے ہیں۔ اس دور میں اس بات پر زور دیا گیا کہ "حقیقت" افسانہ سے زیادہ پُر اثر اور دیرپا ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ یہ رجحان پیدا ہوا کہ ایسے قصے بیان کیے جائیں جن میں حقیقت اور صرف حقیقت ہو۔ یہی رجحان ناول کی پیدائش کا سبب بنا۔ لفظ "ناول" کے لغوی معنی نئے کے ہیں یعنی ایسا نیا جو پرانے سے مختلف ہو۔ اسی طرح ناول میں مافوق الفطرت یا تمثیلی افراد کے بجائے حقیقی افراد و واقعات کے قصے بیان کیے جانے لگے۔

انھیں قصوں کے اندر اندر چھوٹے چھوٹے قصے بھی آجاتے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قصے مختصر افسانے کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ چنانچہ مختصر افسانے کی اوّلیں شاخیں کسی بڑے ناول سے لیے ہوئے وہ چھوٹے قصے ہیں جو ناول کے قصے سے الگ ہیں۔ اسی قسم کے قصے ہماری داستانوں میں بھی ملتے ہیں جن کا داستان کے مرکزی حصہ سے بظاہر یا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اگر انھیں داستان سے الگ کر دیا جائے تو داستان کے مرکزی قصے پر کوئی خاص اثر بھی نہیں پڑتا۔ ان قصوں کو ہم افسانوں کی ذیل میں لا سکتے ہیں۔ یہی افسانے کی ابتدا ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کے "ریڈ گانٹ لٹ" (RED GAUNTLET) میں ایک شخص "دلی" کا ایک قصہ سناتا تھا یہ قصہ انگریزی ادب میں مختصر افسانے کی ابتدائی مثال ہے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے قصوں کو دیکھ کر "ایڈگر ایلن پو" کو یہ خیال آیا کہ مختصر افسانے کو ایک الگ صنف بنایا جا سکتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو کے افسانوں کا مجموعہ اس اعتبار سے جدید افسانے کا پہلا مجموعہ ہے اس کے ساتھ یہ فن مقبول ہو گیا اور جلد ہی اس میں موپاساں اور چیخوف جیسے بڑے نام نظر آنے لگے اب تو افسانہ ایک ایسی صنف ادب بن گیا ہے کہ شاید ہی کوئی مقبول یا نامقبول رسالہ ایسا ہو جس میں اسے اہمیت نہ دی جاتی ہو۔ ہمارے یہاں پریم چند نے اس صنف ادب کو اپنایا اور اپنی صلاحیتوں سے اسے ایسا مقبول بنایا کہ لکھنے والوں کی نئی نسل اسے لے اُڑی اور اس منزل پر اسے پہنچا دیا جہاں آج یہ نظر آتی ہے۔ اگر شاعر حضرات بُرا نہ مانیں تو بلا تامل یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت افسانہ غزل سے بھی زیادہ مقبول صنف ادب ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عام انسانوں کو دوسرے کے تجربات میں شامل ہونے اور دوسروں کی کہانیاں سننے کا شوق ازل سے ودیعت ہوا ہے۔ اسی دلچسپی اور صنف ادب کی مقبولیت نے افسانے میں ایسا تنوع پیدا کیا کہ آج اتنی قسم اور اتنے رنگ کے افسانے نظر آتے ہیں کہ اب ان کی درجہ بندی بھی ممکن نہیں رہی ہے لیکن اس تنوع اور رنگا رنگی کے باوجود اچھے افسانوں میں ایک بات مشترک اور منفرد نظر آتی ہے اور وہ ہے "اتحادِ اثر" اتحادِ اثر کے معنی یہ ہیں کہ مختصر افسانے میں ایک ہی واقعہ ہو، ایک ہی کردار ہو، قصے کا رُخ اور موڑ بھی ایک ہی ہو۔

یہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ متعدد اچھے افسانے ایسے ہیں جن میں ایک کردار نہیں بلکہ بہت سے یا کئی کردار ملتے ہیں۔ مثلاً غلام عباس کے افسانے "آنندی" میں احمد علی کے افسانے "ہماری گلی" میں، حسن عسکری کے افسانے "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" میں، احسن فاروقی کے "برقعے والیاں" میں یا اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے "دشمن میرا" میں سات آٹھ تاثرات بیان کیے گئے ہیں۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، صادق حسین، ہاجرہ مسرور، ابوالفضل صدیقی، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی، [illegible] شوکت صدیقی، واجدہ تبسم، رام لعل، عصمت چغتائی، ______ خدیجہ مستور، انتظار حسین، [illegible] حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال اور دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی

ایک ہی افسانے میں کردار اور تاثرات کی رنگا رنگی نظر آتی ہے گورکی
کے افسانے "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" موپاساں کے افسانے
"ان دی رین (IN THE RAIN) میں بھی یہی عمل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر غور
سے دیکھا جائے تو یہ سارے کردار بنیادی طور پر ایک ہی کردار کا حصہ
ہوتے ہیں گورکی کے افسانے [illegible] کہ چھبیس مرد ایک لڑکی کی ہستی
زندگی کو دیکھ کر سوا کیف کی سی بسر رہے ہیں۔ عمل یا خصوصی کی
کردار تعمیر ہوتا ہے بیس سالہ زندگی کا قصہ آگیا ہے مگر قصہ
کے دیگر پہلو ہم شروع میں سامنے ہیں۔ مگر سارے کہانی کا
[illegible] میں اور مرکزی کردار ایک ہی رہتا ہے۔ غرض کہ اتحاد تاثر بلکہ
وحدت تاثر بھی مختصر افسانے کو جنیادی و مشترک خصوصیت ہے
چیخوف نے تو اتحاد اثر کو اس درجہ اہمیت دی کہ اسی کی وجہ
اور قصہ دونوں غائب ہو گئے اور صرف تاثر ہی تاثر باقی
رہ گیا۔ یہ تاثر ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں استعمال
کیا کرشن چندر نے جتنے افسانے لکھے ان میں محسوس تاثر کو
ابھارنے کے لیے ایسے نقشے بنائے کہ آخر میں سرمایہ دار سے
نفرت اور مزدور سے ہمدردی کا اثر قائم ہو
کا یہ تاثر سلسلہ جب اور آگے بڑھا تو پھر افسانے کو ہر قسم کے
نفسیاتی اور سماجی نظریات کے تجربوں کا آلہ کار بنا لیا گیا۔ یہ کام
اردو افسانے میں بھی ہوا اور مغرب کے افسانے میں بھی۔ اسی
رجحان کے ساتھ وہ لوگ سامنے آئے جو فرائڈ کی نفسیات کا
سہارا لیکر اپنے افسانوں میں نفسیاتی الجھنوں کا تجزیہ پیش کرتے
تھے مثلاً انگریزی میں ڈی ایچ لارنس اور اردو میں منٹو۔
عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی کے نام اس سلسلہ میں لیے جا سکتے
ہیں پھر اس کے ساتھ "شعور کی رو" (STREAM OF CONSIOUSNESS)
والے افسانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔
انگریزی ادب میں اس کی مثال ورجینیا وولف اور اردو میں
محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور ڈاکٹر احسن فاروقی ہیں۔
عسکری کے افسانے "جزیرے کی ہیلی" اور "حرامجادی" قرۃ العین
حیدر کے افسانے "جلاوطن" اور "ہاؤسنگ سوسائٹی" اسی کی
اچھی مثالیں ہیں۔
اُردو افسانے نے ۵۰ سال کے عرصے میں بہت ترقی کی اور
دیکھتے ہی دیکھتے بہت عرصہ تک زندہ رہنے والے متعدد افسانے
وجود میں آگئے لیکن ہمارے دور میں افسانے کو سب سے زیادہ
نقصان دو چیزوں سے پہنچا۔ ایک تو اس بات سے کہ اچھے ادبی
رسالے منظر سے غائب ہو گئے اور دوسرے اس بات سے
کہ ڈائجسٹوں نے پست مذاق کو اتنا عام کیا، سنسنی خیزی،
جرائم، تراسرار، بیمار جنس پرستی، جھوٹی رومانیت، جاسوسی
فرضی واقعات کی کہانیاں اتنی کثرت سے چھاپیں اور لکھنے والوں
کو ایسا معقول معاوضہ دیا کہ سنجیدہ اور اچھے افسانہ نگار بھی
اسی قسم کی کہانیاں لکھنے لگے ادھر اخباروں نے اپنی اشاعت
بڑھانے اور ادبی رسالوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والا
خلا کو پر کرنے کے لیے یہ کیا کہ وہ بھی ادب چھاپنے لگے۔
ظاہر ہے کہ وہ ادب جو اخباروں میں چھپتا ہے صحافت کی سطح
سے بلند نہیں ہو سکتا۔ لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اسے ایسی ہلکی
پھلکی چلتی ہوئی سرسری چیز اخبار کے لیے لکھ دینی چاہیے کہ جو
اخبار کے قاری کے لیے مناسب ہو اور جسے وہ چلتے پھرتے
پڑھ سکے۔ اسی کے ساتھ امپوسٹر (IMPOSTER)
اخباری ادیبوں کی ایک پلٹن تیار ہو گئی جو اخباروں کے کالم نویس
بن کر داد لینے اور شہرت بٹورنے لگے۔ اب ادیب اور افسانہ
نگار وہی لوگ رہ گئے جو باتعارف ہیں۔ اخباروں میں چھپتے ہیں
اور دوسرے لکھنے والے پبلک کی نظروں سے اوجھل ہو گئے
اس طرح ادب کے ابلاغ کے سارے ذرائع امپوسٹر زدہ
"دو اشٹیلکچول" کے ہاتھ میں آگئے۔ جو اخباری پالیسی کے مطابق
وقت پڑنے پر کبھی "بلبلا" بن گئے اور کبھی "دائیں"۔ ان سب
چیزوں نے بحیثیت مجموعی ادب کو شدید نقصان پہنچایا اور
ادبی مذاق کو پست کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔
اور صاحبو اب زوال آتا ہے تو بقول اسلام صحافت میں، انتشار
اور انحطاط میں، ترقی اور تنزل میں، دانش اور حماقت میں انٹیلکچول

میں، اچھے اور برے میں، نیکی اور بدی میں، خود غرضی اور بے لوثی
میں، نفرت اور محبت میں، تعصب اور فراخدلی میں، حب الوطنی
اور غداری میں، علاقہ پرستی اور قوم پرستی میں کوئی امتیاز باقی نہیں
رہتا اور منفی قوتیں مثبت قوتوں پر حاوی آجاتی ہیں۔

بہر حال پریم چند کے بعد ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۶۵ء اردو افسانے پر نظر ڈالی جائے تو تین رجحانات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

(۱) افسانے میں نئے نئے تجربے کیے گئے۔ قصہ یا قصہ پن کو افسانے کے لیے ضروری نہیں سمجھا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ یہ جو ہے افسانہ ہے، داستان نہیں ہے، کہانی کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اس میں کہانی نہ ہو۔

(۲) افسانے میں واقعیت یا رئیلزم کو حد درجہ برتا گیا اور اس میں نظریات کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ کبھی اشتراکیت کے نظریے سے زندگی کو دیکھا اور پیش کیا اور کبھی نفسیاتی تحلیل اور خاص طور پر جنسی محرکات کے کرتبوں کو رنگارنگ طریقوں سے پیش کیا۔ وہ تصورات جو جنسی نفسیات کے ماہرین نے پیش کیے تھے انہیں افسانے کا موضوع بنایا گیا اور اس بات کو بھلا دیا گیا کہ خود یہ تجربے زندگی سے قریب بھی تھے یا نہیں۔

(۳) افسانے لکھنے میں سیدھے سادے افسانوی طریقے کے بجائے شعور کی رو، تاثراتی طریقے اور وجودیت سے کام لیا گیا اور تکنیک کو خاص اہمیت دی گئی۔

پہلے رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ محض فرضی واقعات کی جگہ ایسی واقعیت نے لے لی جو علم پر مبنی تھی اور اسی لیے دعوت فکر دیتی تھی۔ دوسرے رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ بیان کے نئے طریقوں نے سیدھے اور سپاٹ بیانیہ انداز کے بجائے جدید معنی ہیں جن کو پیدا کیا۔ ان تینوں رجحانات نے اردو افسانے کو بہت آگے بڑھا دیا لیکن ۱۹۶۵ء کے بعد اردو افسانے میں جو رجحان پائے جاتے ہیں ان کی درجہ بندی اس طرح کی جا سکتی ہے۔

(۱) اب ایسے افسانے لکھے جا رہے ہیں جن میں واقعیت کے بجائے جس کو اب تک افسانے کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا زیادہ تر زور ماورائے الفطرت، تخلیقی اور جذباتی عناصر پر دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اور افسانے کو ملا کر ایک کیا جا رہا ہے

(۲) علامت کے ذریعے پرانی کہانیوں کو زندہ کیا جا رہا ہے اور پرانی کہانیوں کو نئے معنی دیئے جا رہے ہیں جس سے افسانوں میں ابہام، رومانیت، پراسراریت اور تکرار کے مس سے افسانے اور شاعری کی سرحدیں ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ انتظار حسین کے علامتی افسانے "شہر افسوس" "زرد کتا" اور "آخری آدمی" اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ انتظار حسین کی اشاریت تمثیلی انداز کی ہے جن میں پرانے قصوں کو نئے معنی دینے کی کوشش کی ہے "آخری آدمی" میں اساطیری علامتوں کو دور حاضر کے [illegible] کو داستان ساز کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ "شہر افسوس" کا بھی داخلی عمل یہی ہے۔ "شہر افسوس" کی کہانی کے کردار ایک دوسرے پر ہر دم شک کرتے اور خود کو معصوم سمجھتے ہوئے لوگ اسے اخلاقی زوال کا اظہار کرتے ہیں۔ انور سجاد نے اپنے مجموعے "استعارے" میں بھی پرانی علامتوں کو نئے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً منظور رپیلا اور پرومیتھیس تو یورپ کے ادب کی جانی پہچانی علامتیں ہیں منظور پیلا۔ عورت کی جنسی خواہش کی اور پرومیتھیس فن کار کی انقلابی قوتوں کی۔ اسی طرح بعض نئی علامات بھی استعمال کی ہیں اور ان میں واقعاتی رنگ بھی ہے انور سجاد نے اپنے دور سے ملانے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان علامتی افسانوں میں ایک بات تو یہ مشترک ہے کہ ان میں شاعری اور افسانے کو تخیل کی سطح پر ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انتظار حسین نے اپنے علامتی افسانوں میں غزل کے مزاج کو اور انور سجاد نے شاعری اور مصوری کے مزاج کو تخیل کی سطح پر افسانے میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اظہار، تکنیک اور کہانی کو حاکر لینے کرنے کی قوت کے اعتبار سے انتظار حسین نہ صرف علامتی افسانے کے جدید رویے بلکہ انور سجاد سے زیادہ پر اثر ہیں۔

(۳) ایسے افسانے کثرت سے لکھے جا رہے ہیں جن میں [illegible]

کے زخموں کو چیر کر مرہم لگائے بغیر یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ آخر زندگی کا حاصل موت ہے ایسے افسانوں کے ذریعے فن انتشار پیدا کر رہا ہے اور منفی قوتوں کو ابھار رہا ہے۔ ادب کا وہ دائمی معیار کہ ادب کا اثر تزکیاتی (کیتھارسس) ہوتا ہے ان افسانوں میں نظر آتا۔ تزکیاتی اثر ادب کا مثبت رجحان ہے۔ ادب میں کیتھارسس کے عمل سے ارسطو کی مراد یہ تھی کہ ٹریجڈی موت اور دہشت کے منظر ہی نہ پیش کرے بلکہ انسان کو ان سے بالاتر محسوس کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرے۔ چنانچہ ٹریجڈی موت کا مظاہرہ ہی نہیں بلکہ زندگی کو موت سے بالاتر اور فاتح کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔

(۴) ایک قسم کے افسانے وہ ہیں جو واقعیت سے تو نہیں ہٹے مگر اس واقعیت پر جذباتیت اس درجہ غالب ہو جاتی ہے کہ یہ افسانے وقتی اور عارضی سنسنی سی پیدا کر کے رہ جاتے ہیں۔ اور جن کا اثر پڑھنے والے پر منفی ہوتا ہے۔ اس رجحان میں صرف کلبیت ہی نہیں ہے بلکہ بزدلی اور زندگی سے فرار کا پتہ چلتا ہے اس قسم کے افسانوں میں تاثر سے رنگ بھرا جاتا ہے اور غم کی دلدل میں دھنس کر لذت حاصل کی جاتی ہے۔

(۵) ایک قسم کے افسانے وہ ہیں جنھیں ہم تجریدی افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ افسانے علامتی افسانے سے آگے بڑھ کر تجریدی مصوری کی تکنیک کو افسانے میں استعمال کر رہے ہیں۔ اب تک جتنے افسانے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں بے معنویت کے گہرے ابہام کا انتشار موجود ہے اور "وحدت تاثر" کی جگہ "انتشارِ تاثر" کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں علامتیں ٹوٹتی ہوئی نظر آئیں گی۔ خلا کا کو افسانے سے ملنے کا عمل بھی منظر آئے گا اور واقعات کے بیان میں فوق الفطرت ماورائی عناصر غالب ہوں گے۔ اور ایسا معلوم ہوگا جیسے مکان کی چھت گر گئی ہے۔ اس نوع کے افسانوں میں بیمار روحانیت کا ایسا ابہام نظر آتا ہے جس میں حقیقی دنیا کا عکس یا اس کی روح کا [illegible] نہیں چلتا۔

(۶) ایک اور قسم کے افسانے وہ ہیں جن میں لمحوں کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں ان کا ذکر کی ہیئت ہے اور تجربہ بھی خام اور ادھورا ہے۔ امریکی افسانہ نگار ولیم سرویان نے بھی ایک طرح سے ایک لمحے کے افسانے لکھے ہیں لیکن ان میں افسانے کا بنیادی فن یعنی وحدت تاثر موجود ہے۔ لمحے کے افسانوں میں تذبذب اور پریشانی و کرب کی سنسنی تو موجود ہے، لیکن ان افسانوں کے گنبد بے در سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے یہاں اس ذہنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے جسے ژاں پال سارتر "تہوع" سے تعبیر کرتا ہے سارتر کے افسانوں میں اسی کیفیت کو ہمت اور احساس ذمہ داری سے توڑنے کی تلقین بھی ملتی ہے لیکن لمحے کے افسانے لکھنے والے پڑھنے والوں کو ہلکان کرنا چاہتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ اخلاقی طور پر بزدل اور نفسیاتی طور پر مذبذب ہے ان افسانوں کو پڑھ کر انسان تھک جاتا ہے اور زندگی کے مثبت پہلوؤں سے نظریں چرانے لگتا ہے۔ وجودیت میں تذبذب اور کرب (ANGUISH AND DISGUST) ضرور موجود ہے لیکن ساتھ انتخاب (CHOICE) بھی موجود ہے۔ سارتر کے ہیرو انتخاب (CHOICE) تک ضرور پہنچتے ہیں۔

(۷) ایک قسم افسانوں کی وہ ہے کہ جن میں چٹکلوں پر افسانہ لکھا ہے یہ افسانہ تو چند سطروں میں ختم ہو جاتا ہے یا پھر ایک آدھ سے بیان کر دیا جاتا ہے لیکن ان میں کسی ہلکے یا گہرے تجربے کا پتہ نہیں جوگندر پال نے اس قسم کے افسانے لکھے تھے لیکن اگر افسانے زندگی کا تجربہ شامل نہ ہو تو وہ پڑھنے والے کی زندگی میں کیسے شامل ہو سکتا ہے؟ یہ رجحان دیکھتے ہی دیکھتے مر گیا۔

افسانے کے ان سب بدعت رجحانات کو دیکھ کر ہمیں اردو افسانے سے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کوڑے میں کچھ ایسے بھی لکھے ہیں جن میں رنگ و بو اور ہیئت کے مخصوص توازن کا سے احساس ہوتا ہے۔ ان میں تجربہ پہلی اور بنیادی شرط ہے کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مختلف نظریات بھی حسب ضرورت، استعمال میں آرہے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے اردو افسانے میں اب تک جو تجربات ہوئے ہیں۔ (باقی صفحہ

میں کیوں لکھتا ہوں

انتظار حسین

اگلے زمانے میں ایک سوداگر تھا جس کی سات بیویاں تھیں۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ اسے بیوپار کے سلسلے میں سفر پہ جانا پڑا۔ وہ باری باری چھیوں بیویوں کے پاس گیا اور بولا کہ "بی بی ہم پردیس جاتے ہیں کہو تمھارے لیے کیا تحفہ لائیں؟" سب بیویوں نے بڑی لمبی چوڑی فرمائشیں کیں۔ پھر آئی ساتویں بیوی کی باری جس سے سوداگر کو ایسا انس تو نہیں تھا مگر اس نے سوچا رسم تو پوری کر ہی لینی چاہیے۔ ساتویں بیوی نے نہ کسی قیمتی زیور کی فرمائش کی، نہ کسی بھاری پوشاک کی، بس ایک سبز پنکھا لانے کو کہہ دیا۔

سوداگر جب اپنا کاروبار کر کے پردیس سے واپس ہونے لگا تو اس نے بازار جا کر بیویوں کے لیے پر تکلف تحفے تحائف خریدے مگر سبز پنکھا اس کے ذہن سے اتر گیا۔ جب وہ جہاز میں آ کر بیٹھا تو عجب ماجرا گزرا کہ جہاز اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کرے۔ جہازی سرگرداں اور مسافر پریشان کہ جہاز آخر کیوں نہیں چلتا؟ کسی پہنچے ہوئے بزرگ نے کہا کہ بھئی تم میں سے کوئی مسافر اپنا کام کرنا بھول گیا ہے۔ جب تک وہ کام پورا نہیں ہوگا جہاز حرکت میں نہیں آئے گا۔ ہر مسافر سے باری باری سوال کیے گئے۔ سب نے اپنے اپنے کام گنائے۔ جب آئی سوداگر کی باری تو اسے اپنی بیویوں کے تحفے گناتے گناتے اچانک ساتویں بیوی کا سبز پنکھا یاد آ گیا۔ جہاز والوں نے کہا کہ سبز پنکھا تلاش کرو اور جلدی لاؤ کہ جہاز کسی طرح روانہ ہو۔

میں بھی ایک سفر پہ نکلا ہوا ہوں۔ اور سبز پنکھا ڈھونڈھتا ہوں۔ پرانی کہانیوں اور داستانوں کے شہزادے اور سوداگر بڑے خوش نصیب ہوتے تھے کہ ناکامیوں اور پریشانیوں کے بعد بالآخر کو ہر مراد پا لیتے تھے مگر جس سفر پہ میں نکلا ہوں۔ اس میں گوہر مراد تو کم ہی لوگوں کو ملا ہے۔ شعبدے البتہ بہت ملتے ہیں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کوئی بڑا دعویٰ کر بیٹھا ہوں۔ ویسے "میں کیوں لکھتا ہوں؟" کے سوال کے جواب کی کوشش کیا ایک دعویٰ نہیں؟ اور یہ دعویٰ اپنے یہاں کسی کو نہیں ہے؟

مگر میں تو یوں سوچتا ہوں کہ فرض کیجیے کہ چیخوف کے ملک میں اس کی زندگی میں یا اُس کے مرنے کے فوراً بعد میں لکھ رہا ہوتا تو کیا یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرتا؟ اللہ کی قسم میرا تو قلم تھرانے لگتا ہے۔ لیکن میں یہاں ڈروں کس سے؟ میں جس زبان میں لکھتا ہوں اس میں افسانہ نگار بے شک ہوئے ہیں لیکن نصف صدی سے کچھ کم اُدھر۔ اس کے بعد جو لوگ آئے اور بالخصوص وہ نوع بہ نوع جینیئس جیسوی دال تحریک کے ساتھ آئے یہ لوگ کون ہیں میں اُنھیں نہیں پہچانتا۔

اُنھیں دیکھ کر تو مجھے داستانوں کے شعبدے باز دل کا خیال آتا ہے۔ آخر کس کی پیروی کروں اور کس کے خلاف بغاوت کروں۔ میرے راستے میں یہ لوگ آتے ہی نہیں۔ ان کی کوئی تحریر نہ میرا راستہ روکتی ہے اور نہ راستہ دکھاتی ہے۔ مجھے اس کام کے لیے دور کے دور چھلانگ کر اس دور میں پہنچنا پڑتا ہے جب "آب حیات" شائع ہوئی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد اور ان سے پہلے اور آس پاس کے دنوں کے چند اور افسانہ نگار ہینک صاحب تخلیق لوگ تھے۔ سیاح تھے بس انھوں نے جو بیویوں کے تحائف فراہم کیے ہیں سبز پنکھیا میں نے کسی کے یہاں نہیں دیکھی۔

یہ سبز پنکھیا کیا ہے؟ . یہ سوچتے ہوئے میرا تصور اس وقت کی داستانوں کی فضا میں بھٹک کر اپنے بچپن کے گھر کے اس بالائی کوٹھے پر جا پہنچا ہے جہاں عقب میں ایک بڑا سا جنگلا تھا اور اس سے پرے ایک بوسیدہ سا چھجا جس پر نہ جانے کب سے مٹی جم رہی تھی۔ برسات کے دنوں میں اس پر عجیب سی گھاس اُگ آتی تھی، نرم پتلی سی سیدھی شاخ پھننگ پر سبز ورق سا لپٹا ہوا کچھ اس شکل کا جس شکل کا پتوں میں لپٹا ہوا پان ہوتا ہے۔ شاخ لمبی ہوتی جاتی اور وہ ورق کھلتا جاتا۔ سفید سفید روان اندر سے جھانکتا، پھر ایک ملائم سا ملیو ترا خوشنما گالا ہوا میں لہلہانے لگتا۔ میری زبان میں شاید اس پودے کے لیے کوئی نام موجود نہیں ہے میرے معتقدین نے تو بندے کے پورے

قافلے ہی کو بے گانہ کہہ کر فطرت کی برادری سے خارج کر دیا تھا ویسے ہم اس پودے کو بٹے کہا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنی مرتبہ میں نے اسے توڑنے کی کوشش کی ہوگی مگر جنگلے میں میرا ہاتھ پھنس جاتا اور وہ پودے میری دسترس سے پرے بے نیازی سے لہلہاتے رہتے۔ کبھی کبھی ابر آتا تو ان پودوں میں پہلے ایک بہت ہلکی تھرتھری پیدا ہوتی اور پھر ایکا ایکی ہوا کے جھونکے سے وہ جھونٹے سے لینے لگتے ــــ یہ ہے وہ لمحہ جسے گرفت کرنے کے لیے میں نے افسانہ نگاری کا جال پھیلایا مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس پودے کو، اس کی نیم محسوس جنبش کو میں نے دیکھا ہے۔ صحیفۂ فطرت کی یہ آیت مجھ پر میرے وجدانی نفس پر اُتری ہے۔ مجھے اس پودے کا الم تخلیق کرنا ہے۔ اور اس کی لرزش کو ایک جلی شکل میں ڈھالنا ہے باغ کا یہ ذرۂ زمین اب تک نگاہوں سے اوجھل تھا بیکار تھا باغ سے باہر تھا۔ اب میری تفسیر سے یہ باغ کا جز بنے گا اس ذرے کی میں یوں تفسیر کروں کہ اس کا انفرادی حسن بھی نظر آئے اور وہ حسن آیتوں کے اس پورے نظام سے پیدا ہونے والے حسن کا بھی جو نظر آئے جسے فطرت کہتے ہیں۔ اگر میں نے یہ فرض ادا نہ کیا تو فطرت کا تصور اس زمانے میں جس حد تک مکمل ہونا چاہیے، مکمل نہیں ہوگا اور یہ ایک گناہ ہوگا جس کا مجھ پر عذاب پڑے گا۔ اگرچہ یہ فریضہ ادا ہو تو سفر کامیاب رہا اور سبز پنکھیا مل گئی۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ جب اپنے سے جنگلے کی سلاخیں زیر نہ ہو سکیں تو اس لمبے سفر میں آنے والی بڑی مشکلات پر کیونکر غلبہ حاصل ہو سکے گا؟

اپنا یہ مکان "ڈبائی" میں تھا جسے گنگا کا پانی سیراب کرتا تھا مگر میں نے اور دریا بھی تو دیکھے ہیں ان سے سیراب ہونے والی مٹی پر اگتا ہوا دوسرے رنگوں کا سبزہ بھی دیکھا ہے گنگا جل سے بھیگی ہوئی زمین میں جنم لیا، جس سے تر ہونے والی زمین پر ہوش سنبھالا۔ اب وادی کے کنارے چھائی ہے۔ پھر اپنی سب سے آگے ایک دریائے فرات جس کا ساحل مولد کیا

ہے مسکن بھی ہے اور مرجا بھی، مجھ سے پہلے ایک شخص گزرا ہے جس جوگومتی اور فرات کے بیچ میں کھڑا تھا۔ اس نے دونوں دریاؤں کو کاٹ کر اپنا ایک تیسرا دریا نکال لیا۔ میں چاروں دریاؤں کے جال میں گھرا ہوں۔ یہ ایسی صورت حال ہے جس سے شاید مجھ سے پہلے کسی لکھنے والے کو پالا نہیں پڑا تھا۔ حال اپنا یہ ہے کہ بازو میں نہ وہ انیس والا زور اور نہ اس کا جیسا تیشہ۔ مگر خواب یہ دیکھتا ہوں کہ انھیں کاٹ کر اپنا پانچواں دریا نکال لوں گا۔ اس خود فریبی کی کوئی حد ہے؟

انیس، نظیر، مولانا محمد حسین آزاد، یہ چند ہستیاں میرا راستہ روکتی بھی ہیں اور مجھے راستہ دکھاتی بھی ہیں۔ نظیر کو جب میں پڑھتا ہوں تو مجھے اس آیت کا رستہ ہاتھ آتا ہے جو اس خستہ گھیجے کے وسیلے سے مجھ پر اتری تھی اور آب حیات، مجھے واقعی کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ اردو کا پہلا ناول آزاد نے لکھا اور دوسرا ناول میں لکھوں گا۔ لیکن یہی کتاب میرا راستہ بھی روکتی ہے، وہ ضمنی کردار تک جو بس تھوڑی تھوڑی سطروں میں بیان ہوئے ہیں۔ مجھے چیلنج کرتے ہیں کہ ہم جیسا کوئی جیتا جاگتا کردار تخلیق کیا ہو تو سامنے لاؤ۔ اس کے وہ مختصر فقرے جو سماج کے شعور میں اتر گئے ہیں، مجھے ٹوکتے ہیں کہ ایسی نثر لکھی ہو تو پیش کرو؟

لکھنے والوں کی یہ وہ نسل ہے جس کی میں نے پیروی کی ہے اور جس سے میں بغاوت پر تلا بیٹھا ہوں۔ میں نثر لکھنا چاہتا ہوں مگر محمد حسین آزاد کی نہیں۔ اپنی نثر۔ میرے افسانوں کی زبان پر خاص واہ واہ ہوتی ہے، حالانکہ میرے افسانوں کا جو سب سے کمزور پہلو ہے وہ یہی زبان ہے۔ کم بخت یہ رشتے تو میرے قابو میں کم از کم اب تک نہیں آئی ہے۔ اظہار کے بنے بنائے سانچوں کو میں نے اگر ذرا سلیقے سے استعمال کر بھی لیا تو تیر کیا مارا؟

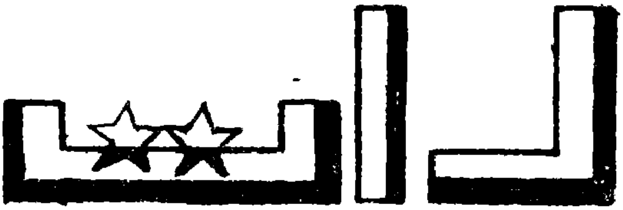
میں نے اپنا سانچہ کہاں بنایا؟ یہ خام ذہن میرے ہاتھوں میں موم نہیں بنتا۔ اس خیبر کے دروازے میں جب تک میری انگلیاں یوں دھنس نہ جائیں جیسے آیئے میں دو آتی ہیں اس وقت تک میں کیسے کچھ لوں کہ خیبر فتح ہو گیا۔ ؟ مجھ پر جو آیت اتری ہے وہ اپنی زبان بھی لگا لائی تھی۔ وہ ترو تازہ زبان میرے حافظے سے اتر گئی ہے۔ ایک طرف تو میں اس زبان کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور دوسری طرف یہ بھی سوچ رہا ہوں میں نے جو چاروں دریاؤں کا پانی پیا ہے اُن چاروں کی روانی بیک وقت میری زبان کی آہنگ میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔

مجھے یہاں اپنے ایک اور احساس کا ذکر کر دینا چاہیئے اس سفر میں میں اپنے آپ کو اکیلا ہی سمجھتا ہوں۔ مگر اکثر رستوں پر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اپنے ساتھ چل رہے ہیں۔ شاید وہ بھی سبز چڑیا کی جستجو میں ہیں شاید یہ ہے نئی نسل کا احساس۔ ہمسفری کا بھی احساس اور رقابت اور مقابلے کا بھی احساس۔ اس نئی نسل اور اس پرانی نسل سے ہٹ کر جن کے خلاف میں نے اپنے احساس بغاوت کا ذکر کیا ہے، باقی جو لمبا چوڑا گروہ ہے۔ اور جس میں سے بہت سے اب بھی زندہ ہیں اور لکھتے ہیں، انھیں اظہار کی آسانی کے لیے مردہ نسل بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ میرے لیے بس اسی حد تک ایک مسئلہ ہے جس حد تک مسافر کی راہ میں کوئی گلا سڑا درخت جو بیچ سڑک پر پڑا ہوا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔

میں نے اس پہلو سے کبھی نہیں سوچا کہ اگر سبز چڑیا نہ ملی تو کیا ہوگا؟ سبز چڑیا کا احساس بجائے خود کیا کم بڑی دولت ہے؟ احساس جو اس نئے عہد کا احساس ہے پچھلی نسلوں نے جس بنیادی بات کو غیر اہم سمجھ کر بھلا دیا تھا اسے ہم نئے لوگوں نے پھر اہم سمجھا ہے۔ اور اس کی معنویت کے انکشاف کی ٹھانی ہے مجھے سبز چڑیا نہ ملے گی تو اور کوئی ہمسفر ڈھونڈھ نکالے گا۔ یوں بھی ہو سکتا ہے اور یہ بات زیادہ جچتی ہے کہ پوری نئی نسل مل کر سبز چڑیا ڈھونڈ لے گی اور رکے ہوئے جہاز کے چلنے کا بندوبست کرے گی۔

●●●

افسانہ



انتظار حسین

یار اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔

"کیا؟"

"لطیفہ یا شکایت جو کچھ بھی سمجھو۔ ایک عامل کو اس کا ہمزاد سونے نہیں دیتا جب نیند آتی تو وہ آن دھمکتا کہ مجھے کام بتاؤ، عامل اسے دور دور کے کام بتاتا ہے ہمزاد چشم زدن میں وہ کام انجام دیتا اور عین اس وقت جب اس کی آنکھ لگتی آن موجود ہوتا کہ کوئی اور کام بتاؤ۔ عامل اس سے بہت تنگ تھا۔ آخر ایک دن اس نے جھنجھلا کر پاس کھڑے گھنگھریالے بالوں والے پالتو کتے کی طرف اشارہ کیا کہ اس کے بال سیدھے کر۔ ہمزاد اس کام سے لگ گیا مگر اس کام نے اسے الجھا لیا۔ بار بار کنگھے کے بال سیدھے کرتا اور بار بار وہ مڑ جاتے بس پھر ہمزاد رات بھر کتے کے بال سیدھے کرتا رہتا اور عامل اطمینان سے سوتا رہتا"

یاجوج یہ حکایت سن کر بہت محظوظ ہوا دونوں مل کر خوب ہنسے پھر یاجوج کو کچھ خیال آیا کہنے لگا "ہم تو آج ایسے ہی بول رہے ہیں جیسے ہمیں اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے لگتا ہے کہ آج کی رات ہم بس بول کر ہی گزار دیں گے۔"

"یاجوج" ماجوج بولا "ہمیں کبھی کبھی بولنا تو چاہیئے کہ ہمیں کم از کم یہ تو یاد رہے کہ زبان کس کام کے لیے بنی ہے۔"

یاجوج کو ماجوج کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کہنے لگا "ماجوج، بولنا کون سے کمال کی بات ہے بولتے تو سب ہی ہیں تمہیں خدا نے زبان دی ہے ہم بولنے سے بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔"

"بڑا کام تو ہم انجام دے نہیں پائے۔" ماجوج جل کر بولا "مگر اس چکر میں چھوٹے کام سے بھی گئے۔"

"میرے یار تھوڑا صبر کر، جو زبانیں اس دیوار کو چاٹنے کی سکت رکھتی ہیں وہ بول بھی سکتی ہیں۔"

"پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا جب ہم بولنے جوگے ہوں گے۔ فی الحال تو یہی لگتا ہے کہ ہم پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اس دیوار کو چاٹتے رہیں تا آنکہ موت ہمیں چاٹ لے" ماجوج رکا۔ پھر بولا "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہمیں موت بھی نہیں آئے گی جیسے ہم اس دیوار کو ازل سے چاٹ رہے ہیں" اور

ابد تک چاٹتے رہیں گے یہ کہتے کہتے اس نے تأمل کیا۔ پھر بولا "ہم بھی کسی عامل کے چکر میں آ گئے ہیں اس نے ہمیں کتے کے بال سیدھے کرنے پر نہیں لگایا، دیوار چاٹنے پہ لگایا۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے"؟ یاجوج ماجوج کا منہ تکنے لگا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" یاجوج بولا "دیوار نہیں چکر ہے۔"

ماجوج یہ سن کر بہت چکرایا، اس کا دل بیٹھ گیا۔ مگر جب اس نے ایک نظر دیوار پہ ڈالی تو اسے پتلا ورق پا کر اسمیں پھر سے حوصلہ پیدا ہو گیا۔ بولا "دیکھ یار اگر یہ چکر بھی ہے تو آج رات ہم اسے ختم کر دیں گے تو دیکھتا نہیں کہ ابھی اول رات ہے اور ہم نے کتنی دیوار چاٹ ڈالی ہے۔"

یاجوج اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار چاٹنے پر مستعد ہوا مگر ماجوج جما بیٹھا رہا۔ جمائی لیتے ہوئے بولا "یار روز کے اس چکر سے میں بہت بور ہو چکا ہوں۔ تو دیوار کو چاٹ، میں چلا۔"

"تو کہاں جائے گا؟"

"بس کسی الاؤ پہ جا کے بیٹھوں گا۔ ہاتھ تاپوں گا اور کہانی سنوں گا۔"

"یار واقعی کتنے دن ہو گئے کہ ہم نہ کسی الاؤ پہ جا کے بیٹھے نہ کوئی کہانی سنی" ایک دم سے کتنے بھولے بسرے الاؤ یاجوج کے تصور میں زندہ ہو گئے۔ بیچ میں دہکتی ہوئی آگ اور گرد بیٹھے ہوئے لوگ، ہر عمر کے کوئی جوان، کوئی بوڑھا، اور درمیان میں بیٹھا ہوا کوئی بزرگ کرامات کے جادو کے ساتھ کہانی کا جادو جگا رہا ہے۔

"یار، تو مجھے یہاں اکیلا چھوڑ جائے گا"؟

"پھر تو بھی چل۔"

یاجوج ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اسے ڈانواں ڈول دیکھ کر ماجوج نے ہوکا "یار چھوڑ اس چوتیا چکر کو، چار دن کے الاؤ پہ چلتے ہیں اور اس سے کہانی سنتے ہیں کتنے زمانے سے ہم نے اس بزرگ کے منہ سے کہانی نہیں سنی۔"

یاجوج پر ماجوج کی بات اثر کر گئی۔ وہ بس اٹھنے ہی لگا تھا کہ نظر دیوار پر جا پڑی۔ بس دیوار کو دیکھتے ہی اس کی نیت بدل گئی، "یار یہ پروگرام کل تک کے لیے ملتوی نہیں ہو سکتا۔"

"کل کیا ہو جائے گا جو صورت آج ہے وہی کل ہو گی۔"

"نہیں مجھے یقین ہے کہ آج ہم اس دیوار کو ضرور چاٹ ڈالیں گے، کل بالکل فارغ ہوں گے۔"

"چھوڑ یار کب سے ہم آج کل کر رہے ہیں۔ اس آج کل میں ہم نے عمر کی کتنی سہانی راتیں ضائع کر دیں۔"

"یار جہاں اتنی راتیں ضائع کی ہیں وہاں ایک رات اور سہی۔"

"اچھا اس شرط پر رکتا ہوں کہ بس آج کی رات اور ہم اس دیوار کو چاٹیں گے چاہے یا نہ چاٹے کل کی رات ہمیں یہاں نہیں لگانی۔"

"مان لی تیری شرط۔"

یہ شرط ہو جانے کے بعد دونوں سرگرمی سے اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیوار پر جھک گئے رات گئے تک دیوار چاٹنے کے بعد دونوں ایک ذرا دم لینے کے لیے رکے یاجوج نے دیوار کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ تو بالکل ورق بن گئی ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا کہ بس اب تو آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں مگر ماجوج کو نیند آنے لگی۔ بولا "یار یاجوج ذرا میں ایک جھپکی لے لوں۔ بہت نیند آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر بس وہ فوراً ہی سو گیا۔ اور خراٹے لینے لگا۔ اس کے خراٹوں نے عجب اثر پیدا کیا کہ یاجوج بھی اونگھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اب کون سا ایسا کام رہ گیا ہے کیوں نہ میں بھی ایک جھپکی لے لوں۔ اور وہ بھی سو گیا۔

یاجوج ماجوج دونوں جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے، آنکھ ان کی اس وقت کھلی جب سورج سر پر آ گیا، کیا دیکھتے ہیں کہ دیوار پھر اپنی ضخامت اور بلندی کے ساتھ ان کے سروں پر کھڑی ہے۔ دیکھ کر ان غریبوں کا جی ڈھے گیا۔

یاجوج ماجوج دن بھر ایسے ڈھے پڑے رہے جیسے کوئی دیوار ڈھے پڑی ہو جب شام ہوئی تب کہیں ان میں جان آئی۔ لست پشت اپنے ہوش و حواس درست کیے، یاجوج نے دیوار کی طرف دیکھا اور شام کے بڑھتے اندھیرے میں وہ دیوار اسے اپنے سر پر پہاڑ کی طرح کھڑی نظر آئی مگر یہ طے ہو چکا تھا کہ اب دیوار کو چاٹنا نہیں ہے

"ماجوج چستی سے کھڑا ہوا" چلو یہاں سے چلیں"

"کہاں؟"

"جاروت کے الاؤ پہ چلتے ہیں۔ وہاں پرانے یاروں سے ملیں گے اور اشر سے کہانی سنیں گے۔"

دونوں وہاں سے اٹھ جاروت کے الاؤ کی طرف چلے مگر وہاں پہنچے تو کسی کو دیکھا نہ الاؤ والے کو نہ ادھ جلی لکڑی، کچھ ٹھنڈی راکھ، کچھ ٹھنڈے کوئلے لگتا تھا ایک زمانے سے یہاں الاؤ گرم نہیں ہوا ہے، دونوں حیران یہ کیا ماجرا ہے' یاروں نے کیا کندی کہ الاؤ کو چھوڑ جا گئے۔

دیر بعد ایک آدمی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ رک کر پوچھا کہ بھائی آج کی شب یہاں الاؤ گرم نہیں ہوا۔

"الاؤ؟ کیسا الاؤ۔ یہاں تو کوئی الاؤ گرم نہیں ہوتا۔"

"اچھا جاروت کہاں ہے"۔

اس آدمی نے یاجوج ماجوج کو غور سے دیکھا" یہ کب کی بات کر رہے ہو۔ جاروت نے مدت ہوئی یہ ٹھیا چھوڑ دیا۔ وہ اب حویلی میں رہتا ہے، اس وقت آتش دان کے سامنے بیٹھا ہوگا۔"

"حویلی؟ وہ کیا ہوتی ہے۔"

آدمی نے پھر دونوں کو غور سے اور حیرت سے دیکھا " تم بالکل جنگلی لگتے ہو۔ حویلی کو نہیں جانتے کہ کیا ہوتی ہے۔"

"دیواریں بھی۔ اچھا تو جاروت نے دیواریں کھڑی کر لی ہیں" یاجوج ماجوج حیران رہ گئے پھر پوچھا۔

"اشر کہاں ہے؟"

"اشر؟ ... اچھا وہ بوڑھا قصہ گو۔ وہ تو زمانہ ہوا مر گیا۔"

"اشر مر گیا؟" دونوں نے تعجب سے پوچھا اور افسوس کرنے لگے۔ پھر پوچھنے لگے کہ "اچھا اشر کا بیٹا عمرام کہاں یار تھا کہاں گیا۔"

"ہے تو وہ یہیں مگر اس وقت فلم دیکھنے گیا ہوگا۔"

"فلم؟" یاجوج ماجوج بہت چکرائے۔

آدمی ہنسا " اب تم پوچھو گے کہ فلم کیا ہوتی ہے۔"

"نہیں، اب ہم کچھ نہیں پوچھیں گے۔" انھوں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا اور واپس ہو لیے۔

یاجوج ماجوج واپس اپنے ٹھیے پر آ گئے

"یار دنیا بہت بدل گئی ہے" یاجوج سوچتے ہوئے بولا۔

"یار کہاں سے کہاں پہنچ گئے" ماجوج تلخ سی ہنسی ہنسا " ہم یہاں دیوار چاٹتے رہ گئے وہاں یاروں نے دیواریں کھڑی کر لیں اور جھتیں پاٹ لیں۔" رکا۔ ٹھنڈا سانس بھرا اور دکھ بھری آواز میں بولا۔ "ہم تو دیوار کو نہ چاٹ سکے۔ دیوار نے ہمیں چاٹ لیا"

ہم نے اپنے کتنے روز و شب اس دیوار پر صرف کیے اور دیوار ہے کہ جوں کی توں کھڑی ہے۔" اس وقت یاجوج بھی بہت دکھی ہو رہا تھا

"روز و شب"۔ ماجوج نے ٹوکا "مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہماری ساری زندگی ایک لمبی رات ہے جس کے بیچ بیچ میں صبح محض ہمارے رات بھر کے کیے کرائے کو اکارت کرنے کیلئے آتی ہے۔"

"صبح" یاجوج بدمزہ لہجہ میں بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

"رات بہت ہو گئی ہے اب ہمیں سونا چاہیئے۔" ماجوج نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

یاجوج ماجوج بہت راتوں کے جاگے ہوئے تھے، سوچا تھا کہ لمبی تان کے سوئیں گے مگر چٹائیوں پہ لیٹتے ہی نیند غائب ہو گئی، دیر تک وہ کروٹیں بدلتے رہے

"یار، نیند نہیں آ رہی۔" یاجوج نے ایک لمبی جماہی لی اور اٹھ کے بیٹھ گیا

"مجھے بھی نہیں آ رہی۔" ماجوج بھی اٹھ کے بیٹھ گیا۔

یاجوج ماجوج اٹھ کے بیٹھ گئے تھے نیند تو آ نہیں رہی تھی' اب کیا کریں

"رات کیسے کٹے گی۔" ماجوج بولا۔

"باتیں ہی کریں۔"

"باتیں"۔ یاجوج افسردہ ہو گیا۔ "دیوار چاٹتے چاٹتے میری زبان اتنی زخمی ہو گئی ہے کہ زیادہ بول نہیں سکتا۔"

"میں تو صبح روز پھٹکری کے پانی سے غرارے کرتا ہوں اور پھر رات کو چراغ کا دیا ہوا مرہم لگا لیتا ہوں۔ میری زبان کو تو اس سے بہت

آرام آجاتا ہے۔"

"وہ تو میں بھی کرتا ہوں مگر یہ تو روز کا قصہ ہے۔ پچھلے زخم بھرنے نہیں پاتے کہ نئے زخم پیدا ہو جاتے ہیں۔ چشکر کالے کے غرارے اور شامل جراح کا مرہم زخموں کو کہاں تک بھریگے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"ویسے میرا خیال ہے" یاجوج سوچ کر بولا "میری زبان کچھ موٹی بھی پڑ گئی ہے۔"

"جب نہیں بولو گے تو زبان موٹی ہی پڑے گی، ہمارا باپ کہا کرتا تھا کہ بولتے رہو کہ گونگے نہ ہو جاؤ۔"

"ہے تو ٹھیک بات۔ مگر ایک وقت میں ایک ہی کام کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں ایک وقت میں ایک ہی لایعنی کام کیا جا سکتا ہے۔" ماجوج نے یاجوج کے بیان میں تھوڑی سی اصلاح کر دی پھر کہنے لگا "یار کبھی کبھی جب میں بولتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں بول نہیں رہا۔ دیوار چاٹ رہا ہوں۔"

یاجوج ماجوج کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے شک تھا کہ بولتے وقت اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ "یار اب سونا چاہیئے۔" وہ ہار کر بولا۔

یاجوج ماجوج ایک دفعہ پھر دراز ہوئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ یاجوج کو بے خوابی کے ساتھ عجب بے کلی ہو رہی تھی۔ بار بار اس کا منہ کھل جاتا اور زبان باہر نکل آتی۔ زبان کو وہ ہونٹوں پر پھیرتا، تالو سے رگڑتا۔ پھر منہ بند کر کے آنکھیں موند کے ساکت ہو جاتا مگر پھر اس کا منہ کھل جاتا اور وہ جماہی لیتا پھر زبان کو گردش دیتا، ہونٹوں پہ پھیرتا تالو سے رگڑتا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا بیکل ہو کے اٹھ کھڑا ہوا ایک لمبی سی انگڑائی لی اور چلا دیوار کی طرف۔

"کہاں؟" ماجوج نے ٹوکا۔

"یار نیند تو آ نہیں رہی۔ میں نے سوچا کہ چلو چل کے دیوار ہی کو چاٹیں۔"

"فائدہ؟"

"فائدہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری ناتواں زبانیں دیوار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

"پھر یہ لاحاصل عمل کیوں؟"

"یار مجھے تو اب سب ہی کچھ لاحاصل اور لایعنی نظر آتا ہے مگر ٹھالی سے بیگار بھلی۔ کم از کم رات تو کٹے گی۔"

یاجوج نے قدم آگے بڑھایا زبان نکالی اور دیوار کو چاٹنا شروع کر دیا۔ ماجوج بیٹھا تکتا رہا۔ دیوار چاٹتے یاجوج کو تکتے تکتے اس کی زبان میں کھجلی ہونے لگی۔ کیوں نہ میں بھی دیوار چاٹنی شروع کر دوں۔ ہے تو یہ مہمل عمل مگر زبان کی کھجلی تو جائے گی اور ماجوج بھی اپنی لمبی زبان کے ساتھ وہاں پہونچا اور دیوار کو چاٹنے لگا۔

رات ڈھلنے لگی تھی کہ یاجوج تھک کر ذرا سانس لینے کے لیے رکا۔ اس نے نظر بھر کر دیوار کو دیکھا اور بہت مطمئن ہوا۔ دیوار چٹ چٹ کر پتلی ورق جتنی رہ گئی تھی۔ اس نے ماجوج کو ٹوکا "دیکھتا ہے دیوار کا تو آج ہم نے پھر کس نکال دیا ہے اب اس میں رہ کیا گیا ہے۔"

"ہاں ہم نے دیوار کو بہت چاٹ لیا ہے مگر میں ڈر رہا ہوں۔"

"کس بات سے؟"

"اس سے کہ کہیں پھر صبح نہ ہو جائے۔"

یاجوج سوچ میں پڑ گیا "یار تو ٹھیک کہتا ہے۔ پھر کیا کیا جائے"

"ہم سوائے دعا کرنے کے کیا کر سکتے ہیں۔"

پھر یاجوج ماجوج نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ "اے ہمارے رب تیری بخشی ہوئی لمبی اور بھری رات ہمارے لیے بہت ہے صبح کے شر سے ہمیں محفوظ رکھ اور اجالے کے فتنے کو دفع کر۔"

●●●

جدید اردو افسانے (بقیہ صفحہ ۴۳ سے آگے)

ان کو ایک نئی مرکزیت حاصل رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ اب اردو افسانے کے ایک نئے دور کے آغاز میں بہت دیر نہیں ہے

یہاں میں نے آپکے سامنے صرف چند نمایاں رجحانات کا ذکر کیا ہے ان میں چند رجحانات کا اور اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نگاروں کے افسانوں کے حوالے سے ان رجحانات کی مثالیں دیکر ان کی وضاحت کی جا سکتی ہے لیکن یہ کام پھر سہی۔

●●

ایک جھیل کے کنارے

افتخار عارف

سمندر کے کنارے سیپیاں چنتی ہوئی لڑکی نے پوچھا
بتاؤ تو سہی اے افتخار عارف تمھیں کیا ہوگیا ہے
اپنی ہی آواز سے ڈرنے لگے ہو
اپنے ہی سائے سے گھبرانے لگے ہو
اپنے ہی چہرے سے شرمانے لگے ہو
بتاؤ تو سہی آخر تمھیں کیا ہوگیا ہے
چلو ہم نے یہ مانا یہ زمانہ اب ہمارے تمھارے بس کے باہر ہو چکا ہے
ان دنوں میں بے حسی کے موسموں میں دل کا خون ہونا مقدر ہو چکا ہے
مگر اس مہرباں بستی میں وہ آنکھیں تو ایسی ہیں کہ جن میں کوئی اندیشہ نہیں ہے
اور جن کے خواب یکساں ہیں
بہت مبہم سی تعبیر کا امکان تو ہے
یہ شب گذرے نہ گذرے صبح پر ایمان تو ہے

تو پھر اے جانِ جاں! ویران کیوں ہو؟
اس قدر شاداب آنکھیں جب دعاگو ہیں تو اتنے بے سروساماں کیوں ہو؟
بتاؤ تو سہی آخر تمھیں کیا ہوگیا ہے؟
اپنی ہی آواز سے ڈرنے لگے ہو، اپنے ہی چہرے سے شرمانے لگے ہو، اپنے ہی سائے سے گھبرانے لگے ہو
سمندر کے کنارے سیپیاں چنتی ہوئی لڑکی نے پوچھا
بتاؤ تو سہی اے جانِ جاں! آخر تمھیں کیا ہوگیا ہے؟

حافظے کی بازیافت

زوال اور شخصیت کی موت

محمد عمر میمن

مارسل پروست اپنے ضخیم ناول ALA RECHERCHE DU TEMPS PERDUE کی پہلی کتاب کا خاتمہ انتظار حسین کی زبان میں اس جملہ پر کرتا ہے[1] "کسی خاص شکل کو یاد کرنے کے معنی ہیں کسی خاص لمحہ کا افسوس کرنا۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ گھر اور گلیاں اور کوچے بھی گزرتے برسوں کی مثال گزرتے چلے جاتے ہیں۔" محسوس ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے زیادہ تر، اور یقیناً بہتر، افسانے ان چہروں، ان چیزوں، اور ان لمحوں کو یاد کرنے کے عمل سے وابستہ ہیں جنہیں وقت نے ہم سے دور کر دیا ہے۔ بظاہر یاد کرنے کا یہ عمل تضییع اوقات کی ایک شکل ہی نظر آئے گا۔ بلکہ بہت سوں کی نگاہ میں اس کی حیثیت ماضی سے ایک مریضانہ وابستگی سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ لیکن یہ ایک جہل، بے معنی یا مریضانہ عمل نہیں۔ اس کی گہری معنویت کا طلسم اس وقت کھلتا ہے جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ میگیل اونامونو کی طرح خود انتظار حسین کی دانست میں بھی "یاد" انفرادی حیثیت کی بنیاد ہے۔[2] یادداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا — وہ ماضی جو جڑوں اور بنیادوں کا استعارہ ہے اور ماضی کے بغیر خود حال کی اہمیت ایک غیر متشخص و محدود لمحے سے زیادہ نہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو، انتظار حسین "ہمارے عہد کا ادب" مطبوعہ "سویرا" نمبر ۳۴، صفحہ ۴

[2] MIGUEL DE UNAMUNO کہتا ہے "MEMORY IS the basis of individual personality, Just as tradition is the basis of the collective personality of a people, we live in memory and by memory and our spiritual life is at bottom simply the effort of our memory to persist, to transform itself into hope." دیکھیے THE TRAGIC SENSE OF LIFE مطبوعہ THE FONTANA LIBRARY LONDON، صفحہ ۲۸

چنانچہ یاد کرنے کے معنی ہیں اپنی ذات کے ابتدائی ترکیبی کی شیرازہ بندی کرنا اور شیرازہ بندی کے نتیجے میں حاصل شدہ اس ذات کو ایک ناقابلِ تردید استناد، ایک تہذیبی انفرادیت کا وقار بخشنا
شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے تخلیقی عمل میں انتظار حسین "ماضی" کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے نہیں کہ "ماضی" ایک مردہ گم شدہ کوئی بے مصرف چیز ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ یہ حال و مستقبل کے جملہ امکانات اپنے میں سموئے ہوئے ہے، ان میں نافذ ہے اور ان کے کردار کی تراش خراش کا ایک اہم تعیین کنندہ ہے، اور اس عمل کے ذریعے تہذیبی شخصیت کی تلاش کا نقطۂ آغاز بھی۔ قومی یادداشت، ماضی اور حال/مستقبل — یہ تینوں اجزاء ایک ہی سلسلے میں منسلک ہیں۔ حافظہ نہ ہو تو ماضی کا سراغ کیا، اور ماضی کا عرفان نہ ہو تو حال/مستقبل کی حد بندی کیا۔ یہ عمل ظاہر ہے محض ایک غیر محدود، بے نام و نشان سے حال میں نسبت کرنے سے جاری ہو سکتا ہے۔ بہ حاصل بدقسمتی کہہ لیجئے کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعے اردو ادب میں سماجی حقیقت پسندی کی بے محابا غلبت کے سبب اردو کا افسانوی ادب اگست ۱۹۴۷ء تک ایک ایسا اردو ادب رہا ہے جو خود اپنی روایت سے عاری اور گریزاں ہو رہا اور اگر پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا تو امکان یہی تھا کہ اپنے عنصر سے بچھڑا ہوا یہ ادب اپنی موجودہ دو لا بانزاد پہ بے پرواہ یوں ہی جاری و ساری رہتا۔

اس بیان سے عجلت میں شاید یہی نتیجہ نکالا جائے کہ ایک قطعی اور محسوس تبدیلی تقسیم کے ساتھ، فی الفور لکھنے والوں کے جذبات، خیالات اور رجحانات میں در آئی، کچھ اس طرح کہ وہ گمراہی کی دلدل سے پلک جھپکتے ہی نجات کو لیجانے والی صراطِ مستقیم پر پہونچ گئے، ادب اور ادبی رجحانات میں ایسے معجزے نہیں رونما ہوا کرتے۔ کرشن چندر کی مثال ہی لے لیجئے، یا ان کے پرستار اور ہمزاد خاکہ صاحب کی — یہ لوگ تقسیم کے بعد بھی اسی رومان پسندانہ سماجی حقیقت پسندی کا شکار رہے جس کا ماقبل تقسیم، رہے تھے اسی قسم کی فارمولا کہانیاں اب بھی لکھتے رہے جیسی پہلے لکھتے رہے تھے یہ فارمولا بجز اس کے اور کیا تھا کہ آدمی کو اپنی فطرت میں معصوم سمجھا جائے اور اگر اس میں غلط کاری اور گناہ کا شائبہ دریافت کر بھی لیا جائے تو اس کی تمام تر ذمہ داری سماج پر عائد کر دی جائے۔ ایک لحاظ سے دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ تقسیم اور اس کے ہم رکاب آئے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات نے بجائے انسان کی فطرت کی بنیادی شر داری کو تقویت دی، مردود بنے کے، بہت سے ہر دلعزیز اور مقبول عام لکھنے والوں کو وہی پرانا راگ الاپنے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا نتیجتاً، سرحد کے اس پار بعض مسلمان دوشیزاؤں کی عصمت کے اتلاف دار بعض ہندو ہیں، اور اس پار چند ہندو کنواریوں کے ناموس کو ہم کی آبرو داری پر چند متقی مسلمانوں نے آنچ نہ آنے دی۔

تخلیقِ پاکستان نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف ایک سمت کا پتہ دیا، ایک روشن مستقبل کی امید دی، بلکہ ایک ماضی بھی اور اس ماضی کو کھوجنے، اپنی رگوں میں محسوس کرنے اور اہم تر یہ ہے کہ اسے سمجھنے کی خواہش بھی۔ چنانچہ اب پہلی بار ادب میں قوم پرستی، دل سوزیٔ وطن، معاشرتی اصلاح کی تفصیل کے بلند بانگ موضوعات کے ہمراہ، ایک اور بالکل ہی انوکھا موضوع بھی نظر آنے لگا۔ اس موضوع کی اساس "ہجرت کے تجربہ" پر تھی۔ انتظار حسین ہجرت کے تجربے کو تخلیقِ پاکستان کے بعد آنے والے دور کے اہم ترین اور غالب ترین تجربے کا نام دیتے ہیں[3]۔ اہم ترین اور غالب ترین مقداری اعتبار سے نہیں بلکہ ماہیتی اعتبار سے، کیونکہ دوسرے موضوعات کی سیاسی اب بھی باقی تھی۔

پاکستان کے بہت سے لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیت کو ہجرت

۲۱؎ اس نکتے کو خود انتظار حسین نے نہایت وضاحت کے ساتھ اپنے ان دو مضمونوں میں بیان کیا ہے، "ہمارے عہد کا ادب" مطبوعہ "سویرا" نمبر ۳۱ صفحہ ۸ تا ۱۷ اور "اردو کا مختصر افسانہ پاکستان میں" مطبوعہ "سیپ" ۱۲ رفاعی نمبر ۱ صفحہ ۲۷۵ تا ۳۰۰

۲؎ اس نکتے کی وضاحت کیلئے بھی نوٹ ۲۱ کے زیر آئے ہوئے حوالے دیکھیے۔

۳؎ ملاحظہ ہو "ہمارے عہد کا ادب" مطبوعہ "سویرا" نمبر ۳۱، صفحہ ۸ تا ۱۷

کے اس نئے تجربے نے ایک نیا نقطۂ ارتکاز دیا۔ انتظار حسین کو اس نے پرتو خیر دیا ہے، وہ شعور اور احساس بھی ودیعت کیا جس کی مدد سے ایک گم شدہ دنیا اچانک پھر سے اپنے خط و خال کے ساتھ نکھر آنے لگی اور از سرِ نو بامعنی بن گئی۔ "گلی کوچے"، "کنکری"، "آخری آدمی" اور اب "شہرِ افسوس" کے بیشتر افسانے ایک گم شدہ دنیا کو، یاد کے سہارے، ایک بار پھر سے پا لینے کی صریح کوششیں ہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر ایک آوارہ خوشبو کے تعاقب اور بازیافت کی کوششیں!

انتظار حسین کی تخلیقی دنیا اپنی تمام تر قوت نمو اس دھارے سے پاتی ہے جو روایت کی کوکھ سے پھوٹا ہے اور یہ روایت بذات خود مختلف النوع اجزائے ترکیبی کا مجموعہ ہے۔ یہ مختلف النوع اجزائے ترکیبی ——— یعنی: یادیں، خواب، کدورتیں، بسرے، انبیاء کے قصے، دیومالا اور توہمات ——— ایک پوری قوم کے اجتماعی مزاج، اس کے کردار اور شخصیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ قوم مسلمانوں کی قوم ہے جو برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے آباد ہے۔ اس شخصیت کو اس کی پوری تہ داری کے ساتھ گرفت میں لانے کے لیے ان اجزائے ترکیبی کا عرفان اور شناخت ناگزیر ہے۔ انتظار حسین کا سارا فن دراصل اسی عرفان کو پالینے سے عبارت ہے۔ لیکن کس طرح؟

مثال کے طور پر ان کی کہانی "سیڑھیاں" کو لیجیے۔ یہ ان کے تازہ ترین افسانوی مجموعے "شہرِ افسوس" میں شامل ہے۔ جہاں تک کہانی کے محسوس جسم اور ضخامت کا تعلق ہے تو یہ بہت دبلا پتلا سا ہی ہے۔ ایک جملے میں یوں کہا جاسکتا ہے بلکہ محمد سلیم الرحمان کہہ چکے ہیں کہ "ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک فرد کے بچپن کی یادیں چند دوسرے لوگوں کے مکالموں سے متاثر ہوتی ہیں اور رنگ و روپ پاتی ہیں۔"[1] لیکن وہ بات جو اسی آسانی کے ساتھ ایک جملے میں نہیں کہی جاسکتی وہ یہ ہے کہ یہاں دراصل سارا معاملہ ایک خاص النوع نسبت کا ہے جو "خواب" کو "یادداشت" اور "یادداشت" کو "خواب" سے ہے۔ "خواب" ہی فی الواقع "یادداشت" کی بازیافت کا واحد ذریعہ ہے۔ خواب دیکھنے کی تخلیقی صلاحیت کا فقدان اور چنانچہ اشارتاً یا قصداً، یادداشت کا کم ہو جانا شخصیت کی موت ہے خواہ انفرادی سطح پر خواہ انفرادی سطح پر، خواہ اجتماعی سطح پر۔

کہانی کی ابتدا چار آدمیوں سے ہوتی ہے۔ یہ بشیر بھائی، اختر، اور رضی اور سید ہیں۔ اغلب یہی ہے کہ چاروں غیر شادی شدہ نوجوان ہیں اور ابھی حال ہی میں ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آئے ہیں۔ جس شب کا ذکر ہے اس شب چاروں کسی چھت پر، لالٹین کی مدھم اور پراسرار روشنی میں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہیں۔ اختر ابھی ابھی اپنا خواب بیان کر چکا ہے اور بشیر بھائی جو بقیہ لوگوں سے کسی قدر عمر میں بڑے ہیں، اختر کے بیان کردہ خواب کی تعبیر میں مصروف ہیں۔ ایک حد تک رضی بھی موجودہ صورتحال میں شامل اور اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ایک سید ہی ایسا ہے جو اس سے سراسر لاتعلق ہے۔ بقیوں کی طرف پیٹھ پھیرے، آنکھیں بند کیے وہ کسی طور سہی سو جانے کی فکر میں غلطاں ہے لیکن آوازیں اسے سونے نہیں دیتیں۔ چنانچہ وہ جھنجھلاہٹ سے کروٹ لیکر اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے "یار تم کمال لوگ ہو، اور اختر تو میں جانوں سوتا ہی نہیں۔ آدھی رات تک خواب بیان کرتا ہے۔ آدھی رات کے بعد خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ کیوں بھئی اختر تجھے سونے کی گھڑی دو گھڑی مل جاتی ہے؟"[2]

سید کو بتایا جاتا ہے کہ خواب دیکھنا تو بشر کی فطرت ہے۔ اگر یہ درست ہے تو خود اس کی فطرت کہاں زیر و زبر ہو گئی ہے؟ "آخر میں بھی تو ہوں" وہ پوچھتا ہے "مجھے کیوں خواب نہیں دکھتے؟" لیکن یہ درست نہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب سید بھی خواب دیکھنے پر قادر تھا۔ یہ وقت وہ تھا جب اس نے پاکستان ہجرت نہیں کی تھی۔

وہ پھر سوچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ بقیہ تینوں افراد از سر نو خواب اور تعبیر خواب میں پڑ جاتے ہیں، اب رضی کی باری

---

[1] ملاحظہ ہو "شہرِ افسوس" پر محمد سلیم الرحمٰن کا انگریزی تبصرہ جو PAKISTAN TIMES میں DOOMSDAY FICTION کے عنوان سے شائع ہوا تھا

[2] ملاحظہ ہو "شہرِ افسوس" مطبوعہ مکتبہ کارواں، لاہور [illegible]

آتی ہے وہ کہتا ہے۔

"وہ دن یاد ہے نا بھتر کھائی آپ کو کہ آپ نماز کے لیے اٹھے تھے اور مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج آپ سویرے کیسے اٹھ بیٹھے۔ اصل میں اس رات مجھے نیند نہیں آئی جانے کیا ہو گیا۔ رات بھر کروٹیں لیتے گزر گئی اور طرح طرح کے خیال وسوسے صبح کے ہونے میں ایک جھپکی سی آئی کیا دیکھتا ہوں کہ ..... " رضی کی زبان لڑکھڑانے لگی اور لہجے میں کپکپی سی پیدا ہوئی ... کہ ہمارا امام باڑہ ہے اور .... امام باڑہ ہے اور وہاں بڑا علم نکل رہا ہے بڑا علم، بالکل اسی طرح، وہی سبز لہراتا ہوا پٹکا، چمکتا ہوا چاندی کا پنجہ، ایسا چمک رہا تھا پنجہ۔ ایسا کہ میری آنکھوں میں چکا چوند ہو گئی۔ بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔"

(شہر افسوس، صفحہ ۶۶)

یہ بڑا علم اپنے سبز لہراتے ہوئے پٹکے اور چمکتے ہوئے چاندی کے پنجے کے ساتھ کوئی معمولی علم نہیں۔ یہ دراصل محرم کے سبط حسین کی بدی اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد کا مظہر ہے اور اس المیہ واردات کا جو آج سے تیرہ سو سال پہلے میدان کربلا میں واقع ہوئی تھی، گوشہ گمنامی سے نکال کر ٹھیک تاریخ کے اجالوں کے بیچ لے آتا ہے۔ یہ رمز کا اہتمام پہلا ہے یعنی علم کے ذکر سے اہم تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور یوں "ماضی" اور "حال" ایک ناقابل قطع رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ "حال" اور "ماضی" کا یہ غیر منفک انضمام یا تو پیوستگی دراصل علم کے ذکر سے پیدا ہوئی۔

کربلا کے المیے میں مضمر رمزیت اور اس رمزیت کا اس کی تمام تر وسعت اور جملہ انسلاکات کے ساتھ احاطہ تحریر میں لانا شاید یہاں نہ ممکن ہوگا، ساتھ ہی ساتھ اس خاص الخاص معنویت کو بھی جو مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے لیے واقعہ کربلا میں موجود ہے کیونکہ یہ سب جانی پہچانی باتیں ہیں اسی طرح یہاں واقعہ کربلا اور اس کے بعد سے متعلق تاریخی تفاصیل اور جزئیات کم و بیش صحت اور اسناد کو بھی موزوں بحث میں لانے کی ایسی کوئی ناگزیر حاجت نہیں۔ اہم بات یہ

واقعے کی HISTORICITY یا تاریخی وقوع پذیری ہے اور اس میں شک و شبہ کی مجال نہیں۔ پھر حقیقت کی نسبت زیادہ نہیں تو کم از کم "اعتقاد" تو ہوتی ہی ہیں: ایک تو یہ کہ کوئی واقعہ اصلاً کس طرح وقوع پذیر ہوا، دوسرے یہ کہ ماضی وقوع پذیری کے طور طریقے سے قطع نظر لوگوں نے تخیلاً اور اعتقاداً اسے کس طرح وقوع پذیر سمجھا۔ موخر الذکر تخلیق کار کے فن کے لیے اہم ترہے یا کم از کم انتظار حسین کی رائے میں اہم تر ہے وہ کہتے ہیں۔ اسلامی روایت ہو یا ہندو روایت میں بہرحال قدامت پسند ہوں اور تاریخی تنقید اور نفسیات سے زیادہ اس حقیقت میں ایمان رکھتا ہوں جسے عقیدت کے ذہن و تخیل نے جنم دیا ہے[ش]

درست پھر بھی اس کا اعادہ بے محل نہ ہوگا کہ علم کا MOTIF افسانے میں محض وقت کے درمیانی سرے یعنی "ماضی اور حال" کی درمیانی خلیج کو پر کرنے کے لیے ہی نہیں لایا گیا ہے تقسیم ہند کے سیاق و سباق میں جب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو بربریت کے لاتعداد مظاہرے ہوکر پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا کربلا کی المیہ واردات ایک نئی معنویت اور مناسبت اختیار کر لیتی ہے شاید انتظار حسین کی منشا یہ نہیں رہی ہے کہ "ماضی کی یاد" کو "ماضی پرستی" کا مترادف سمجھیں۔ وہ تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خود "حال" میں ماضی کو بڑا عمل دخل رہتا ہے کم از کم ان لوگوں کی نظر میں جو زندہ رہنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی اجتماعی شخصیت اور اس کے ذریعے اپنی انفرادی شخصیتوں کو بھی سمجھنا چاہتے ہیں۔ "ماضی پر اصرار کرنے سے" وہ کہتے ہیں۔ افسانہ نگار کا یہ مطلب نہیں ہوتا، یا کم از کم نہیں ہونا چاہیے کہ گئے دنوں کو واپس لایا جائے[ه] یا ایک اور جگہ "تم مجھے ریگستان میں چھوڑ دو گے تو میں خانہ کعبہ کھڑا کر دوں گا۔ اگر ہم اس نکتے کو سمجھ لیں تو پھر رونے دھونے کا سوال تو ختم ہو جاتا ہے۔ پرانی جنتوں کی یاد میں رونا دھونا۔ خواہ وہ جنت میرا بائی کی ہو یا تیر اور نظیر کی۔ جہاں یہ رونا دھونا نظر آئے تو سمجھو کہ یہ ہے پرانی نسل

ش۔ ملاحظہ ہو "ہمارے عہد کا ادب" مطبوعہ "سویرا" نمبر ۳۱، صفحہ ۱۶

ہ۔ دیکھیے "اجتماعی تہذیب اور افسانہ" مطبوعہ "نیا دور" نمبر ۱۵، صفحہ ۶۲

کی آواز اندر گا صرف یہ کہ تخلیق کا معاملہ جنت کو رد نا نہیں ہے بلکہ جنت تعمیر کرنا ہے[۱۰]۔

لیکن علم کا ایک پہلو، ایک بعد اور بھی ہے: نجی یا شخصی یا ذاتی پھر ایسا ذاتی بعد اور معنویت جو بلا شرکت غیرے صرف رمی اور رمی کے خاندان تک محدود اور اس کی ملکیت ہے، کیونکہ اس متعین اور محسوس علم کو، جس کا تذکرہ ہوا ہے جس کا انداز اور جس اعتبار سے رمی اور اس کے خاندان نے محسوس کیا ہے جس طرح اس کا تجزیہ کیا ہے کسی اور شخص یا خاندان نے نہیں کیا۔ قدرے وضاحت سے علم کی رمی اور اس کے خاندان کے لیے "ذاتی" معنویت کا ذکر نیچے کیے گا۔ فی الحال۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ انتظار حسین کی افسانوی دنیا میں "خواب" اور "حقیقت" کچھ اس الفت سے گلے مل کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں کہ انھیں علیحدہ کرنا اگر محال نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ زیر بحث افسانہ "سیڑھیاں" اس ادغام وارتقا اور ہم آہنگی کا صوفیانہ شاہکار ہے۔ خود افسانے کا عنوان — یعنی "سیڑھیاں" — ایک اور کہانی — پرچھائیں [۱۱] — کے ان لامتناہی اور متداخل پر اسراروں کے پیچیدہ سلسلوں کی طرح جھٹ پٹے کی اقلیم کی تھرکتی پرچھائیوں کے مابین وقت کے احساس سے یکسر معرا ایک تجربہ بن جاتا ہے جہاں "خواب" اور "حقیقت" شعور میں یکے بعد دیگرے بنا درمیانی وقفوں کے کچھ اس روانی سے آتے جاتے ہیں کہ ایک سے علیحدہ دوسرے کا وجود باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خارجی دنیا "خواب" میں مضمر، خلقی طور پر پوشیدہ تمام رموز اور معنویت کو اجاگر کرتی ہے اور بے جسم کی چھوٹی موٹی "خواب" معروضی حقیقت کو محسوساتی ڈھانچہ عطا کرتے ہیں۔ کچھ اس طرح کہ اس کے آسانی سے گرفت میں آ جانے والے ذرات بھی روز روشن کی طرح منور ہو جاتے ہیں۔

رمی کے لیے کم از کم اور شاید سید کے لیے خصوصاً اب یہ ممکن نہیں رہا کہ "خواب" اور "حقیقت" میں فرق کر سکیں یا یہ معلوم کر سکیں کہ کہاں، کس نقطہ پر آ کر "خواب" منقطع ہوا اور کہاں سے "حقیقت" کا آغاز۔ اچانک اس درد آگہی احساس کے ساتھ خواب دیکھنے کی صلاحیت اب اس میں نہیں رہی در آگئیں اس لیے کہ خوابوں کا گم ہو جانا صاف کہ ہم اور یہ کہہ رہے ہیں شخصیت کا انہدام ہے سید تو سے فکر پر پہلے ہی سو چکا ہے۔

"کیا وہ واقعی خواب نہیں ہے وہ پھر سوچنے لگا۔ تو پھر کیا اس کی ساری زندگی ہی خوابوں سے خالی ہے اسے کبھی کوئی خواب نہیں دکھائی دیا؟ اس کے تصور نے فضائے یاد میں تیرتے پھلتے کرتے کئی ایک گاؤں کو چٹکی میں پکڑا، مگر پھر اسے یاد آیا کہ وہ خواب تو نہیں اصلی واقعات ہیں اس نے اپنی پوری پچھلی زندگی میں نگاہ دوڑائی ہر واقعے میں ہر گوشے میں ایک خواب کی کیفیت دکھائی دی، مگر کوئی خواب گرفت میں نہ آ سکا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ خواب اس کے ماضی میں رل مل گئے ہیں یا وہ کوئی ابرق ملا گلال ہے کہ روشنی کے ذروں نے اس میں دمک تو پیدا کر دی ہے مگر وہ الگ نہیں چنے جا سکتے۔ یا امام باڑے میں ٹنگے ہوئے جھاڑ کی کوئی ہنڈیلی ہے کہ باہر سے سفید، اندر رنگ ہی رنگ جنھیں باہر نہیں نکالا جا سکتا، یا کنویں کی گہرائی میں چمکتا کالا پڑتا پانی کہ دونوں میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔

(شہر افسوس" صفحہ ۸۸)

اور لمحہ بھر بعد۔

"اب اتنے طویل خواب کے بعد کوئی کیا خواب دیکھے۔ وہ پھر بڑبڑانے لگا۔ مجھے تو اپنا وہ مکان؟

---

[۱۰] ملاحظہ ہو "خوشبو کی ہجرت"، (شیخ صلاح الدین، انتظار حسین، ناصر کاظمی اور حنیف رامے کے درمیان ایک مکالمہ) مطبوعہ "سویرا" نمبر ۱۸-۱۹، صفحہ ۲۲۱

[۱۱] یہ کہانی انتظار حسین کے افسانوی مجموعے "آخری آدمی" مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور میں شامل ہے

ایک خواب سا لگتا ہے۔ نیم تاریک زینے میں چلتے ہوئے لگتا کہ سرنگ میں چل رہے ہیں ایک موڑ کے بعد دوسرا موڑ، دوسرے موڑ کے بعد تیسرا موڑ، یوں معلوم ہوتا کہ موڑ آتے چلے جائیں گے سیڑھیاں پھیلتی چلی جائیں گی کہ راستے میں ایک دم کھلی روشن چھت آ جاتی۔ لگتا کہ کسی اجنبی دیس میں داخل ہو گئے ہیں۔ ۔ کبھی کبھی تو اپنی چھت پر عجب ویرانی سی چھائی ہوتی۔ اونچے والے کوٹھے کی منڈیر پر کوئی بندر اونگھتے اونگھتے سو جاتا جیسے اب کبھی نہیں اٹھے گا۔ پھر بھی ایک ساتھ جھرجھری لیتا اور کوٹھے سے نیچے کی چھت پر اور نیچے کی چھت سے زینے کی طرف۔ ۔ ہم دونوں کا دل دھڑکنے لگتا وہ آہستہ آہستہ اندھیرے زینے کی سیڑھیوں پر اترتا رکتا نیچے آیا۔ ہم دالان کے ستون کے پیچھے چھپ گئے۔ کنویں کی منڈیر پر جا بیٹھا...... بیٹھا ہا... پھر غائب ہو گیا یا شاید کنویں میں اتر گیا ہو۔"

(ایضاً صفحہ ۸۱)

اب اس تجربے سے، یا داتی تجربے کی طرف آتا ہوں جو راضی اور اس کے خاندان والوں کو علم کے توسط سے حاصل ہوا ہے جیسا کہ کہہ چکا ہوں، یہ علم کوئی معمولی علم نہیں ہے۔ یہ اپنے ایک چھوٹے سے وجود میں ایک پوری کتھا ہے۔ ایک نہایت شخصی تو دنیا مرجس میں اعتقادات، رسوم، توہمات اور دیو مالا سب مل جل کر مشرقی یوپی کے کسی شہر کے ایک شیعہ سید گھرانے کی زندگی کا نقشہ تخلیق کرتے ہیں یعنی وہ "حقیقت" بلکہ صداقت کہیے، جو بقول انتظار حسین تاریخی تحقیق اور دقت بینی سے ماورا ہوتے ہوئے بھی۔ اور شاید اسی وجہ سے بڑی حقیقی چیز ہے کیونکہ اس کو جنتا نے مل جل کر خلق کیا ہے

خارجی اعتبار سے علم زیادہ سے زیادہ ایک شے ہے

جیسے ماں لیا کہ محرم کے لوازمات میں سے ایک ضروری چیز جس کے بغیر محرم بطریق احسن منایا جا سکتا ہے نہ تعزیے کا جلوس نکالا جا سکتا ہے لیکن باطنی اعتبار سے ہجرت سے قبل کے رضی کے آبائی شہر کے امام باڑے میں اس کی موجودگی بڑی اہمیت اور معنویت کی حامل ہے۔ کیونکہ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں، منت کا علم ہے، رضی کی والدہ کے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ کربلائے معلیٰ گئیں جہاں وہ امام کی درگاہ میں رات بھر ضریح کو پکڑے دعا مانگتی رہیں۔ ۔ والدہ نے کہا جو ہو سو ہو، درگاہ سے گود بھر کے جاؤں گی... ۔ تڑکے میں ایک ساتھ آنکھ جھپک گئی کیا دیکھتی ہیں کہ درگاہ میں تیرہ داخل ہو رہا ہے.. سامنے علم پر نظر پڑی۔ پنجے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور ایک تازہ چنبیلی کا پھول والدہ کی گود میں آ پڑا۔"

(شہر افسوس صفحہ ۷۳)

بعد ازاں وہ ہندوستان لوٹی ہیں۔ اور چاندی سے اس پھول کو مس کر کے یہ علم بنواتی ہیں۔ اور اسی سال رضی کی ولادت ہوتی ہے۔ شاید ان تمام منتوں اور سماجتوں کے نتیجے میں جو اس کی ماں نے امام کے روضہ پر کی تھیں۔

چنانچہ یہ علم محرم کے لوازمات میں سے ایک تو ہے ہی لیکن اس کے علاوہ یہ رضی کے لیے ایک نہایت ذاتی معنویت کا حامل بھی ہے علاوہ برایں، اس کی اہمیت کی ایک وجہ اور بھی ہے: انجام کار جب رضی کا خاندان پاکستان ہجرت کا فیصلہ کرتا ہے تو رضی کی والدہ جانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ وہ اپنے آبائی امام باڑے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ اور ہوں بھی کیسے کہ اس میں اجداد کی ادبانی یادیں مدفون ہیں۔ انھیں چھوڑ دیں تو زندگی بے معنی ہو جائے یوں دیکھیے تو امام باڑہ ایک صرف و محض عمارت سے ارتفاع پا کر ایک جماعتی اور معاشرتی حقیقت کا استعارہ بن جاتا ہے اسے چھوڑ دیں تو بہ ظاہر جسم خاکی کی امان کا سامان تو ہو جائے گا لیکن اسے چھوڑ کر جو زندگی ہاتھ آئے گی وہ خود اپنے عنصر سے گریزاں زندگی ہو گی۔ رضی کی والدہ کا یہ رویہ خود افسانہ نگار کا رویہ بھی ہے اور شاید اسی لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی

ظاھری یا عقبی روزن سے ان کے اکثر افسانوں میں در آتا ہے۔ "سیڑھیاں" کے علاوہ یہ "اپنی آگ کی طرف" کے بے نام کردار میں بھی ملتا ہے اور "اندھی گلی" کی ننھی اماں بھی[12]۔

نتیجۂ سب ہجرت کر جاتے ہیں۔ صرف رضی کی والدہ پیچھے رہ جاتی ہیں تاکہ ہر سال محرم کے دنوں میں بڑے علم کا جلوس اپنی گزشتہ شان و شوکت سے نکلتا ہے۔ یہ وابستگی کوئی مریضانہ رجحان نہیں، یہ تو یادوں کی آب یاری کی حکایت ہے جس کی معنویت ان پر عیاں ہے جو "ہم دتو گریزم ار گریزم" کی حقیقت جانتے ہیں غرض چند سال یہ روایت جاری رہتی ہے پھر وقت رضی کی ماں کو اپنے میں سمو لیتا ہے۔ ان کی وفات والے برس ہی پہلی سب سے پہلی بار علم کا جلوس نہیں نکلتا! کیوں؟

اس "کیوں" کی بھی دو توجیہات ہیں: ایک بہت سادہ بسیط اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والی۔ دوسری مرکب اور تہ دار۔ آسان سی وجہ تو یہی ہے کہ رضی کی والدہ کے رخصت ہوتے ہی بڑا علم بھی بڑے معجزانہ طور پر غائب ہو جاتا ہے رضی کی زبانی سنئے۔

"ایک ہمارے پڑوسی ہیں۔
کہتے تھے کہ امام باڑے میں اس
رات کسی نے چراغ تک نہیں
جلایا۔ صبح کو نماز کو میں
اٹھا تو دیکھا کہ امام باڑے میں
کرسی کے سے روشنی ہو رہی ہے
صبح کو جا کے دیکھا تو یہ ماجرا
نظر آیا کہ سب علم رکھے ہیں
بڑا علم غائب ہے۔ ..."

(شہر افسوس، صفحہ ۷۶)

اور وہ جواب جو اتنا آسان نہیں ہے خود ایک سوال پر مبنی ہے چیزیں، اشیا اور جانور — یہ سب کیوں اور کیسے غائب ہو جاتے ہیں؟ "علم بہرطور ایک رمز ہے، اپنے سے وسیع ترمظہر یعنی "غیابہ" کا استعارہ۔ "غیاب" اور اس کا توام ظہور۔ دونوں کا تصور شیعیت کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور شیعیت کے سیاق و سباق ہی میں دراصل دونوں کی صحیح معنویت سمجھی جا سکتی ہے قبل اس کے کہ یہ پوچھا جائے: مذکورہ علم کیوں غائب ہوا؟ احسن یہ ہے کہ یہ پوچھا جائے۔ صرف سات ظاہر اماموں کے بعد ایسا کیوں ہوا کہ شیعی اسماعیلی امامت ظاہر سے باطن میں تبدیل ہو گئی؟ اور کیوں بارہویں امام محمد المہدی نہایت پراسرار اور معجزانہ طور پر "غائب" ہو گئے اور فاطمی خلیفہ نزار بن مستنصر بھی؟ یا شہر بانو، امام حسین کی ایرانی بیوی؟ جو امام کی وصیت کے مطابق ان کے گھوڑے پر بیٹھیں اور ایسی بیٹھیں کہ پھر نہ وہ کبھی نظر آئیں نہ گھوڑا[13] ظاہر ان تمام "غیابات" کے پیچھے خالص سیاسی عوامل کارفرما تھے۔ یہاں ان کے عوامل کی تردید مقصود ہے نہ ان سے نظر کشائی۔ اور کیا یہ حضرات واقعی طور پر "غائب" بھی ہوئے تھے بجائے خود عقل کو پردیگیدہ کر دینے والا سوال ہے لیکن یہاں تاریخی تفاصیل کی کم و بیش صحت و استقامت موضوع بحث نہیں۔ یہاں تو اس جذباتی اور تخیلی ردعمل کی جستجو ہے جو ان سیاسی عوامل سے پیدا شدہ واقعات کے نتیجہ رونما ہوا۔ اور "غیاب" جیسے تقریباً صوفیانہ ظاہراً توہماتی مظہر کی تلاش اگر کہیں کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ جذباتی اور تخیلاتی ردعمل کی نیم واضح، نیم تاریخ پراسرار فضا ہی ہو سکتی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ خود شیعیت نے یہ اور اس جیسے تصورات اور علیسائیت کی روایات اور قصے، کہانیوں سے جو ظہور اسلام کے وقت مشرق وسطیٰ کی فضا میں رلے ملے تھے حاصل کیے ہیں ایسی جگہ اہم سہی موجودہ سیاق و سباق میں مزید نہیں۔ سوال مذہبی یا مذہب سے متعلق روایات کے اخذ و اقتباس کا اتنا نہیں تھا ان اعتقادات کا ہے جو ان روایات۔

---

[12] اس افسانے کے لیے دیکھیے "شہر افسوس" صفحہ ۲۴۷ تا ۲۴۸
[13] اس حوالے کے لیے میں انتظار حسین کا ممنون ہوں

سے مُنو پاکر خون میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح اجتماعی شعور کا جزو لاینفک بنتے ہیں

اشخاص ہوں اشیاء یا کچھ اور شہر یا قوموں، علم ہو یا محمد المہدی ان کا "غیاب" اعتقادی طور پر عموماً دجال کی دراز دستی، شر، نا انصافی اور اخلاقی انحطاط کی وجہ سے جو ایک دور میں غالب آ جائیں عمل میں آتا ہے جب نیکیاں روگرداں ہو جائیں، حق پر عمل زہد اور باطل سے پرہیز نہ کیا جائے تو اعتقاد خود رہنے میں سمٹ کر ہی امان پا سکتا ہے۔ کیا عجب جو علم پراسرار طور پر "غائب" ہو گیا ہے۔

"غیاب" بھی انتظار حسین کے چند بنیادی استعاروں میں سے ہے اور بار بار اس کا ذکر آتا ہے، مثلاً "مُردہ راکھ" ہی کو لیجئے۔

> کہتے ہیں کہ اس برس سواری نہیں آئی تھی۔ یہ بڑا علم گم ہونے کے ایک سال بعد کا واقعہ ہے۔ بڑا علم پہلے گروی رکھا گیا تھا۔ پھر سونے کے کئی علم دیکھ اسے علین تو محرم کو چھڑا گیا۔ جب وہ سجا کر بلند کیا گیا تو دیکھا وہ سرخ انگارا ہو گیا ہے۔ سرخ انگارہ پنجہ پہلے بہت دیر تک تھراتا رہا۔ مولوی فرزند علی کا بیان ہے کہ اس سے خون بھی ٹپکا تھا پھر جب زیارت کے وقت اسے عزاخانے سے باہر نکالا گیا تو علم بہت زور سے کانپا اور پھر تفصل کے ہاتھ میں خالی چھڑ رہ گئی۔ بس اس کے اگلے برس یہ واقعہ ہو گیا تو اس برس عزاخانوں میں سواری نہیں آئی تھی
>
> (شہر افسوس، صفحہ ۸۴)

جب نیکیاں روگرداں ہو جائیں وغیرہ، تو "غیاب" عمل میں آتا ہے تقسیم ہند اور اس کے ہم رکاب آنے والی قیامت صغریٰ پر تصوراتی سطح پر دیکھئے تو ان واقعات اور اس فضا کی تکرار ہی تھی جو پہلے دور اموی اور ثانیاً دور عباسی میں رونما ہوئی۔ اور یہ شیعہ مفکر کے اور البشریت کا اولیٰ ترین کرشمہ ہے کہ سیاسی ہزیمت اور ناکامیابی کے ہر موقع اور ہر دور میں اس نے اگر کہیں طمانیت قلب اور تسکین حیات پائی ہے تو وہ ماورائے تاریخ META-HISTORY کا تصور ہے۔

ماضی کو بھلا دینا جیسا کہ میں نے اوپر ظاہر کرنا چاہا ہے خود اپنی قبر کو روندنے کے مترادف ہے تم سے علم کا "غائب" ہو جانا رفتہ کے لیے کسی چیز کے اٹل اور ناقابل منسوخ طور پر ختم ہو جانے کے مترادف نہیں۔ علم کی یاد آسیب کی طرح اس کے تعاقب میں ہے اور کسی المیہ دل کو دکھا دینے والے قافیے کی طرح بار بار اس کے شعور میں در آتی رہے گی یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک شیعیت کے ذہن میں ان الائم کی یاد تازہ ہے جو اس نے جھیلے ہیں۔ یا وہی وہ کچھ نہیں جنہیں آدمی اپنے وجود سے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو اور دنیا بخشیت میں کوئی جھول پڑے، سالم، توانا آگے چل پڑے کیونکہ یادوں کے بغیر ذات کو خود اپنی آگاہی باقی نہیں رہتی، اپنی انفرادی شخصیت اور اس کی معنویت کا شعور جانے دیجئے۔

لیکن "سیڑھیاں" رضی کی کہانی نہیں ہے۔ نہ اختر یا بشیر بھائی کی۔ یہ کہانی ہے تو سید کی ہے — وہ قابل رحم سید جس میں اب خواب دیکھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے، چناں چہ ایک لحاظ سے زندہ رہنے کی بھی۔ زندہ رہنے کی، مابعد الطبیعاتی اعتبار سے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، سید کو خواب اور تعبیر کے موجودہ شغل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو بس سو جانا چاہتا ہے۔ گو سو نہیں سکتا۔ آوازیں سونے نہیں دیتیں۔ امام باڑے کے لفظ کا ذکر ماضی کے پیکروں کے ایک سلسلے کو بیدار کر دیتا ہے اور یہ پیکر بالکل کسی سینمائی مونتاژ کی طرح خود کو ایک ناقابل گریز قوت کے ساتھ اس کے شعور پر مسلط کر دیتے ہیں، فی الفور اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں پوری کی پوری کھل جاتی ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے۔

> "ذہن کے اندھیرے میں ایک روزن کھلا تھا کہ ایک کرن اس سے چھن کر روشن لکیر بناتی ہوئی اندر پہنچ

رہا تھی۔ عزا خانے کے لوبان سے بسے ہوئے اندھیرے
میں چمکتے ہوئے علم، چاندی اور سونے کے ڈھو دیتے
ہوئے پنجے، سبز و سرخ ریشمی پٹکوں کے سنہرے روپہلی
گوٹ سے ٹنکے ہوئے کنارے، بیچ چھت میں آویزاں
وہ جھک جھک کرتا ہوا جھاڑ جس میں شیشے کی سفید
سفید کونے دار ان گنت کلیاں اٹک رہی تھیں،
جس کی ایک ٹوٹی ہوئی کلی نامعلوم طریقے پر جانے
کہاں سے اس کے پاس آ گئی تھی، باہر سے سفید اور
ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ پر لگا کر دیکھو تو
اندر سے بہت رنگ۔

(تہہ افسوس، صفحہ ۶۷)

عزا خانے کا اپنا ایک سحر ہے۔ ایک پرافسوس دلکشی محرم کے دس اور چہلم کے کچھ دنوں کے علاوہ سال بھر اس میں تالا پڑا رہتا ہے۔ طلسماتی، بھیانک، ناقابل فہم ——— عزا خانہ کبھی اسے اپنی طرف جذب کرتا ہے اور کبھی دفع کبھی سید کے دل میں اس کے پراسرار بطن میں چھپے طلاسم کو بے نقاب کرنے۔ ان کے راز کو پا لینے کی خواہش کچھ اس منہ زوری سے سر اٹھاتی ہے کہ وہ چپکے چپکے جھجکتے سہمے قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ کواڑوں کو دراڑوں سے اندر جھانکتے پر جب کچھ بھی نظر نہیں آتا تو بے طرح پھڑپھڑاتے دل کے ساتھ کواڑوں کو جوڑوں پہ پیر رکھ کر تالا لگی ہوئی کنڈی پکڑ دروازے سے اوپر والی جالی میں سے جھانکتا ہے۔ جھانکتا رہتا ہے یہاں تک کہ نظر اندھیرے میں سفر کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اور یک لخت کسی آوارہ شعاع کے پڑتے ہی اندرونی جھاگ کی کوئی ہفت رنگ کلی جھل مل جھل مل کرنے لگتی ہے اور رعب سے اس کے جسم پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے [۱۴]

عزا خانے سے زیادہ پراسرار اور تاریک البطن، گو شاید کم تر خوف زدہ کن تو وہ تہہ خانے تھا جس کی کھڑکی اندھیرے زینے میں کھلتی تھی۔ یہاں تک ایک قدیم کوڑیالے سانپ کی تصوراتی موجودگی نے تہہ خانے کو پر اسراریت کے رہے سہے اجزا بھی بخش دیئے تھے، ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے، کہ مصداق یہ سانپ کسی آج تک نظر نہ آنے کے باوجود تمام اہل خانہ کے خیالات میں ایک ناقابل تردید حقیقت کی طرح جاگزیں تھا، اور بندی ——— اس کے بچپن کی رفیق تو قسم کھانے کو تیار تھی کہ اس نے اپنی ننگی آنکھ سے اسے دیکھا ہے۔

عزا خانہ، تہہ خانہ، زینہ، پرانا کوہا کی کنواں جو جنوں بھوتوں کا مسکن تھا وہ میدان جو زینے کے روشن دان کے ماورا کہیں دور نظر آتا تھا۔ اور اس کے پرے درخت جہاں بندی کے کہنے کے مطابق وہ یا وہ گرفی آباد تھی جو کسی کو چاہتی اپنا جادوئی آئینہ دکھا کر قید کر لیتی ——— یہ تمام اجزا بذات خود کسی گہری معنویت سے معرا بھی ہوں تو مگر یکہ اس لحاظ سے اہم ہیں کہ اس سب نے مل کر اس شخصیت کو تشکیل دیا ہے جو سید ہے۔ یہ انتظار حسین کی ہی مہارت کا کرشمہ ہے کہ یہ اجزا سیج سچ کے بھری پیکروں کے ایک ایسے دل آویز سلسلے میں تبدیل ہو گئے ہیں جو زندگی کی ایک نہایت جان دار اور پراسرار حسیت سے معمور ہے آغوش۔ یہ علامتی پرچے کا کام بھی انجام دیتے ہیں جس کے آگے سید کے لڑکپن کی واردات طلسم دیوانگی، اوہام اور عہد طفولت کی کیفیتیں کے درمیان رہتے رہتے خود کو دہراتی ہیں

اسی نیم روشن، نیم تاریک، مرئی اور کبھی غیر مرئی فضا میں سید نے بندی کے لیے اپنے دل میں محبت کے اولین مبہم اور نیم وا سے چھوٹی موٹی جذبات محسوس کیے تھے۔ یہ انتظار حسین کی فنی پختہ کاری کا کرشمہ ہے کہ پورے افسانے میں اس کی محبت کا کہیں براہ راست ذکر نہیں آیا ہے لیکن اس کی پوری فضا اس جذبے کی حدت و خوشبو سے مملو ہے جو ایک نے دوسرے کے لیے محسوس کیا تھا۔ مثلاً

..... وہ نور سیڑھیاں اترنے لگے۔ اترتے اترتے
پہلے موڑ پہ وہ رکا اور اندھیرے زینے سے باہر
اس روشن دان میں دیکھنے لگا جس میں سے نظر آنے

---

[۱۴] [۱۵] دیکھیے "تہہ افسوس" صفحہ ۶۸ تا ۶۹

والا اس سے پھیلے ہوئے درخت ایک غیبی دنیا سی لگتے تھے۔

"ادھر مت دیکھو" بندی نے اسے خبردار کیا۔

"کیوں؟"

"ادھر ایک جادوگرنی رہتی ہے" وہ اپنی دہشت زدہ آنکھوں کو جھپکا کے کہنے لگی۔ "اس کے پاس ایک آئینہ ہے وہ آئینہ دکھاتی ہے وہ اس کے ساتھ لگ لیتا ہے۔"

"جھوٹی۔"

"اللہ کی قسم"

اس نے ڈرتے ڈرتے ایک مرتبہ پھر روشن دان میں سے جھانکا۔ "کہیں بھی نہیں ہے۔"

"ایسا میں دیکھوں" وہ روشن دان کی طرف بڑھی۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن روشن دان تک اس کا منہ نہیں پہونچ سکا۔ اس نے مچا جیت سے کہا "سیڑھی دکھا دے۔"

اس نے بندی کو اس انداز سے سہارا دیا کہ سیڑھی سے اس کے پیر اٹھ گئے اور چہرہ روشندان کے سامنے آ گیا اور اسے لگا کہ جیسے میٹھے پانی سے بھرا ڈول اس نے تھام رکھا ہے

(شہر افسوس" صفحہ ۱۰۷)

یا ایک اور جگہ :

اس نے جلدی سے منڈیر پر پڑا ہوا چمڑے کا ڈول سنبھال لیا "کنوئیں کا پانی پئیں گے۔ بہت ٹھنڈا ہوتا ہے" اور اس نے پھرتی سے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ رسی اس کی انگلیوں اور ہتھیلیوں کی حرارت کو گرماتی پھسلتی تیزی سے گزرنے لگی اور پھر ایک چھپاکا پانی کے ڈول کے ڈوبنے کا میٹھا سا شور ہوا جس سے اس کے سارے بدن میں مٹھاس کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جلدی جلدی بھرا ڈول کھینچنے لگے اور دلوں میں ایک عجیب سی لذت جاگنے لگی۔ میٹھے ٹھنڈے پانی سے بھرا ڈول جب باہر آیا تو پہلے بندی نے ڈول تھاما اور اس نے اوک سے جی بھر کے پانی پیا اور پھر ڈول تھام کے بندی کے گورے ہاتھوں کی اوک میں پانی ڈالنا شروع کیا۔ گورے ہاتھوں سے بنی ہوئی ڈھلوان گہری ہوتی ہوئی اوک، موتی سا پانی، پتلے پتلے ہونٹ۔ اس نے ایک مرتبہ پانی کی دھار اتنی تیز کی کہ کپڑے تر بتر ہو گئے اور گلے میں پھندا لگ گیا۔

(شہر افسوس، صفحہ ۱۰۸)

اور پھر زندگی میں پہلی بار اسے اور بندی کو دونوں ساتھ ساتھ گناہ کے خیال سے کانپ اٹھے تھے لیکن اب بندی کہاں ہے؟ اور وہ اس کا کنوارا جگمگاتا چہرہ؟ بچپن کے وہ مانوس چہرے وہ مناظر؟

تو وہ "ا منہ چہرہ کہاں گیا؟ وہ بندی جو کٹ کر کے جاتی تو دکھائی دیتا کہ پتنگ کٹ گئی" اور وہ "پتنگ کٹ کر چلتی تو لگتا کہ بندی رقص کے جا رہی ہے"۔ مسلسل گرنے والے ہجر کی یہ تصویر تو پہلے سے اس خواب میں، خود کشی جو سعید نے ہندوستان چھوڑنے سے قبل بھی دیکھا تھا۔

"اماں جی میں نے خواب دیکھا کہ میں زینے پر چڑھ رہا ہوں"

"پیغمبری خواب ہے بیٹا۔ ترقی کرو گے، افسر ہو گے۔"

"اماں جی خواب میں اگر کوئی پتنگ اڑتی دیکھے"

"نہیں بیٹا ایسے خواب نہیں دیکھتے"۔ اماں جی بولیں "پتنگ دیکھنا اچھا نہیں، پریشانی، آوارہ وطنی کی نشانی ہے۔"

"اماں جی، میں نے خواب دیکھا کہ جیسے میں ہوا کے زینے پر چڑھ رہا ہوں، چڑھتا چلا جا رہا ہوں، بہت دیر بعد

---

[1] دیکھیے "شہر افسوس" صفحہ ۱۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۲

"سیز آیا ہے۔ ادھر کوٹھا غائب ... ادھر میں کوٹھے پہ
اکیلا کھڑا رہ گیا ہوں اور پتنگ۔"
"نہیں بیٹا، یہ خواب نہیں ہے۔ اماں جی نے اس کی
بات کاٹ دی۔" دن بھر تو کوٹھوں چھتوں کو کھوندے
ہے۔ دہی سوتے میں بھی خیال رہو ہے۔۔۔ ایسے
خواب نہیں دیکھا کرتے۔"

(شہر افسوس، صفحہ ۷۵۔۲)

سید کی والدہ نے پورے خواب کو ایک آوارہ خیال سے تعبیر کر کے رفع دفع کر دیا۔ یہ خواب بھلا ہو سکتا ہے۔ دراصل وہ خوف زدہ تھیں اور حقیقت سے نظریں چار کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں کہ اگر اسے خواب سمجھ لیا جائے تو پھر اس کی تعبیر بے گھری اور آوارہ وطنی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن قسمت کے نوشتے کو محسوس کیا جا سکتا ہے نہ اس کی تردید۔ آوارہ وطنی کہ مقدر تھی، اپنے مقررہ وقت پر آ کر رہی۔ ہند تقسیم ہوا اور ہجرت اس کے ہم رکاب آئی۔ یہ تو تھا ہی تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس نے جہاں جڑیں سے ان کی یادوں کو بھی لوٹ لیا۔ وہ خواب سچا خواب تھا۔

پاکستان کی سرزمین پر اب سید ایک ایسا آدمی ہے جس کے پاس ماضی ہے نہ خواب، نہ یادیں، اور نہ جیناں چہ اس لیے، نہ کوئی شخصیت۔ اب اس کی ساری کوشش اس بات پر صرف ہوگی کہ جس طرح بھی ہو، جس قدر بھی ہو، وہ اپنے ماضی کی بازیافت اور اس طرح اپنی شخصیت کی بازیافت بھی کرے۔

میرے خیال میں انتظار حسین نے یہ افسانہ اپنی تخلیقی زندگی کے شاید اولین دور میں لکھا تھا۔ اس وقت جب ابھی تخلیقی عمل کے ذریعے یادوں اور شخصیت کی بازیافت کی کامیابی پر انھیں اعتماد تھا۔ ان کی تازہ کہانیاں ایک اور ہی کہانی کہتی نظر آتی ہیں: شخصیت کا آخری اور قطعی زوال، یاد کرنے کی صلاحیت کا فقدان اور انجام کار شخصیت کی موت۔

لیکن "سیڑھیاں" پر جاری ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔

بشیر بھائی، اختر اور رضی کی گفتگو کے صدقے سید کے شعور میں ایک روزن کھل گیا ہے اور اس روزن سے وہ اپنی پراگندہ مٹی کے ذرات کو ایک ایک کر کے چن سکتا ہے، ماضی از سر نو اس کی دسترس میں ہے اور یاد کرنے کے عمل کے خواب دیکھنے کی صلاحیت لوٹ آئی ہے کہانی کے اختتامی حصے میں اپنے ماضی کی بازیافت کے بعد سید خود کو بہت ہلکا محسوس کرتا ہے اور مطمئن بھی شاید اب پھر وہ ایک مکمل آدمی بن گیا ہے

سید نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں، رضی کی طرف
دیکھتے ہوئے پر اسرار لہجے میں بولا "میرا دل
دھڑک رہا ہے، کوئی خواب دیکھے گی آج" اور
اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔

(شہر افسوس، صفحہ ۸۳)

گو وہ عارضی طور پر اپنی حقیقت کی سوجھ بوجھ کھو بیٹھا ہے سید میں پھر بھی ذات، بات کا، خواہ کتنا ہی مبہم اور ضعیف کیوں نہ سہی، احساس ضرور باقی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت شعوری طور پر یادوں کے سہارے اپنی ماضی کی بازیافت کی خواہش کرتا ہے۔ یہ خواہش آگے چل کر ایک اور کہانی "اپنی آگ کی طرف" کے بے نام لیکن مرکزی کردار میں باقاعدہ مقاومت اور مزاحمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی اب خواہش کرنا بھی، جو پہلے محض ساعل تھا ایک مرحلہ ہے جس کی ایک قیمت ہے

"ب"، چلیے اس بے نام کے کردار کو اسی نام سے پکاریں کو یقین ہے کہ اپنی روایت سے کٹ کر نہ وجود سالم رہتا ہے نہ زندگی باقی۔ سامنے لیقینی فنا ہو تب بھی اپنی روایت سے انحراف کی کوشش خود ذات کی مکمل شکست و ریخت پر ہی ختم ہوتی ہے بچپن کے دو دوست جنہوں نے آگے بھی زندگی کا کچھ حصہ نہایت شدید لگاؤ کے ساتھ ایک بلند عمارت کے کمرے میں ساتھ ساتھ گزارا ہے، وقت کے ہاتھوں بچھڑ جاتے ہیں، گو قیام دونوں کا اب بھی ایک شہر میں ہے۔ ان کی ملاقات ایک بار پھر ہوتی ہے، بالکل اتفاقی طور پر، اس وقت جب وہ عمارت جس

میں "ب" مسلسل رہتا چلا آیا ہے ایک شدید آگ کی زد میں آجاتی ہے اور "ب" کا بچپن کا یہ دوست اس طرف نکل آتا ہے۔ وہ "ب" کو پہچان لیتا ہے اور آتش زدہ عمارت کو چھوڑ کر اس کے یہاں آ رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ "ب" کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا اور اپنے دوست کے پیہم اصرار کے جواب میں نہایت معانی انداز میں کہتا ہے۔

"شیخ علی ہجویری نے دیکھا کہ ایک بڑا پہاڑ ہے پہاڑ
میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آگ کے اندر ایک چوہا ہے
کہ سخت اذیت میں ہے اور ادھر ادھر دھنو چکر کاٹ
رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے وہ پہاڑ سے اور پہاڑ کی آگ
سے باہر نکل آیا اور باہر نکلتے ہی مر گیا۔" وہ چپ ہوا۔
پھر آہستہ سے بولا۔ "میں مرنا نہیں چاہتا۔"

(شہر افسوس" صفحہ ۲۰۳)

چوہے کی اس تمثیلی حکایت میں جانے کتنی عمیق روحانی حقیقتوں کے استعارے مجسم ہیں۔ "ب" کو یقین ہے کہ اس عمارت کے باہر وہ اور جو چاہے ہو سکے مگر "ب" نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف عمارت خود اپنے میں ایک اچھی خاصی دنیا کی وسعت، رنگ اور انعیاد کی حامل ہے۔ عمارت کیا ہے کو ہے پوری کائنات ہے، خود نگر و خود کفیل وجود۔ آگاہی اپنی بہت سی صداقتوں کی قائم مقام بھی مثلاً ایک قوم، معاشرہ روایت یا ملک یوں کہیے دراصل قبل از تقسیم مسلمانوں کی تہذیب اور مابعد اس کی ہزیمت مزید برآں یہ اپنے میں ایک عجیب سی پائیداری بھی لیے ہوئے ہے اور تبدیلی اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی:

"اس بلڈنگ میں رہنے والے اور لوگ بھی نئے نہیں تھے
منزل بہ منزل فلیٹ بہ فلیٹ تھے جن میں ہر قماش
کا آدمی آباد تھا۔ کوئی مقامی، کوئی مہاجر، کوئی کسی
دفتر میں کلرک، کوئی کسی کالج میں استاد۔ کوئی
صاحب اہل و عیال ہے کہ سال بہ سال بڑھتے ہوئے
خاندان کے ساتھ چھوٹی سی چھت کے نیچے سر چھپائے
بیٹھا ہے۔ کوئی چھڑا ہے کہ دن بھر مٹرگشت کرتا
ہے اور رات گئے تالا کھول کمرے میں پڑ رہتا ہے
کسی کا پنشن پہ گزارا ہے۔ کسی نے چھوٹا موٹا کاروبار
کر رکھا ہے۔ کسی نے انہیں اس بلڈنگ کی دوکان میں
سے کوئی دکان لے رکھی ہے اور جمی جمائی سجائے بیٹھا
ہے۔ ان دکانوں کا بھی خوب رنگ تھا۔ بعض دوکانیں
تو واقعی چلتی دکھتی تھیں۔ سجے ہوئے مال و اسباب
کی اسکیم بدلتی رہتی تھی۔ لیکن ایسی دوکانیں بھی تھیں جن
میں جو کفنت چھوڑ پڑا جو بوری کا جہاں رکھی ہے اور ابد
تک اسی طرح رکھی رہے گی۔ یا جیسے یہ دوکان کا مال
نہیں بلکہ اس عمارت کی پھپھوند ہے کہ لگ گئی سو
لگ گئی، اب اتر نہیں سکتی۔ مال و اسباب پر منحصر نہیں
یہاں کے بعض بوڑھے بھی اس عمارت کی پھپھوند لگنے
لگتے تھے۔"

(شہر افسوس" صفحہ ۱۹۲)

چنانچہ اگر عمارت کے اندر موت ہے تو بھی "ب" کو سوائے اپنے عنصر اپنی آگ کی طرف رجعت کے کوئی چارہ نہیں، کیونکہ باہر ایک اور موت اس کی منتظر ہے ہزار درجہ بھیانک اور اذیت ناک ہے۔

"ب" کی ایک اجنبی موت کے سامنے ہاتھ پاؤں ڈال دینے کے خلاف یہ جان توڑ مقاومت بدقسمتی سے انتظار حسین کی نئی کہانیوں میں بالکل گم ہو گئی ہے اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں۔ فنکار کی دوربین اور دور رس نگاہ آنے والے رویوں کی پہلے ہی سے پیش خبری دے دیتی ہے۔ اس مقاومت کے فقدان کو اور اس کے ہم رکاب آنے والی "پیر تسمہ پا" یاسیت کو قومی سطح پر دیکھیے تو کوئی خوش آئند اور حیات افروز صورت نظر نہیں آئے گی۔ جو نظر آئے گا وہ بھٹکے ہوئے لوگوں کا نقشہ ہوگا جن کے بارے میں قرآن کہہ چکا ہے۔

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝

(سورۃ البقرۃ، آیۃ ۱۷۱)

"شہرِ افسوس" اور "وہ جو کھوئے گئے" قرآن کے بیان کردہ لوگوں کے افسانے ہیں جو شخصیت کے زوال اور اس کی موت کا نہایت دل دوز منظر پیش کرتے ہیں خاص طور پر "وہ جو کھوئے گئے" میں شخصیت سچ مچ اپنی اٹل اور ناگزیر موت کو پہونچ جاتی ہے اور ماضی کی تمام تر یاد ناقابل بازیافت طور پر محو ہو جاتی ہے ساتھ ہی ذات کا سارا احساس بھی۔

چار بے نام آدمی ہیں انھیں باقاعدہ ایک خاص رمزی منصوبے کے تحت ناموں سے معرا کر دیا گیا ہے تاکہ انفرادی ذات کی گم کردگی کے احساس کو دو چند کیا جا سکے۔ شناخت کے لیے انھیں ان استیلے سے جو ان کے حلیوں میں ممتاز ہیں پکارا جاتا ہے مثلاً "زخمی سر والا"، "باریش آدمی"، "تھیلے والا" اور "نوجوان" اور یہ اس لیے کہ ان کے وجود کی موہومیت اور غیر حقیقی پن نہایت ڈرامائی انداز میں اجاگر ہو جائے۔

ان کے بارے میں ہمیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم کہ یہ کسی بہت شدید تعذیب کی حدود سے بھاگ نکلنے میں بصد دقت کامیاب ہو گئے ہیں۔ وغیرہ۔ گویا بہ الفاظ دیگر ان کی مثال اسی جو ہے جیسی ہے جو آتش زدہ پہاڑ سے بھاگ نکلا ہے۔ مگر یہ آ کہاں سے رہے ہیں؟ اور جانا انھیں کہاں ہے؟ ان تمام سوالوں کا کوئی معین اور بے کم و کاست جواب موجود نہیں اور اگر ہو بھی تو موجودہ صورت حال میں اس کی کوئی اہمیت باقی رہتی ہے نہ حقیقت۔ جواب اگر ڈھونڈنا ہی شرط ٹھہری تو یہ یقیناً موجودہ غیر حقیقی فضا میں ملنے سے رہا۔ اس کی بازیافت تو پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی پے بہ پے جلاوطنی کی داستانوں ہی میں ممکن ہے: اسپین میں غرناطہ سے، موجودہ اسرائیل میں بیت المقدس سے ہندوستان میں کشمیر اور جہاں آباد یعنی دہلی سے — ان تمام جگہوں سے جہاں انھوں نے عظمت آدم اور اس کے وقار کے نہایت ٹھوس اور نہایت دل آویز دستاویز چھوڑی ہیں — "زخمی سر والا" کہتا ہے: "میں اکھڑ چکا ہوں اب میرے لیے یاد کرنے سے فرق پڑتا ہے کہ وہ کون سی ساعت تھی اور کون سا موسم تھا اور کون سی بستی تھی:"[۱۰]

چنانچہ ان لوگوں کا قصہ ہے جن کا "حافظہ" گم ہو چکا ہے۔ اور حافظے کا گم ہونا بھی عذاب کی صورتوں میں سے عذاب ہے اور وہ اکثر قوموں پر نازل ہوا ہے[۱۱] موجودہ افسانے میں "حافظے کے گم ہو جانے کا اور نتیجتاً شخصیت کی موت کا المیہ ایک ضمنی واقعات کے ذریعے نہایت فنی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ چاروں اس شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔ وہ ایک بار دو بلد غرض کئی بار خود کو گنتے ہیں پہلے ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا پھر چوتھا۔ سب ہی گننے کے عمل دہراتے ہیں اور گنتی کے دوران گننے والا خود اپنے کو ہی گننا بھول جاتا ہے۔ انھیں اب صرف اتنا یاد ہے کہ ان میں سے ایک کم ہو گیا ہے لیکن یہ گم شدہ کون ہے؟ انھیں تو گم شدہ کا چہرہ تک یاد نہیں رہا۔ نہ یہ کہ اس کا نام کیا ہے اور نہ یہ کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اس ساری حکایت کا مطلب ایک ہی ہے۔ چاروں میں سے کسی کو بھی اب اپنی ذات کی واضح آگاہی نہیں رہی۔

آگے چل کر "زخمی سر والے" کو اچانک یہ خیال آتا ہے کہ گنتی لیتے وقت وہ شاید خود کو شمار کرنا بھول گیا وہ اپنے اس شک کا بقیوں سے ذکر کرتا ہے۔ باری باری ہر ایک کو اپنی بھی یہی غلطی معلوم ہوتی ہے اور ہر ایک یہی سوچتا ہے کہ گم شدہ آدمی فی الواقع وہی ہے۔

گم شدہ آدمی، چناں چہ حقیقی آدمی کی قامت کو پہونچتا ہے اور گوشت پوست کا حقیقی مرئی آدمی شعور کے گم ہو جانے کے نتیجے میں گھٹ کر ضیاں کے دودھیا اندھیروں اور عدم کی بے رنگ اقلیم میں زائل ہو جاتا ہے۔ اس المیے کو انتظار حسین کی زبانی سنئے "تب سب چکے ہی پڑ گئے اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آخر

---

[۱۰] دیکھیے "شہرِ افسوس" صفحہ ۲۶

[۱۱] ملاحظہ ہو "منیا اسم" (ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے درمیان ایک گفتگو)، مطبوعہ "نیا دور" نمبر ۸ — ۷، صفحہ ۸۸

کون ہے جو گم ہو گیا ہے۔ اس آن زخمی سر والے کو پھر وہ وقت یاد آیا جب گم ہو جانے والے آدمی کو ڈھونڈ کر لیٹ رہا تھا۔ کہنے لگا "اس وقت مجھے لگا کہ وہ آدمی تو کہیں کہیں ہے مگر میں نہیں ہوں۔"

بارلیش آپ نے بھلاتے ہوئے کہا "عزیز تو ہے"۔ یہ سن کر زخمی سر والے نے ایک ایک ساتھی کو یوں دیکھا جیسے اسے بارلیش کے بیان پر اعتبار نہیں آیا ہے۔ ایک ایک ساتھی نے اسے یقین دلایا کہ وہ ہے۔ تب اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ "چوں کہ تم نے میری گواہی دی ہے اس لیے میں ہوں افسوس کہ میں اب دوسروں کی گواہی پر زندہ ہوں"۔

اس پر بارلیش آدمی نے کہا "اے عزیز شکر کر تیرے لیے تیں گواہی دینے والے موجود ہیں ان لوگوں کو یاد کر جو تھے مگر ان کا کوئی گواہ نہ تھا۔ سو وہ نہیں رہے"۔

زخمی سر والا بولا "سو اگر تم اپنی گواہی سے پھر جاؤ تو میں بھی نہیں رہوں گا"۔

یہ کلام سن کر پھر سب جھکا گئے اور ہر ایک دل ہی دل میں یہ سوچ کر ڈرا کہ کہیں وہ تو وہ آدمی نہیں ہے۔ جو گم ہو گیا ہے اور ہر ایک اس مخمصے میں پڑ گیا کہ اگر وہ گم ہو گیا ہے تو وہ ہے یا نہیں ہے دلوں کا خوف آنکھوں میں آیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ڈرتے ڈرتے اپنا اپنا شک بیان کیا۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے کا حوصلہ بندھایا اور ایک دوسرے پر گواہ بنے۔ دوسرے سے گواہی لیکر اور دوسرے کی گواہی دیکر مطمئن ہو گئے۔ مگر نوجوان پھر شک میں پڑ گیا "یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ چوں کہ ہم ایک دوسرے پر گواہ ہیں اس لیے ہم ہیں"۔

وہ زخمی سر والا ہنسا۔ رفیقوں نے پوچھا کہ اے یار تو کیوں ہنسا۔ اس نے کہا کہ "میں یہ سوچ کر ہنسا کہ میں دوسروں پر تو گواہ بن سکتا ہوں مگر اپنا گواہ نہیں بن سکتا"۔

اس کلام نے پھر سب کو چکرا دیا۔ ایک دوسرے نے ان سب کو گھیرا اور ان سب نے نئے سرے سے اپنے آپ کو گننا شروع کر دیا۔ اس بار گننے والے نے گننے کا آغاز اپنے آپ سے کیا مگر جب گن چکا تو گڑبڑا گیا اور باقیوں سے پوچھا کہ "کیا تم نے اپنے آپ کو گنا تھا؟"

ایک نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو اور تیسرے نے چوتھے کو گھورا۔ آخر نوجوان نے سوال کیا کہ "ہم تھے کتنے؟"

اس سوال نے دلوں میں راہ کی۔ ہر ایک نے ہر ایک سے پوچھا "آخر ہم تھے کتنے؟" بارلیش آدمی نے سب کی سنی۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "عزیزو میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب ہم چلے تھے تو ہم میں کوئی گم نہیں تھا۔ پھر ہم گم ہوتے چلے گئے۔ اتنے گم ہوئے اتنے گم ہوئے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ پھر ہمارا اپنی انگلیوں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ ہم نے ایک ایک کر کے سب کو گنا، اور ایک کو گم پایا۔ پھر ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی چوک کو یاد کیا اور اپنے آپ کو گم پایا"۔

نوجوان نے ایک شک کے ساتھ کہا "تو کیا ہم سب گم ہو گئے ہیں؟"

بارلیش آدمی نے نوجوان کو غصے سے دیکھا جو سلجھی ہوئی ڈور کو پھر الجھائے دے رہا تھا۔ "کوئی گم نہیں ہوا ہے۔ ہم پورے ہیں"۔

نوجوان نے ان گروہ میں سے پھر سوال کیا "ہم کیسے جانیں کہ ہم پورے ہیں؟"

"کب کتنے تھے؟" بارلیش آدمی نے برہم ہو کر پوچھا

"جب ہم چلے تھے"

زخمی سر والے نوجوان نے گھور کر دیکھا "ہم کب چلے تھے؟"

(شہر افسوس، صفحہ ۲۲ تا ۲۴)

لیکن جہاں "سیر اور "ب" اپنی بازیافت میں کامیاب ہوتے ہیں وہاں "وہ جو کھوئے گئے" کے چاروں آدمی نامراد رہتے ہیں کہ یہ تینی اور واقعی طور پر کھو چکے ہیں۔ اپنی گذشتہ ذاتوں کی اب غیر مرئی پرچھائیوں سے زیادہ کچھ نہ ہوتے ہوئے، یہ بے چارے اب ایک دوسرے کی شہادت پر

(باقی صفحہ [illegible] پر)

غزلیں

احمد فراز

شعر کسی کے ہجر میں کہنا حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں، دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

ساری متاعِ ہستی اپنی خواب و خیال تو ہے
وہ بھی خواب کسی سے مانگیں اور خیال کسی سے

ایسے سادہ دل لوگوں کی چارہ گری کیسے ہو
درد کا درماں اور کوئی ہے کہنا حال کسی سے

دیکھو اک مورت نے دل میں کیسی جوت جگائی
کیسا سچا سچا لگتا ہے شہرِ ملال کسی سے

افتخار عارف

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے

اُس کو بات نہ پہونچے، جسے پہونچتی ہو
یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذاب دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے

وفا گمان ہی ٹھہری تو کیا ضرور کہ اب
لحاظ ہمسفری بھی سفر میں رکھا جائے

ہمیں بھی عافیتِ جاں کا ہے خیال بہت
ہمیں بھی حلقۂ نا معتبر میں رکھا جائے

عوامی خدمت کا خاموش سفر

"ہزاروں میل لمبا سفر پہلے ہی قدم سے شروع ہوجاتا ہے"۔ سیکڑوں سال پرانا یہ قول ایک مفکر کا ہے۔ جو سفر طویل اور مشکل ہوتے ہیں، ان میں شور وغل اور بلند و بانگ دعوے بہت دور تک ساتھ نہیں چل پاتے۔ مستحکم ارادہ ہی اس سفر کا پہلا قدم ہوتا ہے اور خود کو وقف کر دینے کا جذبہ ہی کسی منزل تک لے جاتا ہے۔

ہر سفر پورا ہوسکتا ہے لیکن خدمت ایک ایسا سفر ہے جو ایک بار شروع ہو جائے تو کبھی ختم نہیں ہوتا اور ایک فلسفہ حیات بنکر ہم سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے جواہر لال نہرو نے کبھی کہا تھا کہ ہمارے ملک کے عظیم ترین شخص (گاندھی جی) کی تمنا تھی کہ ہر آنکھ کے آنسو پونچھ دیئے جائیں۔ پتہ نہیں یہ ہمارے بس میں ہے یا نہیں لیکن جب تک کہ ایک بھی آنکھ میں آنسو باقی ہے اس وقت تک ہمارا کام ختم نہیں ہوگا۔ یہ عزم ہمارے بس میں ہے۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں ہر فرد کے دکھ درد کو جاننے اور اسے مساوی حیثیت اور سماجی انصاف دلانے کی مہم کوئی معمولی مہم نہیں رہی ہے۔ پھر بھی حکومت اتر پردیش نے پورے خلوص، لگن اور اعتماد کے ساتھ بیس نکاتی پروگرام پر عملدرآمد کی راہ میں بے مثل کامیابی حاصل کی ہے۔

خصوصی مربوط اسکیم کے تحت سال ۸۳-۱۹۸۲ میں ۴ لاکھ پندرہ ہزار ہریجن خاندانوں کو غریبی کی سطح سے اوپر لانے میں کامیابی • مربوط دیہی ترقی اسکیم سے گزشتہ سال دیہاتوں کے پانچ لاکھ ۵۶ ہزار خاندان مستفید • قومی روزگار پروگرام کے تحت ۴۴ر۴۱ کروڑ روپے کی رقم خرچ ہوئی اور پانچ کروڑ ۸۰ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار کی دستیابی • گندی بستی سدھار اسکیم سے ایک لاکھ ۹۰ ہزار افراد مستفید • مالی امداد کے ذریعے چھ ہزار پانچ سو پابند مزدوروں کی بحالی۔ • اب تک ۳۵ مواضعات اور بائیس ہزار پانچسو ہریجن بستیاں بجلی سے آراستہ۔ • پانچ ہزار چھ سو قلت زدہ مواضعات سمیت، ۱۹ ہزار مواضعات میں پینے کا پانی دستیاب۔ • گذشتہ سال ساڑھے ۴ لاکھ مردوں اور عورتوں کی نسبندی خاندانی بہبود اسکیم کی قابل ذکر کامیابی۔ • تمام ملک میں ۴۰ لاکھ ٹن کی گیہوں کی مجموعی فاضل پیداوار میں سے اتر پردیش میں ۲۴ لاکھ ٹن گیہوں کی سب سے زیادہ پیداوار۔ • سرکاری آبپاشی وسائل سے ۳ لاکھ ہکیٹر کی فاضل آبپاشی صلاحیت۔ • بجلی کی تنصیبی صلاحیت ۳۷۹۲ میگا واٹ • سال ۸۳-۱۹۸۲ میں ۱۳ ہزار چھ سو چھوٹے صنعتی واحدوں کا قیام۔ اور ۴۳ ہزار افراد کو روزگار کی فراہمی۔ •

اتر پردیش۔ سماجی انصاف اور معاشی ترقی کی راہ پر گامزن

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش۔

سفرنامہ پاکستان

ودل سکینہ

بہت یاد آتی ہے آپ کو ہندوستان کی؟ میں نے اور ضعیف عورت سے پوچھا، تو وہ بولیں ہاں بیٹا! سب کچھ آج کی طرح یاد ہے، ہرے ہرے کھیت، اپنا مکان چھوڑ کر ہم لوگ ہندوؤں کے کھیتوں میں نوکری کیا کرتے تھے سب کچھ بسا بسایا چھوڑ کر آ گئے۔ یہاں سے جو ہندو بھارت گئے ان کے چھوڑے مکان پر قبضہ کر لیا۔

پاکستان میں کھیلے جانے والے ہندپاک کرکٹ میچ کی رپورٹنگ کے لیے مجھے پاکستان جانا تھا دراصل غیر ملکی سیر و سیاحت کے لیے جو ایک کشش ہوتی ہے ایسی میرے دل میں بالکل نہ تھی حقیقت کو جھٹلاتا ہوا میرا دل دراصل پاکستان کو دوسرا دیش ماننے کو تیار نہ تھا۔ لگتا تھا دلی سے کچھ دور ضرور جا رہا ہوں لیکن اپنے ہی دیش میں جا رہا ہوں۔

میرے ساتھ ہی کئی دوسرے اخبار نویس اور فوٹو گرافر بھی جانے والے تھے لیکن آخری وقت تک سب گڑبڑ ہو گیا، آخر طے ہوا سب اپنے اپنے انتظام اور سہولت کے مطابق لاہور پہونچیں اور وہیں اکٹھے ہوں میرے ساتھ صرف اخبار نویس دوست تھے۔ رات کو دلی سے امرتسر جانے والی ڈی لکس بس ہم نے پکڑی اور دن نکلتے ہی امرتسر پہونچ گئے ــ ہاں پاکستان اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں جو کچھ پڑھا سنا تھا، اس کا اثر تو دماغ پر قائم ہی تھا اس لیے کچھ عجیب سا خوف بھی ذہن میں موجود تھا۔

امرتسر ریلوے اسٹیشن سے صبح ۹ بجکر ۱۰ منٹ پر لاہور کے لیے سمجھوتہ ایکسپریس چلتی ہے اس ٹرین کا بھی عجیب حال ہے معلوم ہوا کہ امرتسر اور لاہور کے درمیان سال میں چھ مہینے بھارتیہ ریل چلتی ہے اور باقی چھ ماہ پاکستانی ریل ــ اتفاق سے ان دنوں بھارتیہ ریل چل رہی تھی۔ امرتسر اسٹیشن پر بھی بھارتیہ کرنسی کو پاکستانی کرنسی میں بدلا

جاتا ہے کچھ مقامی لوگ اس دھندے میں کافی کمائی بھی کر رہے ہیں وہ ایجنٹوں کے طور پر چکر لگاتے رہتے ہیں اور نئے انجان مسافر کو بھارتیہ سو روپے کے بدلے پاکستانی ایک سو پانچ روپے دیتے ہیں جبکہ اٹاری اسٹیشن پر ایک سو دس روپے باآسانی مل جاتے ہیں ہم نے بھی انجانے ہی تین ہزار کی کرنسی بدل لی۔ جس کا سخت افسوس ہمیں اٹاری کا اسٹیشن پر ہوا۔ خیر۔

اس گاڑی میں ریزرویشن کا کوئی اہتمام نہیں ہے امرتسر سے چل کر پچیس منٹ میں اٹاری پہونچ جاتی ہے جو بھارت پاکستان پر واقع ہے وہاں پر ٹرین کا سارا اسٹاف بدل جاتا ہے ہندوستانیوں کے بجائے آگے لاہور تک پاکستانی اسٹاف گاڑی کو لیجاتا ہے ٹرین کے تک تک ہر ڈبے میں پاکستانی پولیس موجود رہتی ہے ان کی تیز نگاہوں سے بچ جانا اُن لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے جو ناجائز طور پر کوئی سامان لیجا رہے ہوں۔

اٹاری اسٹیشن پر کسٹم والوں کے ۱۹ بوتھ بنے ہوئے تھے جن پر کسٹم افسران اپنی تیز نگاہیں گڑائے بیٹھے رہتے ہیں مسافروں کے سامان کی باریکی سے جانچ کی جاتی ہے پاکستانی مسافر جو ہندوستان سے ہوکر واپس جاتے ہیں اُن کے سامان کو بالخصوص چیک کیا جاتا ہے۔ پان، لونگ، بنارسی ساڑیاں وغیرہ اشیاء پر کچھ زیادہ ہی سختی ہے اٹاری سے لاہور کا سفر بھی بیس پچیس منٹ کا ہی ہے، گاڑی بہت دھیمی رفتار سے چلتی ہے۔

لاہور اسٹیشن بڑا تو ہے لیکن وہاں بہت گندگی رہتی ہے وہاں آتی بدانتظامی اور کرپشن پھیلا ہوا ہے کہ اس کے سامنے بھارت کی ریلوے میں کرپشن پھیکا لگنے لگتا ہے پولیس والوں کی گھورتی نظریں مسافروں کے سینے میں چھری کی طرح اتر جاتی ہیں وہ مسافروں کے سامان کی تلاشی لیتے جا جا اس طرح سودے بازی کرتے نظر آرہے ہیں جیسے کوئی دوکاندار اپنے گاہک سے مال کی سودے بازی کرتا ہے وہاں کا کسٹم ڈپارٹمنٹ تو پولیس سے بھی دو قدم آگے ہے جس کے ذریعے کھلے عام رشوت لی جاتی ہے، اُن کی دھمکی میں آکر ہمارے ایک اخبار نویس دوست بھی بیس روپے دے بیٹھے بعد میں مجھے پتہ چلا تو میں نے بتایا بھی کہ بھائی ہم تو پریس کے لوگ ہیں، کوئی قابل اعتراض چیز بھی نہیں لے جا رہے ہیں لیکن وہاں ہماری ایک نہ چلی۔

لاہور میں سواری کے لیے رکشہ یا تھری وہیلر اسکوٹر نہیں ہیں زیادہ تر لوگ تانگہ یا میٹاڈور قسم کی ایک وین کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے بھی ایک مقررہ ہوٹل تک پہونچنے کے لیے گھوڑے تانگے کا استعمال کیا سفر کی تکان سے چور تو تھے ہی اس لیے اس روز آرام کیا اگلے دن سے پہلا کرکٹ ٹیسٹ میچ شروع ہوگیا۔ پانچوں دن کا ہمارا پروگرام کافی مصروف تھا، ہر شام کوئی نہ کوئی پارٹی ہوتی کبھی بھارتیہ سفارت خانے کی طرف سے کبھی پاکستان کرکٹ بورڈ کی طرف سے تو کبھی کسی اور ادارے کی طرف سے لاہور میں بھارت کے اطلاعات ونشریات وزیر مسٹر سالوے سمیت سبھی کھلاڑیوں اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کو پاکستان سرکار کی طرف سے شاندار پارٹی دی گئی۔

اپنے اس مصروف پروگرام کے باوجود ہم وقت نکالکر اکثر لاہور کے بازاروں میں گھومتے رہتے۔ عام آدمی کی طرح عام زندگی جیتے ہوئے لوگ جا بجا نظر آئے کہیں غریب لوگ بھی ملے، کہیں امیر بھی۔ لیکن لاہور میں امیروں کی تعداد کافی کم ہے لوگ زیادہ تر پیدل، سائیکل یا گھوڑے تانگے کا استعمال کرتے ہیں، لاہور کے بازار عام طور پر تنگ ہیں۔ دوکانیں چھوٹی لیکن سامان سے بھری رہتی ہیں خریداری کے لیے مردوں کے ساتھ عورتیں بھی دیکھی جاتی ہیں۔

لاہور کی شاندار شاہی مسجد باعث کشش ہے۔ یہ مسجد کافی بڑے رقبہ میں قیمتی پتھروں سے بنی ہوئی ہے زیادہ تر پتھر سرخ اور سفید سنگ مرمر کے ہیں۔ اس مسجد میں قرآن شریف کی ایک قدیمی جلد ہے جس کے حروف طلائی دھاگے سے کڑھے ہوئے ہیں۔

شاہی مسجد سے کچھ آگے ایک کافی اونچا مینار ہے جسے دیکھ کر بے اختیار قطب مینار کی یاد آجاتی ہے۔ لیکن قطب کے پیچھے ایک تاریخی پس منظر ہے۔ جبکہ اس مینار کے پیچھے ایسی کوئی بات سننے کو نہیں ملی۔ اگرچہ اس میں اوپر تک پہونچنے کی سخت ممانعت ہے۔ لیکن خاص شخصیتوں کے لیے اس میں لفٹ بھی لگی ہوئی ہے ویسے زیادہ اونچی عمارتیں لاہور میں بہت کم دیکھنے کو ملیں۔

پہلا ٹسٹ میچ ختم ہوتے ہی ہم کراچی جانے کی تیاری میں لگ گئے لاہور سے کراچی براستہ ملتان جانا پڑتا ہے ہمارے پاس وقت بھی تھا اور پاکستان کو زیادہ سے زیادہ دیکھنے کی خواہش بھی تھی اس لیے ملتان تک ہم بذریعے ریل پہونچے، پاکستان کا ریلوے نظام کافی خراب ہے پہلے درجے کا ٹکٹ لینے کے باوجود آرام دہ سیٹ نہیں مل سکی۔ اور کافی بھیڑ بھاڑ اور لوگوں کی آپا دھاپی کا سامان کرنا پڑا۔

ملتان شہر کچھ خاص بڑا نہیں ہے، اور جو ہے وہ بھی دھول مٹی سے بھرا ہوا لوگوں کا معیار زندگی غریبی کی سطح سے بھی نیچے ہے۔ بھکاریوں کی تعداد بھی بہت ہے، لوگ صبح ہوتے ہی دھندے کی جگاڑ میں گھروں سے نکل پڑتے ہیں وہ اکثر ملتانی بولتے ہیں جبکہ لاہور میں پنجابی زبان کا چلن ہے، ملتان کی دھرتی جتنی خشک ہے لوگ اُتنے ہی خوش خلق ہیں ہندوستانیوں کا تو دل کھول کر خیر مقدم کرتے ہیں۔

ہم نے ایک روز پاکستانی فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا لیکن جب سینما ہال پہونچے تو ہاؤس فل پایا وہاں پر فلم "مہربانی" دکھائی جا رہی تھی۔ ہم وہاں جا کر مینیجر سے ملے۔ اُسے جب پتہ چلا کہ ہم ہندوستان سے آئے ہوئے ہیں تو اُس نے ہال میں سے کچھ لوگوں کو اُٹھوا کر ہمیں جگہ دلوائی بیچ میں کئی بار چائے ناشتے سے خاطر بھی کی وہاں کے لوگوں کا ہندوستانیوں سے محبت کے لیے یہی مثال کافی ہے۔

اچانک ایک دن راستہ چلتے چلتے ایک شخص جلیل میاں سے ملاقات ہوگئی۔ یہ صاحب سوٹ کیس بنانے اور بیچنے کا کام کرتے ہیں ملتان میں اچھی خاصی دکان ہے ان کی دوستی یوں ہوئی کہ انھوں نے ہم سب کو گھر بلا کر شاندار دعوت دی۔ تحفے میں ایک ایک سوٹ کیس بھی دیا۔ اور ملتان کا پورا بازار گھما پھرا کر دکھلایا ہم میں سے کسی نے جا ہے جو کچھ بھی خریدا پیسے جلیل میاں نے دیئے ان کی فراخدلی دیکھ کر ہم نے مزید خریداری بند کر دی۔ جلیل میاں پر کہاں تک بوجھ ڈالتے

ملتان میں زیادہ تر روہتک، سونی پت گنور، پانی پت وغیرہ سے آئے ہوئے لوگ رہتے ہیں جو ملک کی تقسیم کے بعد یہاں آکر بس گئے تھے۔ لیکن اُن کی سُونی آنکھوں میں آج بھی بھارت کی یاد رہتی ہے اپنی جنم بھومی کا ذکر آتے ہی اُن کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں اُن سے بہت سی باتیں ہوئیں بھارت کی۔ بھارت کے لوگوں کی۔ ان کے دلوں میں ہندوستانیوں کے لیے بہت عزت ہے ایک بزرگ ننھے میاں تو اپنی جنم بھومی روہتک کے بارے میں بھی کچھ سُن لینا چاہتے تھے وہاں کی یادیں انھیں اس قدر تڑپا گئیں کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بہت یاد آتی ہے آپ کو ہندوستان کی؟" میں نے ایک ضعیف عورت سے پوچھا، تو وہ بولیں ہاں بیٹا! سب کچھ آج کی طرح یاد ہے، ہرے ہرے کھیت، اپنا مکان ڈھور ڈنگر۔ ہم لوگ ہندوؤں کے کھیتوں میں نوکری کیا کرتے تھے سب کچھ بسا بسایا یہاں چھوڑ کر آگئے یہاں سے جو ہندو بھارت گئے اُن کے چھوڑے مکان پر قبضہ کر لیا۔

ایک دو مندروں کو چھوڑ کر ہمیں ملتان میں کوئی اور مندر نظر نہیں آیا۔ ایک پرانا دیو مندر ایک وسیع مقبرے کے ٹھیک سامنے بنا ہوا ہے جو ایک عرصے سے بند پڑا ہے۔ اور اب وہ کبوتروں کا مسکن بنا ہوا ہے ان مندروں کی دیکھ بھال اور صفائی کا کوئی انتظام نہیں نہ ہی وہاں پوجا کے لیے کوئی جاتا ہے۔ دھول۔ مٹی اور کبوتروں کی بیٹوں سے بھرا ہوا یہ مندر۔ مندر کم اور کھنڈر زیادہ ہے۔

ایک مندر ملتان کے مشہور بازار حرم گیٹ

میں محلہ ہے وہ بھی خستہ حالی کا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں وہاں کوئی مندر نظر نہیں آیا۔ ہندو جو تھوڑے بہت وہاں موجود ہیں شاید اپنے گھروں میں ہی وہاں پوجا کر لیتے ہوں گے۔

ملتان کے رہنے والوں کی یوں تو سیاست میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی لیکن ضیا صاحب کا خوف اُن پر بُری طرح طاری ہے، کچھ لوگوں کے مطابق بھٹو نے ہمیں تیس سال پیچھے ڈھکیل دیا تھا اب ہم ترقی کر رہے ہیں، ٹھیک اس کے برعکس کچھ بھٹو کے حامی بھی ہیں جو اندر ہی اندر دھارک رہے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ یہ جوالا مکھی کب چھوٹ پڑے۔ ٹھیک یہی حالت لاہور میں بھی دیکھی گئی۔

یوں تو پاکستان میں مکمل مارشل لار ہے لیکن پھر بھی ڈھکے چھپے جائز ناجائز سبھی کام ہوتے ہیں، شراب نوشی پر وہاں سخت پابندی ہے کوئی پیتا پکڑا جائے تو کوڑوں کی سزا ہے۔ لیکن شراب سے لیکر شباب تک وہاں ہر چیز میسر ہے بس لوگوں کی جان پہچان یا اُن تک پہونچ ہونی چاہیئے۔ جو یہ دھندے کرتے ہیں یہاں گھروں میں بھی کچی شراب کی بھٹیاں چلتی ہیں۔ خفیہ طور پر ہندوستانی فلمیں دکھانے کا بھی اہتمام ہے ان سب دھندوں کو مقامی پولیس کی سرپرستی حاصل رہتی ہے کیونکہ اُسے اُس کا "چائے پانی" باقاعدگی سے مل جاتا ہے۔

پاکستان کی عورتوں میں پردے کا رواج تو ہے لیکن اس پر زیادہ سختی نہیں کچھ عورتیں پردہ نہیں کرتیں ہندوستانی عام عورتوں کی طرح ملتان میں بھی سواری کے لئے زیادہ تر گھوڑا تانگہ استعمال کیا جاتا ہے کچھ اسکوٹر بھی ہیں جو چاروں طرف سے بند ہیں یہاں پر ٹھیک آپ وین بھی ہیں جو ایک ایک روپے میں ایک سے دوسری جگہ پہونچا دیتی ہیں

ملتان سے چل کر ہم کراچی پہونچے تو یوں لگا جیسے بمبئی میں پہونچ گئے ہوں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں اور سڑکوں پر دوڑتی ٹویوٹا ڈیٹسن اور ہونڈا کاریں اپنی خوشحالی کی کہانی آپ کہہ دیتی ہیں، یہاں کے لوگوں کا معیار زندگی کافی بلند ہے اکثر لوگوں کے پاس اپنی امپورٹڈ گاڑیاں ہیں۔ یہاں تقریباً ہر خاندان کے ایک دو آدمی عرب ملکوں میں گئے ہوئے ہیں جہاں سے باقاعدہ موٹی موٹی رقوم ہر ماہ بھیجتے ہیں۔ یہاں کے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں بھی خاصی بھیڑ رہتی ہے لوگوں کے خیالات اور ان کا رکھ رکھاؤ کافی حد تک جدیدیت کے رنگ میں ڈھل گیا ہے، یہاں کی عورتیں بہت کم پردہ کرتی ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں بمبئی اور کراچی کا کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔

پاکستان میں کراچی غیر ملکی سامان کی سب سے بڑی مارکٹ ہے دکانیں امپورٹڈ سامان سے بھری رہتی ہیں کپڑوں آرائش کا سامان سے لیکر کاریں مشینری اور الیکٹرانک سامان تک یہاں بدیشی مل جاتا ہے، یہاں کے لوگ جین کا مال کم پسند کرتے ہیں جاپانی اور امریکی سامان کی مانگ زیادہ ہے ویسپا اسکوٹروں کی دوکانوں پر با آسانی دستیاب ہے آپ روپے جیب میں لیکر جایئے اور اسکوٹر پر بیٹھ کر گھر آیئے۔ بمبئی کی طرح یہاں کی زندگی بھی خوب مصروف ہے۔

ہاں ایک دقت پاکستان میں ہمیں ضرور پیش آئی۔ وہ تھی کھانے کی پاکستانی گوشت بہت کھاتے ہیں کوئی دال، سبزی بھی ایسی نہیں ہوتی جو گوشت ملائے بغیر پکائی جائے ہم لوگ اگرچہ نان ویجیٹیرن تھے لیکن ہمارے بھی روزانہ گوشت خوری سے پیٹ خراب ہو گئے بڑی مشکل سے ایک ہوٹل والے سے استدعا کی کہ ہمارے لیے بغیر گوشت ملائے دال سبزی بنا دے، اس نے ایسا کیا بھی لیکن ویسا لطف اس میں بھی نہیں آیا۔

ضمیمہ ——— نورزم

سیاحی کرنی ہے تو سیاح بنیے

کہیں یہ بھول کہ ہم سیاحی کو جس معنی میں لیتے ہیں وہ
صحیح معنی میں سیاحی نہیں ہے تو آپ لوگ بُرا نہیں مانیں
گے۔ یہ سچ ہے کہ ہم آپ میں سے جب بھی موقع ملے گھومنے
یا سیر سپاٹے کے لیے نکل جانا چاہتے ہیں اور نکلتے بھی ہیں
لیکن محض ایک شہر سے دوسرے شہر گھومنے نکل جانا
ہی سیاحی نہیں ہوتا

آپ ہی سوچیے جب آپ ایسے سفر پر نکلتے ہیں تب آپ کے پاس کتنا مال و اسباب ہوتا ہے؟ سامان کے پہلو کو اگر نظرانداز کر بھی دیں تو یہ سوچیے کہ کیا آپ سچ مچ وہاں جا کر گھومتے پھرتے ہیں یا پھر اپنے رشتہ داروں اور احباب میں اُلجھے رہتے ہیں؟ ان سوالوں کے جوابوں میں اگر ہم آپ کو ٹٹولیں تو پائیں گے کہ گو ہماری یہ سیاحی یا دوسرے شہر میں جانا رشتہ داروں یا دوست احباب میل ملاقات میں ہی محدود اور ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر ہم محسوس کریں گے سیاحی تو سچ مچ کر ہی نہیں پاتے

تو آئیے سب سے پہلے ہم یہ سمجھیں کہ سیاحی کیوں کرتے ہیں۔ دراصل سیاحی کا مطلب ہوتا ہے چاروں طرف گھومنا یعنی دلچسپی ورزش اور تفریح کے لیے مختلف جگہوں کی سیر۔ آج کی مصروف زندگی میں ہر شخص کچھ نہ کچھ وقت کے لیے اپنی روزمرہ کی زندگی اور ماحول سے نجات چاہتا ہے۔ اور سیاحی اس کا واحد وسیلہ ہے یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے سماج میں عزیز داروں، رشتہ داروں، اور دوست و احباب سے خیرسگالی کے جذبات بنائے رکھنے کے لیے ملنا جلنا ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر ہم یہ میل ملاپ سال دو سال کے بجائے چار پانچ سال میں کیا کریں تو کہیں زیادہ پُرلطف رہے گا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم آزاد ہو کر گھومنے

پھرنے کے لیے من چاہی جگہوں کا انتخاب کر کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہو سکیں گے دوسرا سب سے بڑا فائدہ رشتہ داروں، دوست واحباب کو ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ہم سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ ہم سے محبت کرتے ہیں پر سوچئے آج کی مہنگائی کے زمانے میں جب ہم ہی اچھی خاصی تنخواہ پانے کے باوجود اپنے گھر کو کسی طرح ٹھیک ٹھاک ہی کر پاتے ہیں تب ۳-۵ لوگوں کی ۱۰-۱۵ دنوں تک جہان داری کر کے اُن پر کیا گزرتی ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس سفر میں کافی کچھ خرچ کرتے ہیں تو اگر اتنے ہی خرچ میں کسی ہل اسٹیشن یا کسی دوسرے سیاحی مرکز پر لے جائیں۔ کتنا بہتر رہے گا!

لہٰذا سیاحی کیوں کا جواب یہی ہوگا کہ صرف گھومنے پھرنے اور تفریح کے لیے سیاحی کیجئے۔ اس میں جہاں ایک نئی تازگی اور سکون میسر ہوگا وہیں سبھی کی معلومات میں اضافہ ہوگا انھیں قدرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔

سیاحی کی اس اہمیت کو سمجھنے کے بعد امید ہے کہ آپ صحیح معنی میں سیاحی کرنے کا ارادہ کرنے لگے ہوں گے۔ لیکن یہ ارادہ کرتے کرتے آپ دھیان رکھئے کہ ہر گھومنے والے کو سیاح نہیں کہا جاتا۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ گھومنے نکلے تو صرف گھومنے کے لیے ہی نکلیے۔ اس کے لیے پہلے تو آپ کو کم سے کم سامان لیکر نکلنا چاہیئے۔ یعنی کہ آپ چار لوگ ہیں۔ تو دو (۲) بیڈنگ اور ۲ سوٹ کیس کپڑوں سے بھر لیجئے۔ ایک بیڈنگ اور دو سوٹ کیس سے بھی کام چل سکتا ہے ایک درجن کے بجائے چار پانچ جوڑ کپڑوں میں کام چل سکتا ہے آپ کی بیگم صاحبہ بھی ۵-۶ ساڑیوں میں گھومنے کا لطف لے سکتی ہیں۔

آج کل سیاحی اچانک ممکن نہیں ہے کم سے کم متوسط طبقہ کے لیے۔ اگر آپ بیوی بچوں کو ساتھ لیکر جانا چاہتے ہیں اور جانا بھی چاہیئے تو پروگرام ۵-۶ ماہ پہلے بنا لیجئے۔ پہلے تو یہ طے کیا جانا چاہیئے کہ جانا کہاں ہے۔ اگر کسی پہاڑی مقام پر جانا ہے تو ایسی جگہ کا انتخاب کیجئے جو بہت [illegible] ہو۔

مثلاً آپ ہماچل جانا چاہتے ہیں تو شملہ نہ جا کر کُلو۔ منالی۔ ڈلہوزی جیسے کم بھیڑ بھاڑ والے اور نسبتاً خوبصورت مقاموں کا لطف لے سکتے ہیں۔ ہمارے زیادہ تر سیاحوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ شملہ۔ نینی تال۔ مسوری۔ یا دارجلنگ ہی جائیں۔ ان کی فطرت کافی مہنگی تو پڑتی ہی ہے ساتھ ہی پریشانی میں ڈالتی ہے۔ یہ بھی خاص ہل اسٹیشن ہیں۔ اس لیے بڑے شہر بڑے نخرے والی بات یہاں پوری طرح لاگو ہوتی ہے۔ اور پھر ان جگہوں پر بھیڑ بھاڑ اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہل اسٹیشنوں کا جانا مانا پُرسکون ماحول اب وہاں نہیں رہ گیا ہے۔ سیزن میں تو میدانی [illegible] کے لوگوں کے لیے رہنے کی مناسب اور سستی جگہ ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

اس لیے بہتر ہوگا کہ سیاحی کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب نہ کر کے ان کے آس پاس پُرسکون اور کم خرچ والی جگہوں کا انتخاب کیا جائے۔ یہ مت سوچئے کہ ان کم مشہور جگہوں پر رہنے اور کھانے پینے کی دشواری ہوگی۔

ریاستی حکومتوں اور سیاحت کے محکموں نے سیاحی لائق ایسے سبھی مقامات پر ٹورسٹ لاج اور کاٹیج بنا رکھے ہیں۔ جہاں سبھی طرح کی سہولیات میسر ہیں وہاں کے انچارج سے ملکر اپنا من پسند کھانا مل سکتا ہے۔ ان کاٹیجوں میں یا لاج میں ٹھہرنے سے متعلق معلومات اور بکنگ کی سہولت آج کل ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ آپ صرف شہر کے ٹورسٹ سینٹر تک جانے کی زحمت کریں۔ وہاں سے آپ کو اس علاقے کے مختلف سیاحی لائق مقامات اور سہولیات کی پوری جانکاری مل جائے گی۔ آپ اس کا فائدہ اٹھائیے اور سیر و سپاٹے پر نکلنے کا پروگرام بنا ڈالیے

صحیح معنی میں سیاح بننے کے لیے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ سیاح کی طرح خود کو بنانے کی کوشش کی جائے ہم لوگوں کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ سب ریڈی میڈ اور اسٹینڈرڈ کا چاہتے ہیں۔

سچ مانئے اگر آپ جہاں گھومنے جا رہے ہیں وہاں کے مطابق اپنی ضروریات اور شوق تبدیل کر لیں ....

تو سیر و سپاٹے کا لطف دوگنا ہو جائے گا
پھر آپ یہ سوچیے کہ آپ یکسانیت کے
ماحول سے تنگ آ کر تازگی اور تبدیلی کے لیے
نکلے ہیں۔ تو پھر گھر جیسا ماحول کیوں چاہتے
ہیں۔ آپ نے غیر ملکی سیاحوں کو تو اپنے
چاروں طرف دیکھا ہی ہوگا۔ آپ نے یہ بھی
دیکھا ہوگا کہ وہ سہولیات کی پرواہ نہ کر کے
گھومنے اور قدرتی مناظر سے پوری طرح
لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ
ہپّی اسٹائل میں گھومنے نکلیں لیکن یہ بھی سچ
ہے کہ آپ اپنی گھریلو سہولیات اور ضروریات
کو محدود ضرور رکھیں ورنہ گھومنے پھرنے کا
صحیح لطف نہیں پائیں گے۔ ہم نے جن ٹورسٹ
کاٹیجوں اور لاج کا ذکر کیا ہے ان میں بستر
وغیرہ کا بھرپور انتظام رہتا ہے یہ انتظام آپ
کی سہولت کے لیے ہے

صحیح معنی میں سیاح بننے کے لیے ایک
صحیح ذہنیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ ذہنیت
تبھی بن سکتی ہے جب آپ سیاحت کا صحیح
مطلب سمجھیں اور اسی انداز میں سیر سپاٹے
کے لیے نکلیں۔

دراصل سیاحی کبھی بھی کی جا سکتی ہے
ضرورت ہے موسم کے مطابق سیاحی مرکز
کے انتخاب کی۔ اگر آپ پہاڑوں کے پریمی
ہیں عام طور پر لوگ گرمیوں کے موسم میں
پہاڑ پر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شملہ۔
مسوری، نینی تال جیسے مقامات میدانی
علاقوں کی طرح بھیڑ بھاڑ والے شہر بن جاتے
ہیں اس لیے اگر ان شہروں [illegible]
پر جانا ہو تو ستمبر سے نومبر تک کا موسم
بہت اچھا رہتا ہے برف دیکھنی ہو یا برفباری
کا لطف لینا ہو تو دسمبر سے جنوری فروری
تک ان مقامات پر جایا جا سکتا ہے

سیاحی کی ذہنیت سے متعلق ایک
اہم بات یہ ہے کہ ہم کیسے اور کتنا گھومتے
ہیں۔ کیسے اور کتنا گھومنے سے ہمارا مطلب
یہ ہے کہ موسم، ماحول اور جغرافیہ کے
مطابق گھومنے کے ہم کیا ذرائع اختیار کرتے
ہیں اور کس نظریے اور مقصد سے گھومتے
ہیں۔

یاد رکھیے پہاڑی علاقوں میں جتنا پیدل
چلنے میں لطف آتا ہے اتنا کسی اور سے نہیں
قدرتی مناظر اور قدرت کے پوشیدہ راز
آپ پیدل چل کر جتنا محسوس کر سکتے ہیں
اتنا کسی کی پیٹھ پر سوار ہو کر نہیں۔
جب آپ پیدل چلیں گے تو غیر ارادی
طور پر آپ کے پیر کسی جگہ پر ٹھہر جائیں
گے۔ آپ کی نگاہیں اور من نہ جانے
کہاں کھو جائے گا

آپ ماحول کے رنگ میں رنگ
جائیں گے۔ وہاں کے لوگ آپ کے دل و
دماغ پر چھا جائیں گے۔ یہی سیاحی کا اصلی
لطف ہے۔ ایسے میں وہاں کے گاؤں بھی
آپ کے لیے کم کشش نہیں ہوں گے۔ آپ
پائیں گے وہاں بھی جاننے اور سمجھنے کے لیے
بہت کچھ ہے۔

اب بات آتی ہے کہ آپ کتنا
گھومتے ہیں؟ یعنی آج کل کی مصروف زندگی
میں لوگوں کے پاس وقت کی بے حد کمی رہتی
ہے فرصت تو ہفتہ دس دن کی ہوتی ہے
پر اتنے ہی دنوں میں وہ اتنی ہی جگہیں گھوم
آنا چاہتے ہیں۔ یعنی ایک ایک دو دو
دن بس اتنے کم وقت میں کچھ بھی نہیں
دیکھا جا سکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ
اگر ۱۰۔۱۵ دن کا وقت ہے تو دو۔ تین
جگہوں سے زیادہ کا پروگرام نہ بنائیں۔
اور یہ جگہیں بھی پاس۔ پاس ہونی چاہیے
ان دو۔ تین جگہوں میں ہی گھومنے کو بہت کچھ
مل جائے گا۔

سیر سپاٹے یا سیاحی
کے لیے عمر کی کوئی
قید نہیں ہے ۶۰ — ۷۰
سال کی عمر کے لوگ
پیدل پہاڑوں پر چڑھتے
دیکھے جا سکتے ہیں۔
سوال صرف امنگ
اور جوش کا ہے۔ آج
کل سیاحوں کے کیمرے
ہوتے ہیں جن سے وہ
سیاحی کی یادوں کو
سدا کے لیے محفوظ
کر لیتے ہیں اگر وہ ڈائری
میں اپنی گھومی دیکھی
جگہوں کے بارے میں
لکھتے رہیں تو ڈائری کے
صفحات پر سیاحی کی [illegible]
[illegible]

اترپردیش کے گاؤں میں اب غریب نظر انداز نہیں

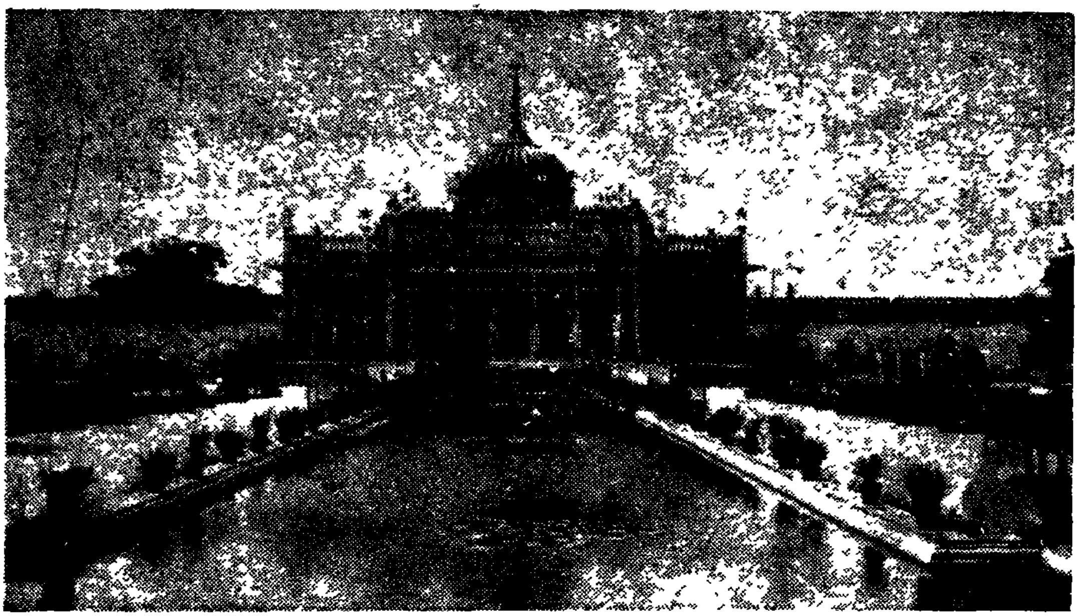
حکومت اترپردیش نے غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی بہبودی کے لیے ادھر متعدد ٹھوس قدم اُٹھائے ہیں۔ اس سلسلے میں مربوط دیہی ترقیاتی دیہی روزگار اور بندھوا مزدوروں کی آبادکاری سے متعلق پروگراموں کا خصوصی طور پر ذکر کیا جانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ بے زمین کھیت مزدوروں قابل کاشت زمین اور مکان بنانے کے لیے زمین الاٹ کرنے اور غریبی لائن سے نیچے گذر بسر کرنے والوں کو مالی امداد دینے کی بھی اسکیمیں بروئے کار لائی گئیں۔ ان سبھی پروگراموں کی ترقی کا جائزہ باقاعدگی سے لیا گیا۔ یہی سبب ہے کہ پورے ملک میں ۲۰ نکاتی قومی پروگرام پر عمل درآمد میں یہ پردیش دوسرے نمبر پر ہے

ترقی کی نشاندہی کرنیوالے کچھ اعداد و شمار پیش ہیں

پروگرام	مارچ ۱۹۸۲ء کی صورتحال	مارچ ۱۹۸۳ء کی صورتحال
- مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام	مستفید ہونیوالے خاندان ۲۱/۲۰ لاکھ	۲۶/۷۵ لاکھ
۱- دیہی روزگار	۱۶۸/۴۰ انسانی دن	۳۴۳/۳۸ لاکھ
۲- انتہائی درجہ غریب لوگوں کو مالی امداد	۳۶۱۲۲۶ لوگ (۸۲ - ۱۹۸۱)	۳۷۹۳۶۷ لوگ (۸۳ - ۱۹۸۲)
۳- بندھوا مزدور جن کی آبادکاری کی گئی	۴۱۵۵	۸۴۰۴

مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم سے فائدہ حاصل کرنے والے خاندانوں کو اب تک قرض اور گرانٹ کی شکل میں ۷۷/۵۲۳۶۵ لاکھ روپے کی امداد دی گئی۔ اس طرح بندھوا مزدوروں کی آبادکاری کے لیے ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۹۶/۱۲۸ لاکھ روپے کی امداد دی گئی۔ جن لوگوں کو مکان بنانے کے لیے زمین الاٹ کی گئی ان کی تعداد مارچ ۱۹۸۳ء تک ۱۶۱۰۷۲۲ ہو گئی۔ بے گھر لوگوں کے لیے گاؤں میں تقریباً ۵۲۲۲۰ مکان تعمیر کیے گئے۔

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش کی جانب سے جاری کیا گیا۔



لکھنؤ

لکھنؤ گومتی ندی کے کنارے واقع ہے۔ یہ شہر اُترپردیش کی راجدھانی ہے۔ یہاں کی شاہی عمارتیں گنبدوں، میناروں اور میلوں تک ... ہیں ابھی بھی اودھ کی پرانی تہذیب کے روشن ہوتے ہیں، اس شہر کا تعلق نواب آصف الدولہ اور نواب [illegible] [illegible] ... کا امام باڑہ، پکچر گیلری جیسی گارد۔ قیصر باغ۔ سکندر باغ

علی گنج کا ہنومان مندر، میڈیکل کالج۔ لکھنؤ یونیورسٹی ... [illegible] سبھا۔ شاہ ... [illegible] شنکر کا مندر [illegible] ... کا مندر ... [illegible] شہیدوں کی یادگار۔ چھتر منزل۔ نواب سعادت علی کا مقبرہ

شاہ نجف۔ اور چھتر منزل جیسے قابل دید مقامات اور عمارتیں اس شہر میں ہیں۔

لکھنؤ کے قریب وجوار میں نواب گنج پرندگاہ۔ ککریلے فارسٹ۔ چنہٹ پکنک سپو پلین موسا باغ اور نیم سار تیرتھ واقع ہیں

لکھنؤ ہوائی ... [illegible] سی [illegible] دوری پر ہے اور [illegible] اور پٹنہ سے ہوائی سروس سے جڑا

ہوا ہے۔ لکھنؤ کا چار باغ ریلوے اسٹیشن سبھی اہم شہروں سے جڑا ہوا ہے۔ صوبہ کے ہر ضلع کے لیے یہاں سے سیدھی بس سروس ہے۔ لکھنؤ میں سیاحوں کے قیام کے لیے درجنوں ہوٹل اور دھرم شالائیں ہیں۔ محکمہ سیر و سیاحت کے گومتی ہوٹل میں ۱۹۶ بستروں کا انتظام ہے لکھنؤ سے ۹۴ کلو میٹر دور نیم سار

کا قدیم تیرتھ مقام ہے۔ یہ ۸۸ ہزار رشیوں کی تیرتھ استھلی رہا ہے مہارشی ودھیچ کے اسمرتی میں ہم کوس کی پریکرما پھاگن مہینہ کی

اماوس سے شروع ہو کر پورنیا کو مسرکھ میں مکمل ہوتی ہے۔ یہاں پر

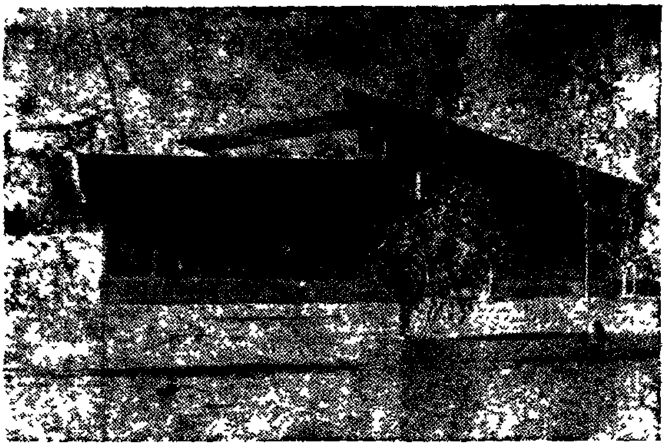
چکر تیرتھ۔ ویاس گدی۔ للیتا دیوی کا مندر، ہنومان گڑھ پنچ پانڈو۔ پران مندر، اور آنندمئی ماں کا آشرم ہے۔

نیم سار سے دس کلومیٹر دور مسرکھ ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ مہارشی ودھیچ نے اپنی استھی دان کرنے سے پہلے سب تیرتھوں کے پانی

اٹھاسی ہزا
رشیوں کے
تیرتھ استھا
نیم سار

سے اسنان کیا تھ
لیے اس کا نام مشر
مسرکھ پڑا۔

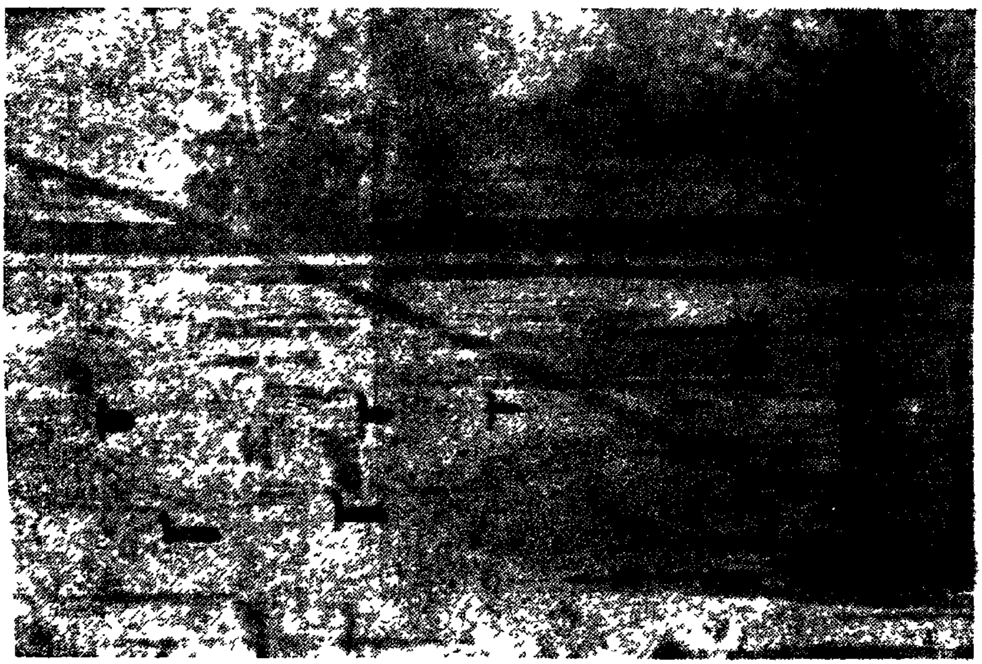




نواب گنج

شہر کے شور و غرابہ سے دور اور فضائی آلودگی سے پاک و صاف لکھنؤ۔کانپور روڈ پر نواب گنج کے قریب ۲۴ ہیکٹر کے رقبہ میں پھیلے ہوئے نواب گنج پرندگاہ کا اپنا الگ ہی مشن ہے۔ یہ خوبصورت جھیل ان بارہ جھیلوں میں ایک ہے جنہیں ۱۹۲۵ء میں حکومت اُترپردیش نے محفوظ علاقہ قرار دیکر شکار پر مکمل پابندی لگا دی لکھنؤ سے ۴۳ کلومیٹر دور اور کسمبھی واجگیں ریلوے اسٹیشنوں سے قریب واقع یہ جھیل ملکی اور غیر ملکی پرندوں کی آماجگاہ ہے۔ خوبصورت رنگ برنگی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)



جھانسی

جھانسی بندیل کھنڈ کا ایک اہم تاریخی شہر ہے۔ اس ملک میں کون ایسا شخص ہوگا جس نے جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا نام نہ سنا ہو اُنھوں نے یہیں ۵۸ — ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا۔

۱۶۱۳ء میں راجہ ویر سنگھ دیو نے جھانسی کے قلعہ کی تعمیر کرکے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔

جھانسی شہر اور اس کے آس پاس کا علاقہ متعدد وشنو، شیو اور جین مندروں کے باقیات سے بھرا پڑا ہے۔ جن میں کچھ سمدر گپت دور کے اور کچھ اس سے بھی قدیم ہیں۔ قدیم تاریخی محلات میں رانی لکشمی بائی کا قلعہ بہت مشہور ہے جو کہ آج بھی اس امر شہید رانی کی بہادری کی کہانی کہہ رہا ہے۔

کالنجر کا قلعہ باندہ سے ۵۶ کلو میٹر دوری پر ہے۔ نزدیکی ریلوے اسٹیشن اتنرا ہے لگ بھگ ۳۷ کلو میٹر ہے — پہاڑی پر واقع کالنجر میں سات پھاٹک ہیں۔

دیوگڑھ جھانسی سے ۱۲۳ کلو میٹر دور بیتوا ندی کے دائیں ساحل پر واقع ہے سات پھ

سے دیوگڑھ ۳۳ کلو میٹر ہے۔

دیوگڑھ اپنے عالی شان وشنو مندر اور جین مندر کے لیے مشہور ہے ان مندروں کا فن تعمیر بہت اعلا درجہ کا ہے اور پورا پہاڑی علاقہ گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ مدھیہ پردیش میں واقع اور جھانسی



سے ١٠ کلو میٹر دور بیتوا ندی کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں جانے کے لیے بس اور ریل دونوں کے سہولیات حاصل ہیں۔ یہاں پر خاص دیکھنے والی جگہیں قلعہ، محل راما راؤ کا سندر چتر بھج باگھ کا مندر پھول باغ اور جہانگیر محل وغیرہ ہیں۔

مدھیہ پردیش میں اپنے خوبصورت مندروں اور حیرت انگیز مجسموں کے لیے ساری دنیا میں نام پیدا کرنیوالے کھجراہو کے قدیم مندر ہیں جہاں یہیں جھانسی سے ہوکر جانے کا راستہ ہے۔ مہوبہ اور چھتر پور ہوکر بھی کھجراہو پہونچا جاسکتا ہے۔ ان مندروں کی تعمیر چندیل راجاؤں نے ٩٥٠ء عیسوی سے ١٠٥٠ء کے درمیان کی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ یہاں پہلے ٨٥ مندر تھے لیکن اب ٢٢ مندر ہی باقی بچے ہیں

جھانسی میں سیاحوں کی سہولت کے لیے ریلوے ریٹائرنگ روم، ڈسٹرکٹ ڈی انسپکشن ہاؤس، سرکٹ ہاؤس اور متعدد ہوٹل اور دھرم شالائیں ہیں۔ جھانسی میں پرائیویٹ ٹیکسیاں بھی مل جاتی ہیں۔ یہاں پر پچاس بستروں والے ایک ٹورسٹ لاج کی تعمیر کا کام بھی چل رہا ہے۔

کھجراہو۔ دلی اور بنارس سے ہوائی سروس سے جڑا ہوا ہے

نواب گنج ——— صفحہ ۵ سے آگے

مقامی پرندوں جیسے سلہی۔ گرا سارس۔ بگلا۔ منڈا۔ ٹیٹہری۔ چمچا۔ بن کوا وغیرہ یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

موسم سرما میں یہاں کا منظر اور بھی دلکش ہو جاتا ہے، جب یہاں سُرخاب۔ پٹیری، نیل سور جیتی۔ سُرخاب۔ پیلکن۔ جل مرغی چاہا وغیرہ زبردست سردی سے بچنے کے لیے اس جھیل میں آکر بسا لیتے ہیں۔

سیاحوں کی سہولیات کے لیے محکمہ سیر و سیاحت نے ۱۰ لاکھ روپے خرچ کرکے نواب گنج پرندگاہ کو ایک سیاحتی کامپلکس کی شکل میں سجایا، سنوارا ہے جس میں ہوٹل، ریسٹورنٹ لائبریری اور دیگر سہولیات ہیں۔

•••



اُتر پردیش

ہینڈلوم کارپوریشن

حکومت کے اعلان شدہ ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ہتھ کرگھا صنعت کی ترقی کو خاص مقام دیا گیا ہے جس سے صوبے کے بنکروں معیار حیات ترقی پسند بنایا جاسکے اور خاص طور سے دیہی علاقوں پر مسلّط بے روزگاری سے نمٹنے میں مدد مل

ہمہ گیر ترقی کی جانب گامزن

سکے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہینڈلوم کارپوریشن کے ذریعے بہت سے پروجیکٹ قائم کیے جارہے ہیں۔ ان اسکیموں پر عمل درآمد کے نتیجے میں ایک طرف جہاں بنکروں کی اقتصادی حالت میں سدھار ہوا ہے وہیں ان میں بیداری آئی ہے۔ کارپوریشن کے ذریعے عمل میں لائے گئے کچھ خاص پروگراموں کی تفصیل اس طرح ہے۔

ہتھ کرگھا کپڑوں کے بنانے کیلئے بنکروں کو کام کرنے کی جگہ پر صنعتی امداد

ماہیہ ہتھ کرگھا نگم کے ذریعے صوبے کے بہت سے مقامات پر۔ خاص طور سے دیہی علاقوں میں صنعتی مراکز کھولے جارہے ہیں ان صنعتی مراکز کے توسط سے بنکروں کو دھاگہ۔ جدید کرگھے اور تکنیکی امداد پیش کی جارہی ہے جس سے کہ وہ ترقیاتی چیزوں کے بناسکنے کے اہل ہوں اور انھیں اپنے بنائے گئے سامان کی زیادہ قیمت حاصل ہوسکے۔ اس پروگرام پر عمل درآمد سے بنکر اب پہلے سے زیادہ کپڑا بنا رہے ہیں۔ کیوں کہ اب انھیں کچّا مال فراہم کرنے اور تیار مال کے فروخت کرنے کی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ سنہ ۱۹۷۹ء میں جہاں ۷۹ صنعتی مراکز مصروف تھے وہیں سنہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۱۶۶ ہوگئی۔

مربوط ہتھ کرگھا ترقیاتی پروجیکٹ:

کارپوریشن کے ذریعے ذاتی علاقوں کے بنکروں کے لیے اب تک مندرجہ ذیل آٹھ پروجیکٹ قائم کیے گئے ہیں۔

(۱) گورکھپور۔ بستی (۲) مئو ناتھ بھنجن
(۳) میرٹھ (۴) بجنور
(۵) مرادآباد۔ رام پور (۶) بارہ بنکی فیض آباد
(۷) علی گڑھ۔ ایٹہ (۸) ہردوئی۔ سیتاپور

ان پروجیکٹوں کے ذیل میں بنکروں کو سبھی مصنوعات، ڈیزائن اور دیگر امداد فراہم کیے جاتے ہیں

بنکروں کی یومیہ آمدنی میں اضافہ

پروجیکٹس کے تحت مصروف کار بنکروں کی مزدوری میں بھی حال میں کارپوریشن کے ذریعے اضافہ کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں ان کی یومیہ آمدنی میں ۳ سے ۴ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔

یونیسیف سے امداد یافتہ صنعتی مراکز

صوبے کے ۱۴ مقامات پر کار خانہ صنعتی مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ ان مراکز پر بنکروں کو صحت مند ماحول میں کپڑا بنانے کی سہولت مہیا کی گئی ہے ۸۳ - ۱۹۸۲ء میں ان مراکز میں قائم شدہ کرگھوں کی پوری صلاحیت کا استعمال کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں مذکورہ مدت میں ۱.۴۰ کروڑ روپے کے جدید کپڑوں کی صنعت ممکن ہو سکی ہے۔ یہ مراکز مندرجہ ذیل مقامات پر ہے۔

۱۔ جھوپر ۔ ہمیر پور ۸۔ بڑاگاؤں (بنارس)
۲۔ اعتماد پور ۔ آگرہ ۹۔ رام نگر ״
۳۔ فتح پور سیکری ۔ آگرہ ۱۰۔ گنگولی (غازی پور)
۴۔ رایا ۔ متھرا ۱۱۔ نصیر پور ۔ ״
۵۔ آدیرنی ۔ متھرا ۱۲۔ سکھپور ۔ (بلیا)
۶۔ ملاوان ۔ ہردوئی ۱۳۔ سبھا (بلیا)
۷۔ غوث گنج ۔ ہردوئی ۱۴۔ تلہر (شاہجہاں پور)

ہتھ کرگھا کامپلکس اسکیم: اس اسکیم کے تحت ہتھ کرگھا کارخانے تکنیکی نقطہ نظر سے اہل لوگوں کے ذریعے لگائے جاتے۔ ان صنعتی اکائیوں کے قیام کے لیے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے راجیہ ہتھ کرگھا کارپوریشن اقتصادی تنظیموں سے رابطہ قائم کر کے صنعت کاروں کو مطلوبہ امداد فراہم کراتا ہے اور ابتدا میں محدود مقدار میں ایسی اکائیوں کے ذریعے بنایا گیا مال بھی خریدتا ہے۔ صنعت کاروں سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بنائی گئی چیزوں کے فروخت کے لیے خود بھی کوشاں ہوں گے۔ اب تک اس اسکیم کا نفاذ ۱۷ مقامات پر کیا جا چکا ہے ۔ کل ۳۴۷ صنعت کاروں کا انتخاب اور ۱۳۲ اکائیوں کو قرض منظور کرایا گیا ہے اور ۵۶ اکائیاں مصروف کار ہیں۔

کوالٹی کنٹرول:

صارفین کو جدید ملبوسات کی فراہمی کرانے اور کپڑوں کی خوبی کو زیادہ دیرپا بنائے رکھنے کے لیے کارپوریشن میں کوالٹی کنٹرول محکمہ قائم کیا گیا ہے، جس کے ذریعے کپڑوں کی کوالٹی کی جانچ کی جاتی ہے اور صرف وہی کپڑے بکری کے لیے دیئے جاتے ہیں جن کی کوالٹی معینہ معیار کی بنیاد پر ہوتی ہے اس ترکیب کا اچھا اثر یہ ہوا ہے اور ہتھ کرگھا کپڑوں کی فراہمی صارفین کو مذکورہ بالا معیار پر کی جا رہی ہے۔

پروسس ہاؤس: ہتھ کرگھا کپڑوں کے لیے پروسسنگ کی سہولیات جیسے۔ بلیچنگ، کلینڈرنگ، پرنٹنگ، اور ڈائنگ کی سہولیات فراہم کرانے مقصد سے خلیل آباد (بستی) میں ایک پروسس ہاؤس ۶۶/۱۳۳ لاکھ روپے کی لاگت سے قائم کیا گیا ہے۔ اس اکائی نے ۸۳ - ۱۹۸۲ء میں تجارتی طور پر کام شروع کر دیا ہے۔ اس طرح صوبے کے مشرقی علاقے کے بنکروں کو پروسسنگ کی سہولیات فراہم کرائے جانے سے ان کے ذریعے بنائے سامان زیادہ قیمت پر بک سکیں گے

اور اُنھیں زیادہ فائدہ ہوگا۔

جھانسی کے علاقے کے بنکروں کے ذریعے ٹیریکاٹ کپڑے تیار کیے جاتے ہیں۔ ایسے کپڑوں کے لیے پروسسنگ کی سہولیات مہیا کرانے کے مقصد کے تحت مئورانی پور (جھانسی) میں ایک پروسیس ہاؤس قائم کیا جارہا ہے۔ پروسس ہاؤس کے لیے ۵۲ر۴ ایکڑ گرام سبھا کی زمین ہینڈلوم کارپوریشن کو ٹرانسفر ہوگئی ہے۔

سلک پروجیکٹ بنارس: اس اکائی کی تعمیر کا کام یوپی نربل آدوس، کارپوریشن کو سونپا گیا ہے۔ سلک پروجیکٹ کے لیے حکومت سے ۸۳ – ۱۹۸۲ء میں دس لاکھ روپیے حاصل ہوئے ہیں۔ بنارس اور مبارک پور میں بنکروں کا سروے ہوچکا ہے۔ اور بنکروں کو صنعت کے لیے طے کرلیا گیا ہے۔ بنارس کے دو مراکز پر اور مبارک پور میں ایک مرکز پر صنعت کا کام شروع ہوچکا ہے ٹوسٹنگ پلانٹ، رری پلانٹ۔ ڈائنگ اور چھپائی کے لیے آستاپور، بنارس میں زمین خرید کی جاچکی ہے اور تعمیر کا کام رسل آواس کارپوریشن کو سونپا گیا ہے۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی صنعت:

کارپوریشن کے زیر نگرانی ریڈی میڈ کپڑوں کی صنعت کا کام بھی شروع کیا گیا ہے ان کپڑوں کی فروخت کارپوریشن کے بکری مرکزوں کے توسط سے کی جائے گی۔

ایکسپورٹ:

صوبے میں ہتھ کرگھا کپڑوں کے در آمد کے لیے کارپوریشن کے ذریعے ایک محکمہ درآمد قائم کیا گیا ہے اس اکائی کے ذریعے ہینڈلوم ہینڈی کرافٹ کارپوریشن حکومت ہند کے تعاون سے ہتھ کرگھا کپڑوں کے ایکسپورٹ کا کام شروع کیا گیا ہے

تیار مال کی بکری کا انتظام:

ہتھ کرگھا کارپوریشن کے ذریعے بنے ہوئے مال کی بکری اپنے بکری مرکزوں، تھوک بکری اور نمائشوں کے توسط سے کی جارہی ہے۔ کارپوریشن نے اس سال جمع مال کی نکاسی کی تحریک چلائی جس کے نتیجے میں ستمبر ۱۹۸۲ء ۱۳ر۱ کروڑ روپے کی قیمت تک اس تحریک میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ بکری مرکزوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے ۸۰-۱۹۷۹ء میں شوروم کی تعداد ۶۴ تھی جو ۸۳ — ۱۹۸۲ میں بڑھ کر ۸۸ ۔ ہوگئی ۸۳-۱۹۸۲ میں کپڑوں کی فروخت کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے جو مندرجہ ذیل چارٹ سے نمایاں ہے۔

نمبر شمار	تفصیلات	۱۹۷۹-۸۰	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۱-۸۲	۱۹۸۲-۸۳
۱-	کنٹرول کپڑا	۱۹۱۷/۴۸	۲۷۵۸/۳۳	۲۶۶۷/۶۹	۲۷۵۱/۱۶
۲-	نان کنٹرول کپڑا	۲۶۷/۲۸	۳۸۰/۰۸	۴۵۲/۵۸	۶۵۰/۰۰
	میزان	۲۱۸۴/۹۶	۳۱۳۸/۴۱	۳۱۲۰/۲۷	۳۴۰۱/۱۶

ہر قدم غریبوں کی بھلائی اور ترقی کے لیے

۲۰ نکاتی قومی پروگرام غریب لوگوں کی بہبودی کے لیے ہی چلائے گئے ہیں۔ اُترپردیش میں گذشتہ سال اس پروگرام کے تحت مختلف زمروں میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ پورے ملک میں اُترپردیش اس پروگرام کو انجام دینے اور مقاصد کی تکمیل میں دوسرے نمبر پر رہا ہے۔

- نجی چھوٹی سنچائی کے زمرہ میں ۸۳-۱۹۸۴ء میں ۹٫۴۷ ہیکٹر کا اضافہ ہوا ہے۔
- دالہنوں کے رقبہ میں ۷۲۳۳ ہیکٹر کا اضافہ
- مالی امداد پانے والے زمین الاٹیوں کی تعداد ۲۷٫۷۴۶ رہی۔
- ہریجن بستیوں میں جل نگم نے ۲ لاکھ ۵ ہزار لوگوں کے لیے پینے کے پانی کا انتظام کیا۔
- اب تک حد بندی سے حاصل ۲۹٫۲۳۸ ہزار ایکڑ زمین بے زمینوں کو الاٹ۔ جس سے کل ۱۹۵۵۷۴ بے زمین مستفید ہوئے۔
- کھیت مزدوروں کو مقررہ کم ازکم اجرت دلانے کے لیے اب تک ۲۴۸۴ مقدمات دائر کیے گئے۔
- بندھوا مزدوروں کی آبادکاری کے پروگرام کے تحت ۴۰۸ مزدوروں کی آبادکاری کی گئی اور انھیں گذشتہ ایک سال میں ۹٫۷۴ لاکھ روپے کی مالی امداد دی گئی۔
- کل ۱۲ لاکھ گیارہ ہزار اہل خاندانوں کو مکان بنانے کے لیے زمین الاٹ کی گئی۔
- اقوام مندرجہ فہرست اور درج فہرست قبائل کے لیے گاؤں میں ۴۱۸۱ مکانوں کی تعمیر کی گئی۔
- ہریجن بستیوں کو جوڑنے کے لیے ۱۳۴۰ کلو میٹر لمبی رابطہ سڑکوں کی تعمیر کی گئی۔
- غریبی لائن سے اوپر لانے کیلئے اقوام مندرجہ فہرست اور اقوام درج فہرست کی امداد کے لیے مقررہ نشانہ کی صد فیصد تکمیل۔

ترقیاتی پروگراموں کو کامیاب بنانے کیلئے حکومت کو تعاون دیں

محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ اُترپردیش کیجانب سے جاری

2 - 10

मासिक समाचार पत्रिका
मुअल्लिम-ए-उर्दू

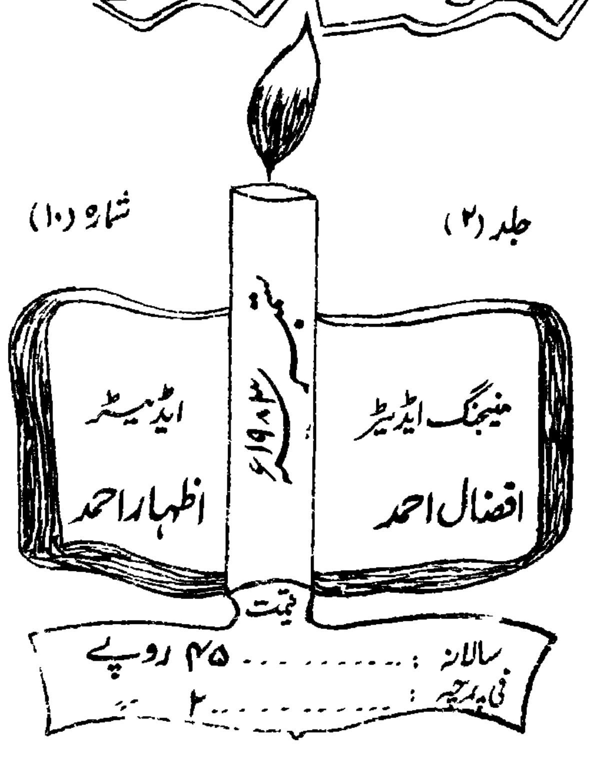
لکھنؤ

معلم اردو

SEP., 1983

عالمی ادب نمبر حصہ اوّل

ماہنامہ معیار اردو لکھنؤ



جلد (۲) شمارہ (۱۰)

ستمبر ۱۹۸۳ء

مینجنگ ایڈیٹر
افضال احمد

ایڈیٹر
اظہار احمد

قیمت

سالانہ : .... ۲۵ روپے
فی پرچہ : ۲

جرنلسٹس پبلی کیشنز ۱۹/۵۰۰ راما دھین سنگھ روڈ۔ لکھنؤ کے اظہار احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و مالک نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر $\frac{۵۰۰}{۱۹}$ راما دھین سنگھ روڈ لکھنؤ سے جاری کیا۔

اس شمارہ میں

دو باتیں

ادارہ "معلم اُردو" اپنا "عالمی ادب نمبر" اس معذرت کے ساتھ پیش کر رہا ہے کہ یہ نمبر آپ کی خدمت میں قدرے تاخیر سے پہونچا ہے اس تاخیر کے لیے کوئی جواب پیش کرنا ہمارا قطعی مقصد نہیں ہے — جب اُردو کے سبھی ادبی جریدے غیر معمولی تاخیر سے شائع ہو رہے ہیں تو "معلم اُردو" جیسا انتہائی ادنیٰ ادارہ اگر اپنی دو سالہ زندگی، میں پہلی مرتبہ اپنا پرچہ تاخیر سے پیش کرے تو اس کے لیے کوئی جواز پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور تاخیر بہرحال تاخیر ہے اُس کا کوئی جواز ہو بھی نہیں سکتا۔

البتہ معذرت اس بات کے لیے ضرور ہے کہ ہم "عالمی ادب نمبر" — حسب منشا نہیں پیش کر پا رہے ہیں اصل میں اردو میں عالمی ادب کی جھلکیاں ہی پیش کر پاتا اپنے آپ ایک دشوار امر ہے، یہ ایک بڑا پروجکٹ ہے جس پر کام کرنے کیلئے ماہرین کی ایک ٹیم درکار تھی ادارہ "معلم اُردو" نے یہ کام اپنے ذمہ لیتے وقت یہ نہ سوچا تھا کہ اس کام کی نزاکت کیا ہے، اس لیے ہم یہ نمبر آپ حضرات کی خدمت میں محض اس حیثیت سے پیش کر رہے ہیں کہ عالمی ادب کے شہ پاروں کا یہ شمارہ ایک مختصر تعارف ہے۔ آگے چل کر ہم زیادہ بڑے پیمانے پر یہ کام تب کریں گے جب اس کیلئے ہمیں ماہرین کا تعاون حاصل ہو سکے گا۔

اس شمارہ میں ہم نے اپنی حد بھر اس امر کی کوشش کی ہے کہ جدید تر عالمی ادب کے اہم ترین معماروں کی نمائندگی ضرور ہو جائے اس کوشش کے تحت ہم اس شمارہ میں سارتر، بریخت اور

ٹی، ایس، ایلیٹ جیسے اہم ادیبوں کے شہ پاروں کا انتہائی مختصر انتخاب پیش کرنے جا رہے ہیں جیسا کہ سبھی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سارتر، برنجت اور ایلیٹ کے اثرات ہمارے جدید تر اردو ادب پر بھی نہایت گہرے پڑے ہیں، ہم چاہتے تو یہی تھے کہ اس انتخاب میں کامو اور کافکا کی نمائندگی بھی ضرور ہو جائے، مگر چونکہ یہ شمارہ یونہی غیر معمولی تاخیر کا شکار ہو چکا ہے، مزید تاخیر سے بچنے کے لیے ہم ان دو شہرۂ آفاق فنکاروں کی نمائندگی کے بغیر ہی یہ انتخاب آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں لیکن ہم اپنے پڑھنے والوں کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ جب بھی ہم اس نوعیت کا کوئی دوسرا انتخاب پیش کریں گے تو ان فنکاروں اور بعض دوسرے اہم فنکاروں کی بھی بھرپور نمائندگی کی جائے گی۔

اس شمارہ میں مذکورہ تین عظیم ادیبوں کے انتخابات کے علاوہ جدید نیگرو امریکی شاعری اور جدید ایرانی شاعری کا ایک انتخاب بھی مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ جدید امریکی ادب میں نیگرو شاعری کا خاص مقام ہے، یہ شاعری دراصل امریکہ کے مادی نظام حیات کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے، اس طرح ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد جو جدید ایرانی شاعری عالم وجود میں آرہی ہے، اس سے قطع نظر کہ ایران کے اسلامی انقلاب کی کیا سیاسی اہمیت ہے اور اس کے باوجود کہ یہ ہنگامی ادب ہے اور ہنگامی ادب آگے چل کر اپنی افادیت بھی کھو دیتا ہے، ایرانی انقلاب کے بعد ایرانی معاشرہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی ایک جھلک اس شاعری میں ضرور دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

اظہار احمد

بریخت کی ڈرامائیت اشاروں کے بجائے یہ احساس دلانے کی کوشش ہے کہ تم جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ زندگی کا ایک تجربہ ہے جو تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اب جو کچھ ہونا ہے تھیٹر کے باہر ہونا ہے اور تم اُس جرم سماجی ڈھانچے کا حصہ ہو جو تھیٹر کے باہر ہے اور تم یہاں تھوڑی دیر کے لیے اپنی زندگی سے کٹ کر آئے ہو اور تمہیں وہیں واپس جانا ہے، اور کچھ کرنا ہے تو وہیں کرنا ہے یعنی تھیٹر بھڑاس نکالنے کی جگہ نہیں ہے — تھیٹر سیکھنے اور سمجھنے کی جگہ ہے اور جو کچھ تم یہاں سیکھو گے وہ تمہارے ساتھ باہر جائے گا — اور جو کچھ تمہارے ساتھ باہر جائے گا وہ تمہارا ہوگا اور جو تمہارا ہوگا وہ تمہارے کام آئے گا۔۔

———— بریخت

منظر پس منظر اور

بریخت سے پہلی ملاقات

کالی داس کے اس دیش میں بریخت کا نام میں نے پہلی بار سنا ہے۔ کچھ یاد آتا ہے۔ اس صدی کی چالیسویں دہائی تھی۔ ہٹلر کی چھیڑی ہوئی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ فاشزم ظلم اور بربریت کے سیاہ علم سرنگوں تھے، ہیروشیما اور ناگاساکی آسمان میں ایٹمی چھتریاں کھل کر بند ہو چکی تھیں۔ آگ کے بادل چھٹ چکے تھے۔ جن کو زندہ رہنا تھا نہ مرنا تھا کراہ رہے تھے خون اور پیپ میں لتھڑے ہوئے اور جن کو جینا تھا جی رہے تھے کچھ زنداں میں کچھ زنداں کے باہر۔ اور زنجیروں کی جھنکار سی آ رہی تھی قریب بھی اور دور بھی۔

تب میں کلکتہ میں تھا اپنی صحافتی زندگی کے آغاز کے شہر میں ادبی زندگی پہلے ہی شروع ہو چکی تھی — بہار کے چھوٹے شہر میں جہاں گوتم بدھ کا مندر ہے جو ناگاساکی اور ہیروشیما سے بہت دور ہے جہاں گوتم بدھ کے بہت سے ماننے والے جل کر راکھ ہو گئے۔ اس پراچین سنسکرت کے دیش میں جہاں آج بھی شکنتلا کی ہرن جیسی زخمی آنکھوں کو وہ نہیں پہچانتا جس نے اُن کو زخمی کیا ہے جہاں آج بھی نہ جانے کتنے رام سچ کو اندھیروں کی زنجیروں سے چھڑانے کے لیے بن باس کاٹ رہے ہیں، جہاں آج بھی جھوٹ اور مکاری اور جہالت کے گھنے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو پتہ نہیں چلتا کہ سورج کب نکلا اور کب ڈوب گیا جہاں جہاں،

تب میں کلکتے میں تھا۔ تب دن کتنے کالے تھے اور راتیں کتنی اُجلی۔ ان دنوں کی بات ہے جب شہر کا دل — تجارت کے بڑے تلے کو لتار سے چمکتی ہوئی سڑکوں، چمکتی ہوئی دوکانوں اور دھواں اگلتی ہوئی چمنیوں تلے، پٹریاں بدلتی ہوئی ٹراموں کے پہیئے تلے زندگی کا ملبہ بو سہارا ہوا، ننگے بدن سیاہ انسانوں کے تھکے تھکے قدموں تلے ہگلی کے میلے پانی میں بہتی ہوئی کشتیوں اور گیتوں کے بوجھ تلے ... شہر کا دل بسند ہونے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور دھوپ میں نہائی ہوئی دوکانوں اور دھواں اگلتی ہوئی چمنیوں تلے پٹریاں بدلتی ہوئی ٹراموں کے پہیوں تلے زندگی کا

منو بوجھ اٹھائے ہوئے ننگے بدن
سیاہ انسانوں کے تھکے تھکے قدموں تلے
ہگلی کے میلے پانی میں بہتی ہوئی کشتیوں
کے بوجھ تلے شہر کا دل پرندے کی
طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور دھوپ میں
تپتی ہوئی ہوا میں اڑنے کو بے قرار تھا۔
ہاں یہ انھیں دنوں کی بات ہے
جب تھیٹر کا جادو مجھ پر چلنا شروع ہوا
یہ جادو ویسے ہی شروع ہوا تھا برسوں
پہلے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور
آغا حشر کے کسی ڈرامے میں مجھے بدنصیب
شہزادے کا رول ملا تھا۔ تفصیلات
ذہن سے نکل چکی ہیں۔ اتنا یاد ہے کہ
اسٹیج کی روشنی میں کردار شاہی
زرق برق لباسوں میں رہتے تھے۔
بڑی بڑی مونچھوں اور آنکھوں سے
چنگاریاں نکلتی ہوئی۔ ان کے قدم
جب اٹھتے اور پڑتے تھے تو دل ہل
جاتا تھا۔ سب چیخ چیخ کر بات کرتے
ان کے ہاتھ ہوا میں اڑتے تھے، بات
بات پر میان سے تلواریں نکل جاتی
تھیں مالا اپنی ممتا کی دہائی دیتی تھی اور
سینے پر وہ ہاتھ مارتی تھی گلے میں
پڑے ہوئے ہار کے موتی چمکتے تھے،
اور کبھی کبھی ہار کے موتی ٹوٹ
جاتے تھے اور موتی بکھر جاتے
تھے، آواز میں طوفان کی تیزی
ہوتی تھی اور الفاظ پہاڑ کی بلندیوں
سے (جو کرداروں جتنے اونچے) ہوتے
تھے۔ چٹانوں کی طرح لڑھکتے
تھے .... شہزادیاں روتی تھی اور اپنی
پاکبازی کا یقین دلاتی تھیں، کوئی
گرفتار ہوتا تھا ...... سر کوئی پکڑ
کر شیر کے پنجرے میں ڈال دیا
جاتا تھا ..... جو کچھ ہوتا تھا زور و
شور سے ہوتا تھا۔ خوب گانا ہوتا
تھا، خوب باجا بجتا تھا۔ لوگ
ٹکٹ خرید کر تماشا دیکھتے تھے جہاں
ہنسنا چاہتے وہاں روتے تھے جہاں
رونا چاہتے وہاں ہنستے تھے ۔ یہ
میں اب کہہ رہا ہوں اس وقت میرے
ذہن میں یہ سب کچھ نہ تھا۔ جو کچھ
تھا احساس کی جبلی سطح پر تھا۔ جو
تھیٹر مجھے کھینچ کر وہاں لے جاتی
تھی وہ اس احساس کی تلاش تھی کہ
آخر اسٹیج کا پردہ ہٹتے ہی سب کچھ
بدل کیسے جاتا ہے ... جو لوگ
پاس بیٹھے ہیں ٹوٹی ہوئی چرخ چوں
کرتی ہوئی کرسیوں پر ان کا کوئی
وجود نہیں۔

اصل تھیٹر وہ ہے جہاں
روشنی ہے، اور جہاں سرخ
ہرے کاسٹیوم میں چمکتے ہوئے
تاج پہنے ہوئے لوگ آتے ہیں،
اور دہاڑتے ہیں ...... تلواریں
چمکاتے ہیں .... دھمکیاں دیتے
ہیں اور چلے جاتے ہیں، کون لوگ
ہیں؟ ..
کوئی بھی ہوں ہیں بڑے زوردار
.... کہیں تو ہوتے ہوں گے، ایسے
نیک لوگ جو سچ اور انصاف
کے لیے سر کٹا لیتے ہیں .. آئی
سی بات تھی کہ تھوڑی دیر کی دنیا
بدل جاتی ہے اور میں اس دنیا سے
اس بدلی ہوئی دنیا میں چلا جاتا تھا۔
یہی تبدیلی وہ جادو تھی جو کھینچ کر
مجھے لے جاتی تھی .... ان
دنوں باہر سے تھیٹر کمپنیاں
بھی باہر سے آتی تھیں، اور
مقامی کلب بھی رات دن ایک
کر کے ناٹک کرتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میرے
ماسٹر صاحب مجھے اسٹیج کے پیچھے
لے گئے انھوں نے مجھے دو تین
جملے رٹوائے کچھ، کٹ جاؤں گا،
مر جاؤں گا، قسم کے جملے اور جب
میں نے جملے رٹ لیے تو انھوں نے
کہا کہ اب ادھر سے آؤ، اور ادھر
جاؤ، یوں نہیں یوں چلو مڑو تو یوں
مڑو کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں
کو تمھاری پیٹھ نہیں، تمھارا
چہرہ نظر آئے ..... اور جب
جملے جو میں نے تمھیں سکھائے
ہیں، بولو ...... اور جو میں نے
منہ کھولا تو آواز نکلی ہی نہیں۔
.... کچھ چوں،
چوں کی آواز آئی اور میں، جیسے زمیں پھٹے

گلے میں پھنس گئے ہوں۔ ماسٹر صاحب کو آگیا تاؤ۔ وہ گرجے تو لگا جیسے تمام درختوں سے کوے کاؤں کاؤں کرتے ہوئے اڑ گئے ہوں۔ میرا چہرہ تمتما اٹھا کانوں سے آنچ نکلنے لگی اور اب میرے منہ سے الفاظ یوں نکلے جیسے بندوق سے گولیاں نکلتی ہیں۔ ماسٹر صاحب نے مجھے گلے لگا لیا۔

رات کو دیر سے گھر پہونچا تو میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ ساری رات سپنوں میں آگ پھری رہی اور میرے سامنے سے رنگین لباسوں، لڑھکتی چٹانوں اور بدلتی ہوئی روشنیوں کے جلوس گذرتے رہے۔

آخر ڈرامہ ہوا۔ شہزادیوں اور شہزادوں کی تکرار میں ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھے اسٹیج پر ڈھکیل دیا گیا میرے کان جلنے لگے۔ میں نے کسی بڑے ایکٹر کا پان کھا لیا تھا۔ اس کی پیک گلے میں پھنس گئی تھی۔ بادشاہ نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا تھا۔ اس کی ناک پر ایک دھبہ تھا۔ مجھے لگا اس کی ناک پر ایک مکھی بیٹھی بھنبھنا رہی ہے۔ وہ بول بول کر چپ ہو گیا تو میں نے میان سے تلوار نکال لی۔ دو تین قدم بھی اسٹیج پر بڑھائے اور جو اس کی طرف مڑا بھونچکا رہ گیا اس کی ناک پر سے مکھی اڑ چکی تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ یکایک اس نے تلوار کے دستے پر ہاتھ مارا اور مجھے سب یاد آگیا اور پھر میرے منہ سے وہ الفاظ گولیوں کی طرح نکلے جو ماسٹر صاحب نے مجھے رٹائے تھے۔ وہ گرا تو میرے ہاتھ میں تلوار تالیوں کی طرح چل رہی تھی۔

کھیل ختم ہونے اور بہت ہضم ہونے کے بعد سب اسٹیج کے پیچھے جا کر سیٹوم اتارنے لگے، اور میک اپ دھونے لگے۔ لباس چھلکوں کی طرح گر رہے تھے اور اسٹیج کی دنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ مونچھوں، بالوں، تلواروں کے الگ ہوتے ہی اندر سے بالکل آدھے ادھورے پھیلے جھیلے، اکیلے مریل قسم کے لوگ نکل آئے اور یہ سب مجھے بہت برا لگا۔

شہزادے کا لباس میں نے بھی اتار دیا لیکن میک اپ اتارے بنا چپکے سے اکیلا اندھیرے میں نکل گیا جہاں سے راستہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ میرے محلے کی طرف جاتا تھا۔ گھر کا دروازہ بند تھا، میں خوش ہوا کہ سب سو رہے ہیں۔ میں نے دروازے کی پاس والی دیوار گھوڑ سوار کی طرح پار کی اور اوپر چلا گیا۔ میں نے آہستہ سے اپنی ماں کو جگایا۔ انھوں نے اتنی دیر سے آنے پر پہلے جی بھر کے ڈانٹ پلائی پھر کھانا لے آئیں۔ وہ میرے کھلنڈرے پن اور لاابالی حرکتوں کی عادی ہو چکی تھیں۔ اور وقتاً فوقتاً ابا کے سامنے میری صفائی پیش کرتی رہتی تھیں وہ سمجھ گئیں اور راتوں کی طرح اس رات بھی فلم کا آخری شو دیکھ کر آ رہا ہوں، میں نے کھانا نہیں کھایا اماں نے سوتے سوتے پوچھا کیوں نہیں کھا رہا ہے پاجی؟

میں نے کہا اندھیرے میں کیسے کھاؤں؟

روز کیسے کھاتا ہے بدتمیز؟ پھر اٹھ کر انھوں نے روشنی جلا دی اور میری طرف دیکھے بنا سو گئیں۔ میں دل ہی دل میں بہت کڑھا، میں نے سوچا یہ تو ساری محنت اکارت جا رہی ہے۔ میں نے کہا دال میں نمک زہر ہے۔

اماں غصہ میں میری طرف مڑیں اور میری صورت دیکھتے ہی اٹھ بیٹھیں۔ یہ کیا تجھے شہزادہ کس نے بنایا؟ میں نے کہا کہ تمہارے میری

بھنوؤں کو جگا کر شہزادہ کا چہرہ دکھایا گیا۔ ابا جی آ گئے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بولے یہ نالائق زندگی بھر ڈرامہ کرتا رہے گا۔ جب سو گئے تو میں نے میک اپ دھونے سے پہلے بڑے کمرہ میں جا کر موم بتی جلائی اور آئینہ میں اپنا چہرہ غور سے دیکھا، جس کو سفیدی اور سرخی نے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ میں نے اسی وقت طے کیا اب میں کبھی شہزادہ نہیں بنوں گا اب میں کبھی اسٹیج پر نہیں جاؤں گا۔

اور آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، جب میں پچاس کی سرحد پار کر چکا ہوں یہ بات بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی قسم نہیں توڑی، میں کبھی اسٹیج پر نہیں گیا۔ یہ نالائق زندگی بھر ڈرامہ کرتا رہے گا۔ ابا کو پھر یہ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے ڈرامہ نہیں کیا۔

ڈرامہ پہلے زندگی میں ہوتا ہے پھر اسٹیج پر۔

ہاں تو بات شروع ہوئی تھی یہاں سے کہ بریخت کا نام پہلی بار میں نے کب سنا؟ ذکر تھا کلکتہ کا جہاں نگر نگر کے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے اور یورپ دیش کے بھورے تلی مائل اتار اتار کر تھک جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب آئے دن مظاہرے ہوتے تھے، روز پولیس سے ٹکر ہوتی تھی۔ روز لوگ پکڑے جاتے تھے اور ستائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی بم بھی پھٹتے تھے۔ لاٹھیاں برستی تھیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا تھا — یہ وہی دور تھا جب کرشن چندر نے "برہم پترا" جیسا افسانہ لکھا، اور میں نے لکھا تھا "میں زندہ ہوں" یہ افسانہ میرے زیر طبع افسانوی انتخاب اجنبی فاصلے میں شامل ہے۔

میں لکھتا تھا افسانے ادا کرتا تھا "اخبار استقلال" کی ایڈیٹری اور کھینچتا تھا ان لوگوں کی طرف جو کلکتہ میں نئے تھیٹر کی مہم چلائے تھے — ان لوگوں میں جہاں چھیو مرزا اور اتپل دت جیسے لوگ تھے، وہاں دوسری طرف ڈاکٹر کوہن، نرنجن سین اور سلیل چودھری جیسے ابھرتے ہوئے فنکار بھی تھے۔ کچھ ادیب بھی تھے جیسے زہری کوہی راج اور سوشیل جانا۔ چھیالیس دانشور جمع ہوئے تھے۔ میں تھیٹر کی دنیا کے قریب آیا۔ ڈیوڈ کوہن کی وجہ سے کئی ایک ایسے لڑکی اور لڑکیاں جن کی زبان انگریزی تھی نئے تھیٹر کے قریب آ گئے تھے۔

انڈین پیوپلز تھیٹر کے پرچم تلے جو سٹیڈ ویلے اور ڈرامے پیش کئے جا رہے تھے ان میں ... یوں کے کچلے ہوئے ہندوستان کے نقوش ہی نہیں ابھرتے تھے بلکہ سماجی معنوں میں اجتماعی مستقبل کی تلاش کے راستے بھی دکھائی دیتے تھے اس اسٹیج پر معنوی اجتہاد اور تکنیکی اختراع کے لئے سوتے پھوٹ رہے تھے اور اس کا سب سے شاندار پہلو یہ تھا کہ نئی جہت کے اظہار میں لوک گیت اور لوک ناچ کی روایات سے بے دھڑک فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔ انا بھاؤ ساٹھے، امر شیخ اور گوانکر کی Stage presonse اپنی Dynamisrol کی وجہ سے آج بھی میرے ڈرامائی شعور کا مشہور رکن حصہ ہے۔ جو لوگ پرانے تھیٹر کو بدل رہے تھے وہی نئے تھیٹر کو جنم دے رہے تھے۔ یہ بڑا جری قدم تھا جس نے پارسی تھیٹر اور نوٹنکی کی روایات کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ بریخت کی کسی بھی غیر ملکی فنکار کا ذکر کسی دوسرے ملک کے تہذیبی اور سماجی زندگی کے context میں ہوتا ہے تو احس،

کے فن کی معنویت اور اہمیت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کی Ralevenae کیا ہے۔ ایک خاص سماجی صورت حال میں جو اس وقت پورے دیش کے دھڑکتے ہوئے شہر کلکتہ کی تھی، بریخت کے ذکر کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہی میں نے ان جزئیات کا ذکر کیا ہے جو ایک طرح سے گریز معلوم ہوتی ہیں۔

ہوا یوں کہ کلکتہ کے مضافات میں اپنا کر اپنا شو پیش کرنے کی دعوت دی گئی ڈیوڈ کوہن نے کہا تم بھی چلو۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ہم ٹرین سے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد شہر کی چمنیاں دور رہ گئیں اور آنکھوں کے سامنے ہریالی ہی ہریالی پھیل گئی۔ دھیان کے کھیت لہرا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کے آگے چھوٹے چھوٹے تالاب چمک رہے تھے۔ جن میں پانی اور دھوپ کی فراوانی تھی۔ تالابوں میں عورتیں نہا بھی رہی تھیں، اور کیلے کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر برتن بھی مانجھ رہی تھیں ان کے نیم عریاں جسم آہنگ سے لرز رہے تھے۔ گاڑی آگے اڑی جا رہی تھی اور یہ مناظر پیچھے راستے میں ڈیوڈ کوہن نے پبلو نرودا کی نظم راستہ گاتے بجاتے کٹ گیا، شام کو کھلے میدان میں ڈرامہ ہوا بڑی بھیڑ تھی جو کچھ ٹوٹے پھوٹے اسٹیج پر پیش کیا گیا اسے ملا جلا پروگرام کہنا چاہیئے . . . یہ فن کا حیرت انگیز تجربہ تھا ایسے ماحول میں. جہاں کلاسیکی تھیٹر کے در و دیوار نہیں تھے جہاں ونگ اور لائٹ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ محض پٹرومکس کی روشنی میں ڈرامائی پیش کش تھوڑے سے میک اپ اور لباس کی تبدیلی اور الفاظ کی معنویت کی بدولت دلوں کو دھڑکانے اور ایک جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب تھی۔ یہ ایک طرح سے خود رو قسم کا ماحولی تھیٹر تھا جس میں ہدایت اور اداکاری کے بندھے ٹکے کتابی اصول کند چھری کا کام کرتے تھے جب اداکار گا گا کر ناچ ناچ کر تھک گئے۔ جب تماشائیوں کے چہرے تمتما اٹھے اور ہوا سانس کی طرح گرم ہو گئی تو کھیل ختم ہوا تماشائی کھیتوں اور پگ ڈنڈیوں کے درمیان کھو گئے اور ہم سب آدھی رات کے بعد پھوس کے چھپر تلے ڈھیر ہو گئے۔ لیکن کسی کو نیند نہیں آئی — جب نیند نہیں آتی تو باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ پھوس کے چھپر تلے تھیٹر کے فن کار اور بکھرے ہوئے تھے، اور بڑی ڈھٹائی سے فن کاروں کو کاٹ رہے تھے۔ اور فن کار ننگے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اور ہنستے ہنستے باتیں کر رہے تھے بہار چاندنی میں نہائے کھیت سرسرا رہے تھے۔ جھینگروں نے آسمان کو چاند سمیت سر پر اٹھا لیا تھا اسٹیج پر خنک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں شکسپیری تھیٹر کرداروں پر گفتگو چھڑ گئی ہیملٹ او تھیلو کنگ لیئر جولیس سیزر — ان سب کی المناکیوں کا تلاطم انسانی قسمت کی نیرنگیاں۔ خیر و شر کا تصادم تخت و تاج، بے وفائیاں اور وفاداریاں، کردار اور الفاظ چڑھتے دریا کی طرح موجزن اور ان کی فلسفیانہ مداریوں میں زندگی کے راز کھلتے ہوئے گتھیاں پڑتی ہوئی۔ تاریخی مد و جزر میں انسان تنکوں کی طرح بہتے ہوئے اور تصادموں کے پیچھے وقت کی سماجی محرکات کا ناقابل شکست ہاتھ جو کبھی دکھائی نہ دے۔ پھر

ابسن اور چیخوف کے ڈرامہ کا نیا موڑ۔ ایک طرف ابسن کے ڈرامے "گڑیا گھر"، "بھوت" اور "سماج کے ستون" اور دوسری طرف چیخوف کے ڈرامے "تین بہنیں"، "ماموں وانیا"، "چیری کے باغ" اور "سمندری بگلا" پچھلی صدی کی بکھری ہوئی زندگی کی ڈرامائیت کے نقیب ہیں۔ جو بوسیدہ اخلاقی قدروں اور جابر سماجی ضابطوں کے اندرونی تصادم اور تضادات سے جلا پاتے ہیں۔ بظاہر سیدھی سادی حقیقت پسندی، لیکن انسان کی خود شکستگی کی المناک بے بسی کا بھرپور اظہار جس میں خود اپنی آگ میں جل کر بجھ جانے والی چنگاریاں چمکتی ہیں۔ اور احساس و تصور میں جذب ہو جاتی ہیں۔ لیکن تھیٹر کے صاف ستھرے طبقوں کے اس حصار سے نکلتا ہے جنھوں نے جمالیاتی حظ کو بھی تمام تہذیبی قدروں اور ثروتوں کو بھی اپنا اجارہ بنا لیا ہے سیدھی منطق ہے جس کے پاس قوت خرید ہے اس کے پاس سب کچھ ہے جس کی جیب خالی ہے اس کا دل و دماغ بھی خالی ہے لیکن کیا ایسا ہی ہے؟ دو اور دو چار؟ سفیدی کہاں ختم ہوتی ہے اور سیاہی کہاں شروع ہوتی ہے، کیا لکیر کھینچ کر یہ دکھایا جا سکتا ہے؟

اور باتوں میں یکایک کسی نے نام لیا شروع میں میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کوئی نام ہے یا دور جنگلوں سے آتی ہوئی ڈھول کی گمک۔

برتولت بریخت، کیا؟

برتولت بریخت! یہ ایک جرمن شاعر کا نام ہے جس کے زیادہ تر شاندار ڈرامے جلا وطنی میں لکھے گئے۔ لیکن جلا وطنی کیوں؟ جب فاشزم سیاہ آگ جرمن کے طول و ارض میں پھیلی تو یہ بریخت کے پاؤں تلے وہ زمین جلنے لگی جس کے دریاؤں اور کھیتوں کی ہواؤں میں سڑکوں اور ریستوران کی گہما گہمی میں اس نے گوئٹے اور ہیگل کے فلسفیانہ تجربے کئے تھے اور جدلیات کے سماجی معنی تلاش کئے تھے۔ اس تلاش نے اسے مارکسزم تک پہونچایا تھا۔

بات چیت میں بار بار ایک ہی ڈرامہ کا نام گونج رہا تھا۔

صبح ہوئی تو درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور دھوپ، دھان کے کھیتوں پر سکھا رہی تھی۔

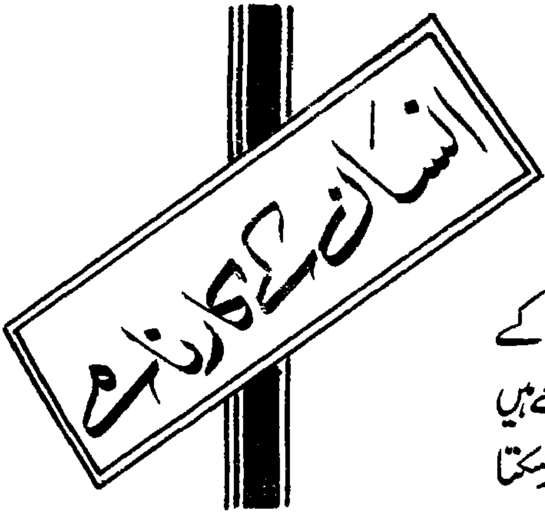
واپسی پر گاڑی میں کسی نے پوچھا!

"بریخت کو پندرہ سو سال جلا وطنی میں کیوں گزارنا پڑے؟"

پڑھو معلوم ہو جائے گا۔

بہت تلاش کے بعد ایک مدت کے بعد مجھے یہ ڈرامہ پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ معنی شش جہات سے گزرنے کا یادگار تجربہ ثابت ہوا۔ پھر میں نے وہ جرمن فلم دیکھی جو اس ڈرامے کے طرز روش کو جوں کا توں پیش کرتی ہے اس کا گہرا اور تیز ..

دراصل کرداروں اور واقعات کے اتصال باہم سے نکھرتا ہے۔ اس کا ایک لمحہ جاڑے کی رات میں سورج کی طرح طلوع اور غروب ہوتا ہے یہ تاریکی اور روشنی کا ہیجان پرور تجربہ ہے۔ جس میں دل بھی سورج کی طرح طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ صدیوں پر پھیلی ہوئی انسانی معاشرہ کی تاریخ جمالیاتی خود آگہی کا افق بن جاتی ہے، صبر و تشدد کی وہ تمام قوتیں جو انسانی اخلاقیات کی پُر فریب قدروں کا سانچہ تیار کرتی ہیں۔ بھیڑیوں کی طرح بے بس اور کمزور انسانوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہیں۔



پہاڑوں کے اوپر
اڑتا ہے انسان بغیر کسی وقت کے
اس کے کارنامے بہت اونچے ہیں
مگر سب کیلئے روٹی وہ پیدا نہیں کر سکتا
خدا کی مار
آخر کیوں سب لوگ سیر نہیں ہو سکتے

اک برّے اعظم سے دوسرے تک
انسان ایک گھر سے دوسرے گھر بات کرتا ہے
لاکھوں ہاتھ
ایک دوسرے کی طرف اٹھتے ہیں
خدا کی قسم
اگر یہ تمام متحد ہو جائیں

یہودی کی قحبہ میری سینڈوز کی داستان

نیورم برگ میں
جب قانون نئے کچھ جاری کیے گئے
شاہد رعنا
مرد غلط کے ساتھ جو کل شب سوئی تھی
صبح ہوئی تو شام ڈھلے تک روئی تھی
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
زور زور سے پیٹا گیا جب ڈھول تو ڈھول کا شور بڑھا
اشب وہ اس شہر میں جانے کیا کیا کہنے والے ہیں
وہ بستی پر نازل کوئی حادثہ کرنیوالے ہیں

میری سینڈوز

بال ترے عاشق کے سندر کالے ہیں
کل کی طرح نہ پیار سے اپنے جسم سے لپٹاؤ اس کو
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
زور زور سے پیٹا گیا جب ڈھول کا شور بڑھا
اشب وہ اس شہر میں جانے کیا کیا کرنیوالے ہیں۔

وہ بستی پر نازل کوئی حادثہ کرنیوالے ہیں
ماں اب تالے کی چابی دے دے مجھ کو
اتنے ظالم اتنے برے
ہو نہیں سکتے میرے شہر کے لوگ ابھی
چاند ابھی پہلے کی طرح
سندر البیلا لگتا ہے
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
زور زور سے پیٹا گیا جب ڈھول تو ڈھول تو ڈھول کا شور بڑھا
اشب وہ اس شہر میں جانے کیا کیا کرنیوالے ہیں
وہ بستی پر نازل کوئی حادثہ کرنے والے ہیں
صبح ہوئی
نو بجتے ہی، اس روز وہ تنہا، صرف قمیص سی پہنے ہوئے
پورے شہر میں گھوم گئی
گلے میں لٹکا رکھی تھی ایک تختی اس نے
سر پر کوئی بال نہ تھا
گلی گلی میں اس کی ہنسی اڑائی گئی
خالی ٹھنڈی آنکھوں سے وہ تکتی تھی
اور چپ چپ حیران وہ چلتی جاتی تھی
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
اشب وہ اعلان کرے گا
اشب وہ لوگوں سے مخاطب ہوگا
وہ کچھ بولے گا ...

۲۰ نکاتی پروگرام :-

غریبوں کی بھلائی کی عظیم جدوجہد

اُتر پردیش سرکار کی یہ واضح پالیسی ہے کہ ترقی کے دور میں کوئی بھی شخص یا طبقہ نظر انداز نہ رہ جائے نئے قومی ترقیاتی پروگرام کے تحت سرکار خصوصی طور پر کوشاں ہے کہ طویل مدت تک پسماندہ اور پریشان حال لوگوں تک ترقی کا فائدہ پہونچے، بے زمینوں کی زمین۔ مزدوروں کو گذر بسر لائق مزدوری۔ بندھوا مزدوروں کی آبادکاری۔ دور دراز گاؤں میں بھی پینے کے پانی کا انتظام۔ چھوٹی دیہی صنعتوں کے قیام۔ روزگار کے اور زیادہ مواقع۔ گاؤں میں خاص طور سے ہریجن بستیوں میں بجلی کی سہولت وغیرہ ایسے کام ہیں جن کی جانب سرکار کی خصوصی توجہ ہے۔ ان سبھی زمروں میں اُمید افزا کامیابی ملی ہے زرعی پیداوار میں اضافہ بھی ہوا ہے جس سے کسان طبقہ خوشحال ہوا ہے۔

ترقی کی کہانی اعداد وشمار کی زبانی

زمین کی تقسیم (گاؤں سبھا کی فاضل زمین کا الاٹمنٹ)	ساڑھے چھ لاکھ ہیکٹر سے بھی زیادہ
فائدہ حاصل کرنے والوں کی تعداد	تقریباً ۱۹ ہزار
سیلنگ کے تحت حاصل شدہ زمین	تقریباً ۶۵ر۲ لاکھ ہیکٹر
فائدہ پانے والوں کی تعداد	تقریباً ۹۵ر۱ لاکھ
سیلنگ الاٹیوں کو مالی امداد	۸۳-۱۹۸۲ میں ۲ر۳۲ر۶۹ لاکھ روپیہ فروری ۸۳ تک
کمزور طبقوں کو مکانوں کے لیے زمین کا الاٹمنٹ	۵.۵ ۱۶۱۳ — اہل لوگوں میں سے ۴۲۷.۱۶۱ کو
بندھوا مزدوروں کی آبادکاری	۸۴۰۴ (مارچ ۱۹۸۳)
مالی امداد	۱۹۲۹۶ لاکھ روپیہ مارچ ۱۹۸۳ تک
قلت والے گاؤں میں پینے کا پانی	۱۴۹۳۲ گاؤں (مارچ ۱۹۸۳) تک
مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت قائم کی گئی صنعتیں	۸۷۲۴۹
دیہی اور چھوٹی صنعتوں میں روزگار کے مواقع	۳۸۲۴۱۱ (اپریل ۱۹۸۳ تک)
گاؤں میں بجلی	۵۳۳۷۵ " "
ہریجن بستیوں میں بجلی	۲۲۷۰۲ (" ")
کھیت مزدوروں کو کم سے کم اجرت دلانے کے لیے معائنوں کی تعداد	۸۱۳۴۳ " "
غذائی پیداوار	۷۸.۲ لاکھ میٹرک ٹن کی ریکارڈ خریف پیداوار

پردیش میں ترقی کیلئے ریکارڈ قائم ہو رہے ہیں

(اطلاعات ورابطہ عامہ اتر پردیش)

زندگی بے معنی ہے...؟

...... سارتر

ہم لوگ زندہ کیڑوں کا ایک ڈھیر تھے — ہیجان میں مبتلا — ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے — ہمارے یہاں زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں — یہ پیڑ، یہ پودے یہ درخت سب مہمل ہیں — اور میں کمزور نرم اور نازک انسان — اپنے سرمئی خیالوں میں گم — میں بھی مہمل ہوں — یہاں تک کہ میری موت بھی مہمل ہوگی — میری لاش میرا خون سب مہمل ہیں" —

سارتر کے شہرۂ آفاق ناول
ناسیا سے ایک اقتباس

سارتر کا فکری سرچشمہ

پاشا رحمان

سارتر کے دادا اپنی بیوی سے کچھ اس طرح ناراض تھے کہ چالیس سالہ ازدواجی زندگی میں انھوں نے کبھی اپنی شریک حیات سے گفتگو نہیں کی۔ ہاں کبھی کبھی اشاروں میں باتیں ہو جاتیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس صورتحال کے باوجود ان کے یہاں پابندی سے بچے پیدا ہوتے رہے سارتر کا باپ ژاں باپٹسٹ JEANBAPTISTE بھی اسی دور کی تخلیق تھا۔ ایک طرف باپ کی گھڑکیاں دوسری طرف گھر کا افسردہ افسردہ سا ماحول ۔۔۔! اس کشیدگی نے سارتر کے باپ کے اندر مستقل ذہنی کشمکش پیدا کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہکلانے لگا ۔۔! اسے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے الفاظ مشکل سے ملتے ۔۔۔! اور یہی الفاظ کی تلاش" اس کے باپ سے منتقل ہو کر ژاں پال سارتر کا مقصد حیات بن گئی۔!

ژاں باپٹسٹ بحریہ میں افسر تھا۔ اسے کوچین چائنا بخار FEVER نے آدبوچا۔ COHIN CHINA اس کی صحت مستقل گرنے لگی۔ اسی دوران اس کی ملاقات اینے میری سوئٹزر سے LNNE-MARIE SCHWNEITZER ہوئی جو بالآخر شادی پر ختم ہوئی۔۔۔ سارتر لکھتا ہے:" میں عالم وجود میں آنے والا ہی تھا کہ میرے باپ نے موت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ لی۔" جب اس کی ماں بیس برس کی تھی تو اسے دو عجیب و غریب اجنبیوں سے واسطہ پڑا۔

"ایک میں اور دوسرا میرا نحیف و نزار مردہ بدست زندہ باپ جو آخرکار ملک عدم کو سدھار گیا۔"

سارتر مزید لکھتا ہے "لیکن ان حالات سے مجھے دو فائدے ہوئے۔ نو ماہ تک میری ماں کا کرب اس کے جسم سے میرے جسم میں منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک مقراض نے ایک دن ماں اور بیٹے کا یہ عجیب و غریب رشتہ ختم کر دیا۔۔۔ میں عالم وجود میں آچکا تھا میرے باپ کی موت میرے لیے عظیم واقعہ تھا۔ اس نے میری ماں کو پھر سے افلاس کی بیڑیاں پہنا دیں اور مجھے آزادی کا شعور بخش دیا۔"

" سارتر کہتا ہے:" مرتے تو سبھی ہیں لیکن مرنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ بعد

کے حالات سے مجبور ہو کر میں خود کو مجرم سمجھنے لگا — ہمیشہ حساس یتیم نہ جانے کیوں خود کو ملزم سمجھنے لگتا ہے — شاید اس لیے کہ اس کے جنم لیتے ہی اس کے والدین عالم بالا کو کوچ کر جاتے ہیں — لوگ اس کے چہرے سے متنفر ہو جاتے ہیں — لیکن میری یتیمی نے میری اہمیت بڑھا دی۔ میرے والد نے مر کر بھی مجھ پر احسان کیا تھا — میری نانی کبھی کبھی کہا کرتی تھیں کہ میرے باپ نے اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کے لیے موت کی آغوش میں پناہ لے لی۔ میری ننھیال والے طویل العمر تھے۔ اس لیے میری نانی کو کبھی کبھی یقین ہی نہیں آتا تھا کہ تیس سال کی عمر میں بھی کوئی مر سکتا ہے اُنہیں کبھی کبھی شک ہونے لگتا ہے کہ اُن کا کوئی داماد بھی تھا۔"

اس کی ماں کے سرہانے بھرپور کے ایک نوجوان افسر کی تصویر رکھی ہوئی تھی — کھلی کھلی آنکھیں — گول لیکن گنجا سر — چوڑی چوڑی مونچھیں۔ لیکن ایک روز نامساعد حالات سے مجبور ہو کر جب اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تو وہ تصویر غائب ہو گئی۔ وہی تصویر جسے ننھا سارتر روزانہ صبح اٹھ کر پیار بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔

سارتر بچپن سے لاغر، نحیف، بیمار اور کوتاہ قد تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے باغ میں کھیلتے رہتے وہ للچائی ہوئی نظروں سے اُنھیں دیکھتا — لیکن کوئی بھی اسے اپنے ساتھ کھیلنے کو نہ کہتا وہ ایک باغ میں ایک درخت سے دوسرے درخت، ایک پودے سے دوسرے پودے اور پھولوں کے ایک جھنڈ سے دوسرے جھنڈ تک مارا مارا پھرتا۔ لیکن اس نحیف دنیا اور بدہیئت بچے کو کوئی خوش آمدید کہنے کو تیار نہ تھا — وہ مایوس ہو کر اپنی قیام گاہ میں واپس چلا آتا — اور اس کے بعد ننھا سارتر اپنے خوابوں کے سنہرے دیس میں کھو جاتا — خواب جو ہر لحظہ ٹوٹتے پھر بنتے — پھر بکھرتے پھر یکجا ہو جاتے — ا

یہ وہ حالات تھے جن میں سارتر کا بچپن گزرا تھا۔ فرائڈ نے کہا ہے "اوائل عمر کی یادیں خواہ کتنی ہی غیر اہم اور لاتعلق معلوم ہوں، ذہن میں محفوظ رہتی ہیں اور آگے چل کر شخصیت کی تعمیر میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔" انسان کا بنیادی مقصد حصول مسرت ہے اس کی زندگی کی مختلف منازل میں مختلف مقاصد کی یافت سے ہی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول میں رکاوٹیں یا ان کی سمت پیش قدمی میں حائل ہونے والے حصاروں سے قنوطیت پیدا ہوتی ہے۔ نفسیات میں ان رکاوٹوں کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں بین الافرادی حصار" INTERPERSONAL BARRIER اور درون ذو حصار" INFRA PERSONAL BARRIER بہت اہم ہیں۔ سارتر کو اپنی زندگی میں ان دونوں قسم کی رکاوٹوں سے سابقہ پڑا۔ معاشرہ ایک مفلس، یتیم اور لاوارث بچے کو وہ مقام دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ جو اسی معاشرے کے دوسرے طبقوں کے بچوں کو حاصل ہوتا ہے۔ سارتر کے خواب بھی اعلیٰ طبقوں کے بچوں سے مختلف نہ تھے لیکن قدم قدم پر رکاوٹوں کی وجہ سے یہ خواب حقیقت کا روپ نہ ڈھل سکے۔ وہ بھی باغ میں دوسرے بچوں کی معیت میں پھولوں اور پودوں سے کھیلنا چاہتا تھا اس کے حلق سے بھی معصوم قہقہے نکلنے کو مچلتے تھے، لیکن جس معاشرے میں وہ سانس لے رہا تھا وہ اسے اس کی اجازت دینے کو تیار نہ تھا۔ ان حالات میں وہ سکڑ کر خود اپنی ذات کے خول میں مقید ہو کر رہ گیا۔ اس کے اور حصول مسرت کے درمیان ایک طبقاتی حصار موجود تھا۔ اس حصار کے پار بسنے والے افراد کو وہ حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا —

اور پھر خود اس کے اندر کا حصار بھی اسے جکڑ رہا تھا۔ اس کے پستہ قد اور پھیرائے

دن کی بیماری نے اس کی شخصیت کو بالکل غیر متاثر بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خود نوشت میں اپنی ننھیال والوں کے قد و قامت اور ان کی صحت کا ذکر بڑے فخر سے کرتا ہے ـــ اور اسی احساس افتخار کے پیچھے خود اس کا اپنا کرب بھی بار بار جھلکتا ہے ـــ!

فرائڈ نے شخصیت کی تشکیل میں انا EGO اور فوق الانا SUPER EGO کو بڑی اہمیت دی ہے، انا یہ ہے کہ انسان خود اپنا ادراک حاصل کرلے۔ شخصیت کا ادراک اور اس کو خود اس کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ یہ انا ہی ہے جس کے ذریعے اپنی ہستی اور باہر کی دنیا سے تعلقات قائم کرتا ہے ـــ شروع شروع میں انسان والدین کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں پر عمل کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ زندگی کے تجربات کی مدد سے خود اپنی راہ نکال لیتا ہے اور یہی راہ "فوق الانا" کہلاتی ہے، اس کی انا یا فوق الانا کو ٹھیس پہونچتی ہے تو وہ یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جہاں اپنے "ضمیر" کے خلاف عمل کرتا ہے وہیں اسے قنوطیت آدبوچتی ہے فرائڈ کے یہاں "ضمیر" کا دوسرا نام "فوق الانا" بھی ہے خود سارتر کو اپنی زندگی میں اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنا پڑا ـــ جس کی وجہ سے وہ مستقلاً مایوسیوں کا شکار رہا۔

اس کے والد کا اس وقت انتقال ہوگیا جب وہ چند ماہ کا تھا۔ معاشرے نے اس کے ساتھ "طفل نامطلوب" UNWANTED CHLD کا سا سلوک کیا۔ سارتر لکھتا ہے کہ اس کے باپ کے مرنے کے بعد افلاس کے ہاتھوں مجبور ہوکر جب اس کی ماں ایک نوزائیدہ بچے کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو اسے کسی نے خوش آمدید نہیں کہا۔ اس کا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا گیا۔

اس کے نانا نے اس کی ماں کے لیے ایک لفظ بھی ہمدردی کا نہیں کہا اور خاموشی سے کمرے سے باہر چلا گیا گھر میں کئی دن تک قبرستان کی سی خاموشی رہی۔ لیکن بہر حال معاشرہ میں نوجوان بیوہ غیر شادی شدہ ماں سے معزز سمجھی جاتی ہے۔ سارتر کی ماں نے نامساعد حالات سے نپٹنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتی تھی۔ اس کی غربت کا یہ عالم تھا کہ جسم پر تار تار کپڑے تھے۔ روح و تن کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے دو لقمے بھی مشکل سے ملتے ان حالات میں زندگی بسر کرتے ہوئے سارتر کے لیے اپنا جذباتی توازن برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ روزانہ صبح اٹھ کر اپنے باپ کی تصویر بڑے پیار سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن ایک دن جب اس کی ماں شادی کر کے دوسری جگہ چلی گئی اور اس کے باپ کی تصویر اٹھا دی گئی تو اس کے جذبات کو اندر سے اتنے کچوکے لگے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بکھر کر رہ گیا ـــ اب کون اس کی ضروریات زندگی کا خیال رکھے گا ـــ کون اس کے روٹھ جانے پر اس کو منائے گا ـــ اب کون اس کے افسردہ ہوجانے پر افسردہ ہوجائے گا ـــ سارتر کی دنیا تو بچپن ہی میں اجڑ چکی تھی ـــ ان حالات نے اسے ایک مکمل قنوطی بنا دیا تھا۔

قنوطیت کیا ہے؟ در اصل قنوطیت ایک ایسے رویۂ زندگی کا نام ہے جس میں عدم زندگی کو زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان کا عالم وجود میں آنا اس کی سمت بڑی بدبختی تھی قنوطیت کی بہترین مثال شوپن ہار کا فلسفہ حیات ہے۔ گوتم کی طرح وہ بھی زندگی کو ایک عذاب تصور کرتا ہے گوتم کے فلسفے کے یہ چار بنیادیں تھیں۔

۱۔ دنیاوی حقیقتیں فریب آگیں ہیں
۲۔ زندگی اور آرزو سے لگاؤ سارے دنیاوی آزار کی بنیاد ہے
۳۔ نروان حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا جائے
۴۔ جو راستہ نروان جاتا ہے وہ "دھرم" ہے (دھرم گوتم کے بتائے ہوئے آٹھ اصولوں کو کہتے ہیں)

شوپن ہار ایک تاجر گھرانے میں پیدا

اس کی ماں بڑا صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتی تھی اور اس کے دوستانہ تعلقات بہت سے ادیبوں سے تھے وہ لاابالی طبیعت کی مالک تھی اسے اپنے بیٹے سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ شوپن ہار کے باپ نے دلالت سے دل گرفتہ ہوکر خودکشی کر لی تھی۔ اس کے باپ کی بے وقت موت اور ماں کی بے التفاقی نے آہستہ آہستہ اس کے ذہن پر ایسے نقوش مرتب کیے کہ بعد میں وہ زندگی سے ہی متنفر ہوگیا۔ شوپن کے حالات بھی سارتر سے ملتے جلتے تھے۔ اسی کی طرح سارتر بھی زندگی کے بارے میں منفی رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا تھا، شوپن ہار بھی گوتم بدھ کی طرح یہ سوچنے لگا کہ کائنات کے رگ و پے میں مصائب کا زہر سرایت کر گیا ہے اس لیے موت سے پہلے آدمی غم سے پہلے نجات پائے کیوں "زندگی ہی سارے آلام کی جڑ ہے"۔ شوپن ہار کہتا ہے "موت شمع حیات کو بجھا دے گی، اس کے باوجود ہم زندگی میں خواہشات کی تکمیل کے لئے انتھک جدوجہد کر رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم پھونک سے صابن کے بلبلے بناتے ہیں، انھیں بڑے سے بڑا بناتے ہیں ...... جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ انھیں بالآخر پھٹ کر فضا میں تحلیل ہو جانا ہے ہستی BEING اور عدم ہستی NOTHINGNESS دراصل سارتر کے فلسفہ وجودیت کی دو اہم ترین بنیادیں ہیں۔ شوپن ہار ایک جگہ لکھتا ہے۔ "خواہش کے قتل کے ساتھ ساتھ وہ سارے عوامل جو ایک پیہم کشمکش اور مستقل دردِ سر کا باعث بنتے رہے ہیں خود بخود معدوم ہو جاتے ہیں — نہ کوئی خواہش — ! نہ کوئی خیال — ! نہ کوئی آرزو — نہ کوئی زندگی — ہمارے سامنے صرف عدم NOTHINGNESS ہے"۔ عدم سارتر کے فلسفے کی بھی بنیاد ہے، لیکن چوں کہ اس کی قنوطیت خود اپنے وجود پر زیادہ زور دیتی ہے، اس لیے وہ اس عدم NOTHINGHESS کی کچھ اس طرح تعریف کرتا ہے۔ عدم NOTHINGNESS کے اندر وجود SEING تو نہیں ہوتا لیکن وجود اسے سہارا ضرور دیتا ہے اور اس طرح وہ عدم کو مسخر کرنے کی کوشش کرتا ہے" — شوپن ہار اور سارتر کی قنوطیت کا فرق دو ایسے اشخاص کا فرق ہے جس میں سے ایک موج حوادث کے سامنے یہ کہہ کر ہتھیار ڈالتا ہے کہ یہ تو اس کی قسمت کا فیصلہ تھا اور دوسرا پورے حالات کا مایوس کن اور یاس انگیز تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ صدائے احتجاج بھی بلند کرتا جاتا ہے۔

عموماً قنوطیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان زندگی سے فرار حاصل کرکے یا تو تصوف میں پناہ لیتا ہے یا نطشے کی طرح خدا سے باغی ہو کر پوری کائنات کو تہ و بالا کر دینا چاہتا ہے نطشے کی خدا سے بغاوت بھی دراصل اس کی اسی قسم کی یاسیت کا نتیجہ تھی۔ مایوسی میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب انسان خالق کائنات سے یہ کہہ کر باغی ہو جاتا ہے کہ وہ قادر مطلق ہوتے ہوئے بھی اپنی سرزمین پر جبر و استحصال اور ظلم کو کیسے برداشت کر رہا ہے خدا اگر سراسر خیر ہے تو اسے فوراً "شر" کی قوتوں کا قلع قمع کر دینا چاہیئے تھا۔

نطشے نے اپنی نامرادیوں کی وجہ سے زندگی کے بارے میں کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ خدا ہی سے باغی ہو گیا — خدا سے بغاوت ایک عقیدے سے انکار نہیں بلکہ پوری تہذیبی روایت سے بغاوت تھی۔ سارتر اور نطشے دونوں کی زندگی میں کچھ ایسی یکسانیت تھی کہ سارتر نے بھی خدا کے متعلق کچھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا لیکن سارتر کی بغاوت میں وہ تندی نہیں جو نطشے کا خاصہ ہے

نطشے اور سارتر دونوں کی یاسیت خدا کے انکار کی شکل میں ظاہر ہوئی لیکن نطشے ردِ عمل کے طور پر ایک ایسی جابرانہ اور قاہرانہ قوت کا پجاری ہو گیا جو اس کے زخموں کا مداوا کر سکے۔ لیکن اس معاملے میں سارتر زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتا ہے وہ خدا کا منکر اس لیے ہے کہ وہ انسان کی عظمت کا قائل ہے۔ وہ انسانیت کے

دکھ اور درد کے مداوا کے لیے متفکر دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو صوفی نظر آتا ہے۔ تصوف کا وہ تصور جو انسان کو کارزارِ حیات سے اُٹھا کر خانقاہ میں بٹھا دے، دراصل ایسا تصور خود زندگی کے منفی نظریے کی پیداوار ہے۔ جب سارتر یہ کہتا ہے کہ "مادہ اپنے غیر شعوری طریقہ عمل میں توانائی ENERGY ہے جب کہ ذہن اپنے شعوری طریقہ عمل میں توانائی ہے اس طرح شعور مادّے اور ذہن دونوں میں موجود رہتے ہوئے ہستی کو کل بناتا ہے ـــــ خواہ ہستی کے مدارج اور موڈ دو لاکھ مختلف النوع ہی کیوں نہ ہوں" ـــــ تو بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ وحدۃ الوجودی تھا اور "وجود" کے "کل" کا قائل تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ تصوف کی بنیاد خالق کائنات کے وجود کو تسلیم کرنے پر ہے۔ لیکن سارتر سرے سے انسان سے کسی بالا ہستی کے وجود کا قائل ہی نہ تھا ـــــ وہ مذہب کی افادیت کا ہی منکر تھا اور اس کا خیال تھا کہ انسان کو اتنی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ خود اپنے وجود کو اپنے متعیّن کردہ خیال کے مطابق زندگی کی راہ پر گامزن رکھ سکے۔

وہ افراد جو سارتر کو صوفی ثابت کرنے پر مُصر ہیں، شاید ان کے ذہن میں منصور حلاج رح کا یہ قول ہو کہ صوفی وہ ہے جو ذات کے لحاظ سے واحد ہو، نہ کوئی اس کی طرف متوجہ ہو نہ وہ کسی کی طرف توجہ کرے۔ اس قول سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذات کا وجود سب کچھ ہے لیکن بہرحال اس میں انکار ذاتِ خداوندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ "دہر میں جلوہ یکتائی معشوق" دیکھنے کا نام ہی وحدۃ الوجود ہے۔ بقول جنید بغدادی "تصوف کے معنی یہ ہیں کہ باری تعالیٰ خودی کو تجھ سے زائل کر کے تجھے فنا کر دے اور اپنے میں ملا کر تجھے زندہ رکھے"۔ ایسا کوئی تصور سارتر کے یہاں موجود نہیں ہے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے "بیمار ذہن کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے"۔ نطشے اور سارتر دونوں بیمار ذہن کے مالک تھے، نطشے پاگل ہو کر مرا اور سارتر نے ایک پژمردہ دانش ور، ایک یاس زدہ مفکر اور ایک سنکی زدہ ادیب کی طرح زندگی گزاری ـــــ سائمن دی بوائر کے ساتھ باقاعدہ شادی کے بغیر ساری زندگی سارتر کے میاں بیوی جیسے تعلقات رہے اور پھر سائمن نے خود سارتر کی جنسی بے راہ روی کے کئی واقعات لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سارتر اپنی اوائل عمری کے تلخ تجربات اور مشاہدات کے طلسم سے کبھی آزاد نہ ہو سکا ـــــ چاہے معاشیات ہو یا سیاسیات عمرانیات ہو یا الہیات ـــــ وہ صرف قنوطی نقطہ نظر سے ہی چیزوں کا جائزہ لیتا تھا ـــــ یہی وجہ ہے کہ اس نے اعلان کر دیا "وجود مہمل ہے" ـــــ اور پھر اسے زندگی کی بنیاد بنا کر سارتر نے ادبی تخلیقات کا ایک بڑا سحر انگیز انبار کھڑا کر دیا کہ یورپ کا نوجوان زندگی ہی سے بیزار ہو گیا ـــــ اور پھر آہستہ آہستہ یورپ کے باہر کا نوجوان بھی اس سے متاثر ہوتا چلا گیا ـــــ خدا کے وجود کو یوں تو فرائڈ، یونگ اور نطشے وغیرہ پہلے ہی مسترد کر چکے تھے، اس کے وجود کو انسان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جانے لگا تھا، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ خدا کے تصوّر نے انسان کو انسان کی خدائی سے نجات دلا کر اعلیٰ و ادنیٰ کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ بہت پہلے اعلان کر چکا تھا۔ "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور برادریوں میں اس لیے تقسیم کر دیا کہ تمہیں آپس میں پہچاننے میں آسانی ہو۔ ورنہ اصل بات یہ ہے کہ تم میں معزز وہ ہے جو خدا ترس اور پاکباز ہے" ـــــ اور اس کے آخری نبی ؐ نے اپنے پیروکاروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ اے لوگو!

تم سب آدم کی اولاد
ہو اور آدم کی حقیقت
مٹی ہے۔

سارتر کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ وجود جوہر ESSENCE پر مقدم ہے

س کا خیال ہے کہ انسان اپنی کائنات
و تخلیق کرتا ہے، وہ اپنی صفات سے
ہلے ہی وجود میں آگیا تھا۔ اس طرح
SEIF اور RTINGIP SLLE
BEINGINI کے ایک کشمکش جاری
ہتا ہے کیونکہ BEINGINITSELF کے
ض عناصر اس کی راہ میں مستقل طور پر مزاحم
تے رہتے ہیں۔

یہ خیال عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے
انسان میں ایک بنیادی فطری جوہر ہے
دا سے بلند سے بلند تر مقام کی سمت
لے جاتا ہے اور اسے پست سے پست
قام تک بھی پہونچا دیتا ہے۔ یہ بھی فرض
ر لیا گیا تھا کہ "جوہر" ماحول یا انفرادی
تخاب INDIVDUAL CHOICE
ــــــ سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔
ونکہ جوہر" فطرت کی ودیعت سمجھا جاتا
تھا، اس لیے عام خیال یہ تھا کہ اسے
بدیل کرنا ممکن نہیں، انسان اس بنیادی
وہر کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ
ساری زندگی وہ اس کے اندر موجود رہتا
ہے۔ سارتر اس خیال سے متفق نہ تھا۔
س کے خیال میں انسان میں کوئی ایسا
جوہر" موجود نہیں ہے جو اس کی تخلیق سے
پہلے اس میں موجود تھا اور یہ کہ انسان اس
جوہر" کے ہاتھوں مجبور محض ہے، سارتر
ا خیال ہے کہ انسان اپنا جوہر خود تخلیق
رتا ہے یہاں تک کہ بوقت مرگ جب
نسان اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا
ہوتا ہے تو گویا وہ "جوہر" کی مکمل تشکیل
کر چکا ہوتا ہے، اس طرح انسان جو
کردار اپنے اندر پیدا کر چکا ہوتا ہے
اور جیسی شخصیت تشکیل دیتا ہے یہ
سب اس کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہوتا
ہے ــــــ یعنی سارتر کے یہاں
"جوہر" سے مراد وہ بنیادی انسانی
جبلت ہے جو تمام انسانوں میں
موجود ہے ــــــ سارتر کہتا ہے،
جو کچھ انسان صحیح معنوں میں ہے ـــ
دراصل یہی اس کا جوہر ہے۔ وجود
زندگی گذارنے کے طریقے کا نام
ہے۔ "وجود" کو "جوہر" پر فوقیت
دے کر سارتر نے "داخلی انسانی
بصیرت" کے نظریے یا وجدان کے
تصوّر کو مسترد کر دیا۔

جوہر اور وجود کے متعلق
ممکن ہے کچھ باتوں سے سارتر سے
اختلاف نہ ہو لیکن جب وہ آزادی
کے تصوّر کو حد سے زیادہ اہمیت
دیتا ہے تو یہیں سے اس کی فکری بے
راہ روی کی سرحد شروع ہو جاتی ہے
ــــــ جب یہ کہا جاتا ہے کہ سارتر
بیسویں صدی کے کارخانوں اور ملوں
نے انسان کو مادی طور پر آسائشیں
تو پہونچائیں لیکن انھوں نے انسان
کو روحانی طور پر کھوکھلا کر دیا ـــ
سارتر کی یاسیت "وجودیت" کی
بدروح کی شکل میں نمودار ہوئی اور
اس نے اعلان کر دیا۔

"زندگی بے معنی ہے" سارتر کے
مشہور ناول "ناشیا" NAUSEA
کا ہیرو روکوئی ناٹن ROOUENI TINE
بہت واضح الفاظ میں کہتا ہے، "ہم لوگ
زندہ کیڑوں کا ایک ڈھیر تھے ــــ
ہیجان میں مبتلا ــــ ایک دوسرے
سے چپٹے ہوئے ــــ ہمارے یہاں
زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں ــــ یہ
پیڑ، یہ پودے یہ درخت سب مہمل ہیں
ــــ اور میں کمزور نرم اور نازک
انسان ــــ اپنے سرمئی خیالوں
میں گم ــــ میں بھی مہمل ہوں ــــ
یہاں تک کہ میری موت بھی مہمل ہوگی ـ
میری لاش میرا خون سب مہمل ہیں" تقریباً
اسی قسم کے خیالات کا اظہار سارتر نے
اپنی دوسری مشہور تصنیف "وجود اور عدم"
BEING AND NOTHINGNESS
میں کیا ہے۔ وجود اپنا اظہار شعور بشریہ
انسانی ANTHROPOMORPHIC
کے حوالے سے یہ کہہ کر کرتا ہے۔ "وجود
ایک مہمل شے ہے ــــ یعنی شعور وجود
سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا"

سارتر نے وجود کی اہمیت پر اس قدر
زور دیا ہے کہ فرد کی اہمیت بہت زیادہ
بڑھ گئی ہے۔ فرد کی اہمیت کا جہاں
احساس ہوتا ہے وہاں فوراً اس کی انفرادی
آزادی کا تصوّر بھی ذہن میں آجاتا ہے۔
سارتر نے فرد کی آزادی پر بہت زیادہ

زور دیا ہے۔ الجزائر میں جنگ آزادی کے مجاہدین کا وہ حامی تھا۔ فرانسیسی قوم پرستوں نے سارتر کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس وقت کے صدر نے یہ کہہ کر اس مطالبہ کو مسترد کر دیا کہ "فرانس اپنے والٹیر کو مقید نہیں کرنا چاہتا" سارتر نے اپنے سیاسی نظام میں انفرادی آزادی کو کلیدی حیثیت دیتا تھا اور معاشی نظام کے معاملے میں وہ مارکس کا حامی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مارکسزم ہی اس عہد کا واحد قابل قبول نظریہ حیات ہے اس کی یہ بات قابل فہم نہیں ہے۔ ایک طرف تو وہ انفرادی آزادی کا زبردست حامی تھا اور دوسری طرف فرد پر سخت ترین پابندیوں کی حامل اجتماعی معیشت کا قائل تھا ــــ انفرادی آزادی اور اشتمالی معیشت پر بیک وقت ایمان لانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عالم بیداری کے مسائل خواب میں حل کرنے کی کوشش کرے۔

سارتر خدا کے وجود سے اس لیے منکر تھا کہ اس کے خیال میں انسان کے ارادے اور آزادی میں اس کا وجود ایک مستقل رکاوٹ تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی ــــ اقبال نے اپنے ایک لیکچر میں مذہبی زندگی کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے ــــ ایمان، افکار اور اکتشاف ــــ ایمان مسجود اور ساجد کے درمیان رشتہ کا تعین کرتا ہے، افکار کے سہارے انسان تصور کائنات اور تصور خلق کائنات کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے اور پھر اس میں ایک مقام کی جستجو کرتا ہے ــــ اکتشاف کے ذریعے "حقیقت مطلق" سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن پاک نے انسان کا ایک متحرک تصور پیش کیا ہے، جو پوری کائنات تک کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ دل کی نگاہ کے ذریعہ عالم اسباب لیکر عالم جبروت تک کی آگہی حاصل کر لیتا ہے ــــ اسی دل کی نگاہ" کو ہم "وجدان" بھی کہتے ہیں ــــ اور وجدان ہی مذہبی تجربات کا اصل جوہر ہے جو بقول اقبال۔ تاریخ انسانی کے رگ و پے میں کچھ اس طرح جاری و ساری ہے کہ ہم اسے محض 'فریب' یا 'سراب' کہہ کر رد نہیں کر سکتے۔ اس تجربے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہم خود کو اس عظیم ترین "حقیقت" کا ایک حصہ تصور کرنے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے ہماری اپنی حقیقت محلول ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور وہ عظیم ترین حقیقت جسے ہم خدا بھی کہتے ہیں انائے مطلق ULTIMATE EGO کہلاتی ہے اسی انائے مطلق' کا مظہر یہ کائنات بھی ہے۔ اس "انائے مطلق" سے بہت سی اناؤں کی تخلیق ہوتی رہتی ہے لیکن ہر انا، انائے مطلق کے تابع ہوتی ہے اور اس کا وجود اپنی آزادی یا ارادہ کی راہ میں کوئی مزاحمت نہیں پاتا۔ لیکن سارتر کی قنوطیت اس کی "انا" کی کو صحیح تفہیم کی راہ میں بھٹکنے رکھے جا رہی ہے۔

•••

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے تصور نے انسان کو انسان کے خداؤں سے نجات دلا کر اعلیٰ و ادنیٰ کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہت پہلے اعلان کر چکا تھا" اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور برادریوں میں اس لیے تقسیم کر دیا کہ تمہیں آپس میں پہچاننے میں آسانی ہو ورنہ اصل بات یہ ہے کہ تمہیں معزز وہ ہے جو خدا ترسی اور پاکباز ہے۔"

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظمیں

رفیق خاور

ایلیٹ کی شاعری صرف ایک رنگ نہیں بلکہ یہ کئی رنگوں کا مجموعہ ہے تہہ در تہہ۔ کچھ بیاں، کچھ پنہاں رنگ، روشنی کی لطیف لہریں ہیں۔ جو قالب میں نہیں آتیں ایک زبان کی رنگ لہر کی دوسری زبان میں تحویل اپنے ساتھ بہت سی دشواریاں لاتی ہے۔ اور ایلیٹ کے سلسلے میں تو یہ دشواریاں بہت زیادہ ہیں۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ جداگانہ تقاضہ رکھتا ہے۔ امیج۔ علامات۔ آہنگ۔ مطالب و معانی اور بین السطور حسن کی بجائے کھوکھلی ہی صورتیں، سطحیں۔ گہرائیاں اور باریکیاں ہیں یہ سب مشکل در مشکل پیدا کرتے ہیں۔ ان تراجم کا مدعا ترجمے سے زیادہ ایسی ترجمانی ہے جس سے اُردو کو ایک نئی وضع کی زبان، ذخیرہ الفاظ، پیکر تراشی اور تکنیک کے نئے پیرائے ہاتھ آئیں گے۔

رفیق خاور

طوفانی رات (PRELUDES)

(۱)

شام —— جاڑوں کی گھر گھر کر آتی شام
ڈھلتی ڈھلتی جاتی ہے
چھ بجے !
دھواں دیتے ہوئے دنوں کے جل کر بجھے سرے
اب اک بوچھار نے سارے لتھڑے لتھڑے کلونسے مرجھائے پتوں
اور خالی جگہوں سے آتے اخباروں کو
جو پاؤں میں بکھرے پڑے ہیں،
ٹوٹی جھلملیوں، چمنی پہ دھرے گملوں پر
ٹوٹی پڑتی ہے بوچھار
کونے پہ گلی کے ایک اکیلا گھوڑا جتا ہوا بگھی میں
زور زور سے سانس لیتا اور کھر مارتا ہے۔

اور پھر لیمپ جگے جاتے ہیں

(۲)

جاگ اٹھی ہے سحر آنکھیں ملتے ملتے
بیئر کی ہلکی ہلکی بساند
برادے سے ڈھکی سڑکوں پر بکھری
جن پر چل چل کر کیچڑ سے لتھڑے پاؤں
چائے کے اسٹالوں کو چلے جاتے ہیں

اس سوانگ کے ساتھ ساتھ جو وقت رچائے جاتا ہے
وہ سارے ہاتھ بھی یاد آتے ہیں۔

کتنے ہی سجے سجائے کمروں کے
آگے پردے ہٹائے جاتے ہیں

(۳)

تم نے بستر پر سے کمبل کو پرے پھینکا
اور کمر کے بل بیٹھے ہوئے سوچیں سوچیں
سو گئے اور رات جو کچھ بھی لائے، دیکھتے جائیں
اتنی گھناؤنی باتیں
جو من ہی من میں بیٹھی ہوئی کھل کھیلتی ہیں
پرچھائیاں بن کر چھت پر رینگنے لگتی ہیں
اور جب ساری دنیا لوٹ آئی
دراروں سے کرنیں جھانکیں
چڑیاں اولتیوں پر چوں چوں کرنے لگ گئیں
پھر گیا ساری گلی کا نقشہ سامنے آیا
جو خود گلی کو بھی معلوم نہیں
گھاٹ کنارے بیٹھے بیٹھے
جب بالوں سے ٹکڑے ٹکڑے پروں کے پھنسے پھنسے
ایک اک کر کے پھینک دیئے
اور پیروں کے پیلے پیلے تلے
سنے سنے ہاتھوں سے تھامے

(۴)

اس کا فن آکاش کے اوپر تن کر پھیل گیا
جو شہر کے اونچے اونچے فلیٹوں کے پیچھے چھپ کر کھو گیا ہے
یا چار اور پانچ اور چھ بجے
آتے جاتے ہر دم پاؤں کے نیچے کچلا ہوا
گھٹی گھٹی، چپٹی چپٹی انگلیاں پاتھوں میں تھما کو بھرتی

سنہرے پیٹ اور آنکھیں
اس کی باتوں کا رُخ دیکھتی جو بہتی ہوئی ہیں
اک سیاہی مارے رشک کا پردہ
بھرے سنسار کی آوازوں کی رونق
یہ من میں کھوتی کچھ تیرے ہیائیں ریتیاں
دیکھتے دیکھتے یوں لگتا ہے مجھے یوں لگتا ہے
جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی

بے آواز وقت کی مار ہے

لو اپنے منہ پر ہاتھ پھیرو اور ہنس دو
یہ دنیا ہر پھیر کر وہی بانٹ دہراتی ہے
جیسے پرانے دانتوں کی بڑی بوڑھیاں جل پھر کر
خالی جگہوں سے لکڑیاں چنتی پھرتی ہیں

●●

میرینا

(MARINA)

یہ سمندر، یہ کنارے، یہ چٹانیں، یہ جزیرے
یہ مچلتا ہوا پانی، ناؤ کے سکھ سے جو کھیلے
اونچے پیڑوں کی نشیلی خوشبوئیں لیتی ہلورے
مور ہی مور پکاریں، ناچتے ناچتے بن میں
کیا ہی کیا باتیں پرانی، کیا ہی کیا یادیں سہانی
پنکھ ہلاتی چلی آئیں، کیا کہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں
میری بیٹی! میری بیٹی!

وہ جو کتوں کے نکیلے دانتوں کو تیر کرائیں
موت ہی موت کی بات!
وہ جو بلبل کے پردوں کو قفس رنگ بنائیں
موت ہی موت کی گھات!
کھال میں مست ہوئے، جو پڑے سکھ سیج سجائیں
موت ہی موت کے سات!
وہ جو ڈھوروں کی طرح کھائیں پئیں موج منائیں
موت ہی موت سے مات!

سب کے سب محو ہوئے سائے ہی سائے سارے
کہیں طوفانوں سے ٹوٹے، کہیں چڑیوں کی چہک سے
کہیں کہرے میں جو پنچھی گاتے ہیں ان کی چہک سے
ناچتے موروں کی چھب سے، ان کے بالوں کی دھنک سے
اسی سکھ چین کے چین کے کارن ہوئے سب مایا ہی مایا

کیسا چہرہ ہے یہ چہرہ، دھندلا ہونے پر بھی روشن
رنگتی رنگیلی رگ، سست مگر پھر بھی تھرکتی

دی ہوئی؟ بخشی ہوئی! تاروں سے بھی دور کہیں
بکھری ہے پاس کہیں، پاس کہیں، آنکھ سے بھی
پتیوں بیچیوں اور ترت پھرت قدموں میں ہی
کیسی کیسی سرگوشیاں یہ کیسی یہ دزدیدہ ہنسی؟
نیند ہی نیند میں اور سپنوں ہی سپنوں میں جہاں
سب کے سب پانی کہیں پانیوں سے آن ملیں

برف ٹکرانے سے ٹوٹا ہے اگر ناؤ کا مکھ!
تو ہے روغن بھی سبھی دھوپ سے چٹخا چٹخا
میں نے ہی اس کو بنایا، اسے ہاتھوں سے سنوارا
میں اسے بھول چکا تھا، مجھے اب یاد آیا!
ماگھ سے چیت تلک میں نے بنایا اس کو
پالیں کمزور سے کمزور، طنابیں بودی
کیسے انجانے میں، ادھ جاگتے کھوئے کھوئے
یہ کرمیری ہے فقط میری، بنائی میں نے
تختے سب چرے رستے ہوئے پیندے میں شگاف
درزیں ہی درزیں، دراڑیں ہی دراڑیں جن کو
چھپٹی سے بھرتے چلے جائیں، بھرت سے پاٹیں
ہائے یہ روپ یہ چہرہ، یہ لہکتا جیون

چھوڑیں اس جینے کو اُس دوسرے جینے کیلئے
اور اس بولی کو اُس دوسری بولی کے لیے
کیسا جینا ہے یہ جینا! پرے اس جگ کے پرے
سال کی کال کی دنیا، یہ جگوں کی ہے جو نگری
جاگ اٹھا ہوں، یہ کس شوق سے ہیں ہونٹ کھلے
کیسی کیسی ہیں امیدیں، یہ سفینے ہی سفینے

یہ سمندر، یہ کنارے، اُودی اُودی یہ چٹانیں
بڑھتے آتے ہیں برابر یہ میری ناؤ کی جانب
مری بیٹی! مری بیٹی!

بودلیئر کی نظمیں

محمد ہادی حسین

شارل بودلیئر (۱۸۲۱ء – ۶۷ء) فرانس کا سربرآوردہ شاعر، طرزِ بیان کے لحاظ سے علامتی اور مضامین کے لحاظ سے ملامتی (اُنھی معنوں میں جن میں یہ لفظ صوفیوں کی ایک خاص جماعت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے)۔ اُس کے مرغوب موضوع ہیں سیہ مستی، رندی، اوباشی، گنہ گاری، رسوائی، پشیمانی، حسرت، ناکامی، محرومی، غم نصیبی، افسردگی، موت؛ لیکن ان کی تہہ میں ایک گہرا اخلاقی احساس ہے، جسے لاابالی پن کا انداز چھپا نہیں سکتا۔ مغربی شاعری میں بودلیئر کی خصوصی اہمیت اس میں ہے کہ ایک تو وہ علامتی تحریک کے بڑے بانیوں میں تھا اور دوسرے "غلط حواس" کا یعنی ایک حاسّے کے ذریعے کسی دوسرے حاسّے کے مدرکات کے بیان کا موجد۔

ان ترجموں میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نہ صرف اصل کی روح کو بلکہ اس کے جسم کو بھی (فقط زبان کا چولا بدل کے) بجنسہ رکھوں، چنانچہ اصل کی "امیجری" (تشبیہیں، استعارے، علامتیں وغیرہ) اور تلمیحات ہی نہیں بلکہ اس کے جملوں کی نحوی ہیئت بھی میرے ترجموں میں بڑی حد تک موجود ہے۔ البتہ میں اصل کے نظامِ قوافی کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ ذیل کے تمام تراجم براہِ راست فرانسیسی سے کیے گئے ہیں۔

ہم جنسیاں (CORRESPONDANCES)

فطرت اک مندر ہے جس کے جیتے جاگتے تھم
گاہے گاہے کچھ مخلوط سی بولیاں بولتے ہیں
انسان اُس میں سے کچھ ایسے گذر کر جاتا ہے
جیسے علامتوں کے اک جنگل سے، جو اس کو
اک انداز شناسائی سے دیکھتی ہیں
لمبی لمبی گونجوں کی طرح، جو دوری کی پہنائی ہیں
مل کر ایک اندھیری اور گھنیری وحدت بن جاتی ہیں
(رات کی وسعت رکھنے والی، روشنی سی چھائی ہوئی وحدت)
خوشبوئیں، رنگ اور آوازیں اک سنگیت سا بن جاتی ہیں
کچھ خوشبوئیں ننھے منے بچوں کے جسموں سی تازہ،
بانسری کی آواز سی میٹھی اور ہری سبزہ زاروں سی
کچھ خوشبوئیں بگڑی سی ہوئی، ور بھرپور اور سر چڑھتی ہوئی
لامحدود ہیں جو اشیا اُن کی سی وسعت رکھنے والی

جیسے مشک، ریاحیں، لوبان، عود اور عنبر
جو گاتی ہیں رُوح و حواس کے وجد و سرمستی کے نغمے

••

بُلند پَروازی

جھیلوں، وادیوں، سبزہ زاروں
جنگلوں، ساگروں اور کہساروں
ان سب چیزوں سے بالاتر
بادلوں کی نگری کے اُوپر
نیلی نیلی فضا سے آگے
تاروں کی دنیا سے آگے
اور پرے خود سورج کے بھی
رہتی ہے تو گرم سیّاحی
میری رُوح، سبک گامی سے
اور وفورِ خوش کامی سے
کرتی پار خلا کی وسعت
ایک اچھے تیراک کی صورت
جو اک ہمّت مردانہ سے
اک سرشاری مستانہ سے
موجوں سے آویزش کرکے
بڑھتا ہی جاتا ہے آگے

دھرتی کی آلودہ ہوا سے
اُس پاکیزہ ہوا میں جاکے
کرلے اُس کو خود کو مصفا
اور وہ آتش صافی پی جا

یعنی وہ ہے قدسی جس سے
پُر افلاک کے ہیں خم خانے

خوش قسمت ہے وہ جو اپنے
شہپر کی قوت کے سہارے
رنج و یاس کی دھند سے نکلا
جو ہے زیست پہ بار گراں سے
اور پہنچا اُس اُجلی فضا میں
دل کا سکوں ہے جس کی ہوائیں

ہے سچ مچ خوش بخت وہ انساں
جس کا تخیل، مرغ غزلخواں
گاتا ہوا جاتا ہے اڑکر
ہستی کی بستی کے اُوپر
لیکن جو ہے جاننے والا
پھولوں کی چپ کی بولی کا
ہر اُس چیز کے من کا بھیدی
منہ سے جو کبھی کچھ نہیں کہتی

●●

شکستہ روح

LA CLOCHE FELEE

جاڑے کی راتوں میں دہکتی اور بھڑکتی آگ کے آگے
جب میں بیٹھا ہوتا ہوں تو اگلے وقتوں کی جو یادیں
گرجا گھر کے گھنٹے کی گونجوں میں مل کر
دھند کے اندر سے آتی ہیں دھیرے دھیرے
میرے دل کو وہ کچھ کڑوی بھی لگتی ہیں کچھ میٹھی بھی۔

کتنا خوش قسمت ہے گھنٹہ، جو اتنا بوڑھا ہے، پھر بھی
اس درجہ چاق دیوبند ہے اور بھرپور آواز میں اب تک
اپنا دینی فرض ادا کرتا ہے ایسے
جیسے کوئی بوڑھا فوجی
خیمے پر پہرہ دیتا ہو

لیکن میری روح شکستہ ہے، اور جب وہ
جھنجھلا کر کوشش کرتی ہے
ٹھنڈی ہواؤں کو راتوں کی
اپنے نغموں سے گرمائے
تو اس کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے
غرغرۂ نزع اک زخمی کا
جو اک جوئے خوں کے کنارے
لاشوں کے انبار کے نیچے
دب کے پڑا دم توڑ رہا ہو
اور سکت اٹھنے کی نہ رکھے۔

ہیوبیک ڈائرمڈ
شان الحق حقی

میری پہلی محبت

میری محبوبۂ اوّلیں تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی
مری زندگی میری رُوح و دَوراں
جیسے وہ آبشارِ رواں، سدر لینڈ کا سیل گیسو نما جھیل ٹیگ سے جہاں
ایک دھار خراماں خراماں، تو جد کناں
دفعتًہ مارتا ہے رفتۂ لاتیر دوب کے اونچے ویران
وحشت فزا ڈھال سے، تند کالی چٹانوں کے پردے پہ اک سیگوں
صاف روشن شبیہ
کوہساروں سے آتا

دواں دندماتا
پہ لو خار و پُر شور دھارا
یہ ایک سدِ سیّال وسیتار بہم فتادہ مسلسل ستادہ
عجب اِک وجودِ جلیل و جمیل، اوجِ کہسار سے محبت کرتا
اور اپنے ہی قدموں میں خود جھاگ بن کر بکھرتا ہوا۔
یہ کرشمہ دکھا کر وہی چادرِ آب ٹُبتی ہے پھر چند در چند
نہروں میں یوں جیسے پھیلا ہو اک مور پنکھ
جنم سے اُس کے وابستہ ہے یہ روایت یہ شیریں حکایت
کہ اک سندر ابلا جو جالیّٹی تھی چادرِ آب پر وہیں پہنچی تہِ آبشار

اور اُسی آن سے ہاں وہی آبشار دھار کر اس کی زلفوں کا روپ
اُس کے شفاف بالوں کی لہروں کا روپ
کچھ سے کچھ ہو گئی

چاندنی رات میں آج بھی اس کی پیاری سی صورت
نظر آتی ہے اس کی گہرائی میں، اونچی چادر کو تکتی ہوئی
میری محبوبۂ اوّلیں۔ تو بھی اس سندر ابلا کی مانند

ہے میرے تنہا، اداس اور تاریک جیون کے ڈھلوان
کی تہہ میں جلوہ کناں
اور مری انگلیاں

آج بھی تیرے لہراتے شفاف بالوں کا لمس
یوں ہی محسوس کرتی ہیں جیسے کہ اس دم ہوا تھا کہ جب
(ایک مدت ہوئی)
تو نے دی تھی رضا
کہ میں ان کو چھو لوں
اور بکھرا دوں اک لمحۂ جاوداں میں ابد کے لیے

HUGH MAC DIARMID. OF MY FIRST LOVE

پیدائش ۱۸۹۲ء (لینگ ہوم اسکاٹ لینڈ)۔ اسکاٹ لینڈ کے مشہور شاعر رابرٹ برنز کی پُرجوش اور گرماگرم شاعری کی روایت کا علمبردار۔ سیاسی طور پر پکا قوم پرست اور انتہا پسندی کی طرف مائل۔

ایکس ـ جے کینیڈی
پرتو روہیلہ

زینہ چوب پر ایک لڑکی

کچی چاندی کی صورت چمکتا بدن
سچے سونے سے ڈھالی ہوئی مو بمو
دھوپ کی چھان میں گویا چھنتی ہوئی
اپنے پنجوں کے بل زینۂ چوب پر سج چلتی ہوئی
ذہن بھی فکر سے پاک جیسے برہنہ بدن
دخترِ برہمن
ران پر ران کی ضرب پڑتی ہوئی
کھن کھن کھن کھن
اور موجِ ہوا اس کے ہونٹوں کو چھو کر سمٹتی ہوئی، دور ہٹتی ہوئی
تا گزر جائے سارا یہ سامان تن
سبک آبشار ایک لڑکی کا شفاف آئینہ تن
ایسی آہستگی سے اُترتی ہے وہ
جیسے پوروں میں پھسلے کوئی ریشمیں پیرہن
اور آخر میں پھر اس طرح ٹھہرتی ہے
کہ اعضا کی سب جنبشیں ایک جا ہو کے
پھر اپنے پیکر میں ہو جاتی ہیں نغمہ زن
ایک لڑکی برہنہ بدن

OO

سلویا پلاتھ
پرتو روہیلہ

نغمۂ سحری

محبت نے میری تجھے اک طلائی گھڑی کی طرح سے چلایا
جو دایہ نے تیرے کف پا کو آہستہ سے تھپتھپایا
تو تیری صدا بے محابا عناصر میں ابھری
مری چیخ کی گونج نے تیری آمد کا قرنا بجا کر بتایا
کہ ہستی کے اس توشہ خانے میں اک توشۂ نو در آیا
مگر سوچتی ہوں
تری بے لباسی ہماری حفاظت پہ سایہ کناں ہے
اور ہم تیرے اطراف اک گونگی دیوار بن کر کھڑے ہیں

یہ دعویٰ کہ میں تیری ماں ہوں بس اتنا ہی سچ ہے
جتنا کوئی لکۂ ابر دست صبا سے کشید آبگینے کرے اور ہلاکت کے زینے سے آہستہ آہستہ اترے

تری سانس کی نرم لو سرخ پھولوں کے سینے میں ہلکورے لیتی جگاتی ہے مجھ کو
تو لگتا ہے گویا سمندر سا اک موزن ہے
تری اک موہوم آواز
اور میں بھرا دودھ سینہ لیے
عبائے شبینہ میں کھلتی ہوئی ایسی بیدار ہوتی ہوں جیسے کہ پل بھر بھی سوئی نہیں تھی
مری جان تیرا وہ غنچہ سا منھ باز ہوتا ہے
اور آسماں کے چمکتے ستارے دریچے کی چوکھٹ میں ناپید ہو جاتے ہیں
اور تیری آواز کا زیر و بم ایک روشن حقیقت کی صورت سے جاگیر ہوتا ہے میرے جہاں میں
زماں و مکاں میں

ٹامس ہارڈی
پرتو روہیلہ

قلب ماہیت

وہ شخص کہ جس سے پہلے کبھی
میرا آقا واقف تھا
اس پودے کا حصہ ہے
اس پودے کے دامن سے
ننھی شاخ جو لپٹی ہے
شاید اس کی بیوی ہو
بیر بہوٹی صورت والی
کونپل بن کر پھوٹی ہو
اور یہ گھاس جو ہے
شاید یہ وہ عورت ہو
گزری صدی میں جو ہر پل
سکھ کی دعائیں کرتی تھی

اور وہ گندم رنگ کہ جو
میرے دل کی دھڑکن تھی
وہ اس گل میں بیٹھی ہو
مطلب یہ وہ سارے لوگ
جن کو کبھی ہم جانتے تھے
مٹی نیچے دفن نہیں
بلکہ اوپر دھرتی کے
ساتھ ہمارے زندہ ہیں
اور ہماری طرح سے
بارش دھوپ ہواؤں میں
جیون چین اٹھاتے ہیں

نیا سورج

ویتنامی نظم

ہو چی من

ترجمہ

نہال الدین عثمانی

ہر دن سویرے
ایک سورج
دیوار کے پیچھے سے اُبھرتا ہے
جیل کے دروازہ پر کرنیں بکھیرتا ہے
لیکن دروازہ بند ہے
اور کوٹھری میں پھیلا ہے گہرا اندھیرا !
پھر بھی کوئی بات نہیں
باہر ایک نیا سورج تو چمکا ہے !

●●

امریکہ کی جدید نیگرو شاعری

احمد سہیل

ہمارے ڈرائنگ روم میں حبشیوں کے مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے منہ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ چیخ رہے ہیں یا قہقہہ لگا رہے ہیں! وہ شاید کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ہم ان میں راکھ چھڑک دیتے ہیں۔ آج بھی یہ صورتحال حضرت بلالؓ کی اولاد کے ساتھ ہے۔ امریکی معاشرے میں "نیگرو شاعری" اس بحران (کرائسس) کا ردعمل ہے جو وہاں مادی سطحیت کی لپائی کے بعد وجود میں آئی۔ "غلام روحیں" اس جدید اور "متمدن" معاشرے میں انجذاب کے عمل سے گذر رہی ہیں۔ امریکہ کی تمام نیگرو شاعری "انجذاب اور اجتماع" کی شاعری ہے۔

جدید امریکی ادب بغیر نیگرو شاعری کے ادھورا ہے۔ اس صدی کے شروع میں امریکی نیگرو شاعری نئے رویوں کیساتھ اُبھری، جس میں انسانی محرومیاں، کچھ کھو جانے کا غم، اپنی ذات کا عدم انکشاف، تہذیبی تطہیر (کلچرل فلٹریشن) اور تنہائی جیسے لاتعداد مسائل سامنے آئے۔ اور ایک نیا "پیچیدہ" فرد نمودار ہوا۔ جب کہ انسانی زندگی میں خراشیں آچکی ہیں اور فرد کو باہر کی چیز صاف نظر نہیں آتی۔ ان کے نزدیک اندر کا وجود بھی معتبر ہے۔ یہ شاعری ایسی یادداشت ہے جو شاعری کی صورت میں کئی صدیوں بعد زبان پر آئی ہے۔ امریکہ کی کالی شاعری مخصوص تنوع اپنے جداگانہ کرافٹ اور انفرادی وژن کے حوالے سے شناخت کی جاسکتی ہے۔ ان نظموں کو امریکہ کا دوسرا نشاۃ ثانیہ (SECOND RENAISSANCE) بھی کہا جارہا ہے۔ اس وقت امریکہ میں تقریباً ساڑھے چھ سو نیگرو شاعر موجود ہیں۔

اس شاعری میں نفسیاتی، عمرانیاتی اور وجودیاتی عنصر نمایاں ہیں۔ ان شعرا کے داخل میں کامیو کا "ساد" (SADE) بیٹھا ہوا یہ سوال کر رہا ہے "زندہ کا دروازہ کھولو یا اپنی نیکی ثابت کرو"۔ نیگرو شاعری وہ باغی ہے جس کو اظہار کے وہ تمام الفاظ مل گئے ہیں جو اس سے غصب کر لیے گئے تھے۔ اپنے "نا وجود" ہونے کی دہشت خاصی مثبت ہے۔ یہ ویسی ہی دہشت ہے جو سارتر نے اپنے ڈرامے "شریف طوائف" میں دکھائی ہے۔ اس کھیل میں ایک حبشی کردار کہتا ہے "مطلب یہ کہ مجھے یہاں سے بھاگتے رہنا پڑے گا یہاں تک کہ وہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے۔ جب گورے غیروں سے باتیں کرنا شروع کرتے ہیں تو کسی نہ کسی کالے کی موت آتی ہے"۔

یوں لگتا ہے جیسے تمام امریکی نیگرو شاعری امریکی برطانوی کلاسیک ولیسٹ سائڈ اسٹوری (ڈرامہ) کی شاعرانہ

یوں لگتا ہے جیسے تمام امریکی نیگرو شاعری امریکی برطانوی کلاسیک ویسٹ سائڈ اسٹوری' (ڈرامہ) کی شاعرانہ تفسیر ہے جہاں نیو یارک جشی علاقے ہارلم کے سفید اور سیاہ نوجوانوں کی باہمی چپقلش محرومیاں، امیدیں نت نئے انداز کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ نامن میلر (MAILER) نے وجودی احساس کے ساتھ جدید صورتحال کو مایوس کن قرار دیا یہ وہی احساس محرومی ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ میں پھیلا۔ میلر نے اپنے مضمون " دی وائٹ نیگرو" میں سیاہ انقلابیت کے سفید لکھنے والوں کو اپنے اس مضمون میں نیگرو دی میلر نے ہی امریکہ میں سیاہ فام لکھنے والوں کے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسے ادب کا مژدہ سُنایا جو سیاہ اور سفید کے امتزاج سے پیدا ہوا۔ جس میں سفاکی، قتل و غارتگری جبر و تشدد نئے معاشرے کی شناخت بن گئی ہے اور یہ صورتحال غیر صحت مند انسان کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

اب ہم رائٹ اور سام کورنیلش کے مختصر تعارف کے ان کی تین نظموں کے متراجم پیش کرتے ہیں۔ اتفاق سے ان دونوں شعرا کا سن پیدائش بھی ایک ہے۔ امریکہ کی نیگرو شاعری کے متعلق آرنلڈ ایڈف (ARNOLD ADOFF) کی اس بات کے ساتھ اب آپ ان نظموں کو پڑھیے "موت خاموش نہیں ہونی چاہیئے۔ بچوں کی ترقی کے لیے الفاظ استعمال کرو اور قوت کے لیے گاؤ۔"

تعارف

جے رائٹ ۔ ۱۹۳۵ء میں نیو میکسیکو کے مقام البقرق میں پیدا ہوا۔ برکلے یونیورسٹی (کیلیفورنیا) سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے ڈرامہ نگاری شروع کی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ اس کے کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ جے رائٹ کی شاعری " نیو امریکن ریویو" " ایور گرین ریویو" ایمرم پوئیٹری ریویو" میں شائع ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اس نے " امریکہ کی نئی نیگرو شاعری" کے علاوہ' ۱۹۶۹ء میں ایک کتاب FOR MALCOLM کو ترتیب دیا۔ اسی سال ۳۱ امریکی شعرا کا انتخاب بھی کیا۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی شاعری تصنیف HOME COMING SINGER بھی شائع ہوئی ہے۔

شام کورونیش :-

۱۹۳۵ء میں بالٹی مور کے مقام پر مرے لینڈ میں پیدا ہوا۔ وہ ۱۹۶۹ء میں CHICORY نامی کتاب کا معاون مدیر رہا۔ اس کتاب میں بالٹی مور کے نوجوان ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوئی تھیں۔ سام کی نظمیں " جرنل آف بلیک پوئیٹری" " میساچیوسیٹس ریویو" اور " نارتھ امریکن ریویو" میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں اس نے بچوں کے لیے " YOUR HAND IN MINE" نامی کتاب لکھی۔ ۱۹۷۰ء میں اس کا شعری مجموعہ " نسلیں" (GENERATIONS) کے نام سے شائع ہوا۔ آج کل سام کورنیش میساچیوسیٹس کے مقام " رکس برے" کے ایک ہائی اسکول میں تخلیقی تحریروں کا استاد ہے۔

جے رائٹ

ترجمہ: احمد سہیل

موت تاریخ کی شکل میں

(۱)

وہ تمام مر رہے ہیں
جنھوں نے
زندگی کو بسر کرنے کے قابل بنایا
اور اتنا وقت بھی نہیں ہے
کہ ان کی تاریخی
رخصت کا ماتم کیا جا سکے
نوجوان شاعر
اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں
بے راہ رو ہپی لوپ کی طرح
ہر چیز کو بے لباس کرتے ہوئے
دھاگوں کو
ہوا میں ٹھوکر مارتے ہوئے
اور میں رک جاتا ہوں
اُون بھری آنکھیں لیے
کوشش کرتے ہوئے
کہ اس مخصوص امریکی کھیل سے محفوظ ہو سکوں
مگر وہ لوگ مر رہے ہیں
زندہ انسانوں کی طرح
اور میں
تمام امکانات
سے محروم کر دیا گیا ہوں
اور
محروم کر دیا گیا ہوں
ان لوگوں کے درمیان
زندہ رہنے کی صلاحیت سے

زندگی سے اس قدر دور ہونا
قیاس سے دور ہے
اور زندگی کے بارے میں
قیاس سے دور ہونا
بہت بڑا الزام ہے
اپنے خلاف

ان لوگوں کے خلاف
جو مر رہے ہیں

(۲)

اپنی کتب تاریخ کو گراتے ہوئے
ایک نوجوان
اس لکیر کے ساتھ کھڑا ہے
جہاں زمین آسمان ملتے ہیں
ایک استعجابیہ نشان کی طرح
جس سے کچھ بھی واضح نہیں ہوتا
ٹھوکر کھا کر
ناچنے لگتا ہے
رقّاص
دائرہ در دائرہ
رقص کرتے ہیں
شہد کی نر مکھیوں کی طرح
جو ناگوار
پرواز پر جائیں
وہ اس کی طرف
ایک دوسرے امکان کیلئے دیکھتے ہیں
وہ بھنبھناتے ہیں
درخواست کرتے ہیں
وہ اسے اپنے پھیلے ہوئے
ہاتھوں کے حلقے میں لے لیتے ہیں
وہ اسے اپنی
رہائی پیش کرتے ہیں
اور وہ ایک گلاب کا پھول لے کر
آگے بڑھتے ہیں
ایک طویل تلاش میں
تاکہ موت کو واپس لا سکیں
کون اس پرانے طلسم کو چاہتا ہے ؟

(۳)

مگر ابھی بھی امکان باقی ہے
اور میڈرڈ تک میں
تاریخ کے زرّین ادوار
اپنے بھاری بھرکم تابوت میں
تم کہہ سکتے ہو
جہاں زیتون کے پیڑ
تارکول کے خانوں کی طرح پھٹ جائیں
جہاں پلے پلائے سانڈ
تعطیل کے دن کے
آخری کناروں کو ٹکر مارتے
اور شوخ دریا

کولہے مٹکاتے ہیں
جانوروں کے منہ جیسے پہاڑوں کے سامنے
وہاں ہر چیز نقالی ہے
لڑکیاں ہمیشہ، چوک پر پیش قدمی کرتی ہیں
زندگی پر اثر انداز ہونے والی
حرکتوں کو دہراتی ہوئی
اور
کسی کتابی علم رکھنے والے پادری کے بغیر
جو کہ
یہ ہمیشہ
قابل اعتبار رقص ہے

(۴)

یہ ہمیشہ ایک ابتدا کی طرح
یہ ہمیشہ ایک انڈے اور
سات دائروں کی طرح ہے
یہ ہمیشہ ہوا کے ساتھ
اس خاص مقام پر چلتا ہے
یہ ایک افریقی قصہ ہے

ہم موت کو دعوت دیتے ہیں
اور ہم یہ جان لیتے ہیں
کہ
موت اپنی ذات میں مکمل نہیں ہے
صرف
آخری سفر ہے
ذات سے ذات تک

(۵)

اور موت سبب ہے
پھر سے شروع ہونے کا
آگے بڑھے بغیر
اور کون افسوس کر سکتا ہے
اس تاریخی ضرورت کا
اگر وہ لوگ مر رہے ہیں
وہ زندہ لوگ
وہ ہمیں امکانات سے لبریز کر رہے ہیں

○

سام کورنیش

ترجمہ: احمد سہیل

نبراسکا میں یک چشم زن

شور سے جلد بیدار ہو جاتی ہے
اور نیچے زمین سے ایک کالا آدمی کھلتا ہے

اس کی بیوی نائٹ گون میں
گھوڑوں اور آدمیوں کی آوازیں
اپنے مرتے ہوئے شوہر کے بستر پر سنتی ہے
سفید گھوڑے میدانوں دوڑتے ہیں
آدمیوں کو تاریکی سے اٹھاتے ہوئے

اپنے تکیوں میں وہ
ایک رائفل اور بائیس کارتوس رکھتی ہے
خرگوشوں کا شکار کرنے کیلئے
اور زندہ رہنے کے لیے

مگر پھر بھی وہ مر رہا ہے
ایک آنکھ زمین سے لگائے

سام کورنیش

ترجمہ: احمد سہیل

ندی

ہم نے سفر کیا
ایک خطے سے
دوسرے تک
میری بہن مر گئی
ندی میں

گہوارہ
میری بہن کی
پشت پر
خالی ہے
اور پانی
چڑھ رہا ہے

ماں

ہم کیوں
چلے جا رہے ہیں

اگر ہم
دم توڑ رہے ہیں

میرا باپ
ایک مچھلی
اپنی پیٹھ پر
اٹھائے
جس کی دم زمین کو چھوتی تھی

میری دادی
اپنے آپ کو
زنجیر کے ذریعے
پوسٹ آفس سے باندھ دیتی تھی
عورتوں کے حقوق کے لیے

ترکی نظم

ناظم حکمت

ترجمہ: نہال الدین عثمانی

گہوارہ کے سرہانے
گائی جانے والی لوریوں سے لیکر
ریڈیو سے نشر ہونے والی خبروں تک
ہر جگہ چھپے ہوئے فریب کو شکست دینا ہے
خواہ وہ فریب دل میں ہو
یا کتابوں میں
یا پُر شور سڑکوں پر
کتنی خوشی ہوتی ہے

اس علم سے
کہ وقت کے قدم
کس سمت بڑھتے رہیں گے
اور اب مستقبل میں کیا ہونے والا ہے ؟

●●●

ترکی کہانی :

کھیت کا بچہ

اورہان کمال

حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کپاس کے کھیتوں میں ۱۵ ــ ۵۰ کسانوں کی ایک قطار پودوں کی نرائی کر رہی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے اس وقت درجہ حرارت ایک سو اُنیس تھا۔ سورج نیچے کی ہر چیز کو جھلسا رہا تھا۔ کسان پسینے میں نہائے ہوئے ایک لے سے اپنے کھرپے چلا رہے تھے۔ دھپ دھپ کی آواز کے ساتھ تیز کھرپے سے مٹی الٹ رہی تھی گیت کی ایک دھن نے چلچلاتی دھوپ کی تیزی کو کم کر دیا تھا

فرمازیر نے پھولے ہوئے ہاتھوں کا پسینہ اپنی موٹی کالی پتلون سے پونچھا اور اپنی سرخ آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو اس وقت اس کے ساتھ ہی اپنا کھرپا چلا رہی تھی اس کے کردھی زبان میں اس سے کہا

"کیا بات ہے"

گلزار چوڑے کاندھوں والی ایک سوکھی ہوئی عورت تھی۔ حالانکہ اس کا سوکھا ہوا چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا پھر بھی اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی تیز درد کے اثر کو اپنے چہرے پر آنے سے بھرپور طریقے سے روک رہی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہی تھی۔ اسے چپ دیکھ کر فرمازیر کو غصہ آگیا۔ اس نے اپنی کہنی اس کے پہلو میں ماری اور پوچھا "ارے آخر تمہیں ہو گیا ہے؟"

گلزار نے اپنے شوہر کی طرف تھکی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے اندر دھنس گئی تھیں۔ اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کو اپنے ہاتھوں سے دبائے ہوئے وہ جھک گئی اور پھر جھلسا دینے والی دھوپ میں تپتی ہوئی سرخ زمین کے اوپر گھٹنوں کے بل گر گئی۔

فورمین نے جو اپنی بڑی سی چھتری کے نیچے کھڑا تھا چلا کر کہا۔

"گلزار کیا معاملہ ہے؟ چلو، کام چھوڑ دو، چلو چھوڑو...."

وہ درد سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اس نے اپنی چیخ دبا لی لیکن مضبوط انگلیاں زمین کی دراڑوں میں پھنسا کر ان کو زور سے بھینچ لیا۔

جس نے کسی ان دیکھی طاقت سے خود کو نا بوسی کیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کالے دھبے تیرنے لگے بے چکم چکرانے کرا ہتے ہوئے کہا "ہائے" یہ ایک شرم اور ذلت کی بات تھی کہ ایک عورت کی درد زہ کی آواز پرائے مرد سنیں۔

فرمواز نے اپنی بیوی کو گالی دی اور اپنی بیوی کے پہلو میں ایک [illegible] ٹھوکر لگائی [illegible] قابل رحم حالت میں زمین پر ڈھک گئی۔ وہ جانتی تھی کہ [illegible] حرکت کرنے سے کچھ [illegible] ہاتھ میں پر رکھ کر جب [illegible] اٹھنے کی کوشش کی ۔ نوریبی نے پھر کہا۔

"گلزار جاؤ بن ۔ جلدی ۔۔"

اس کا درد [illegible] بند ہوگا پھر اس [illegible] تا کر درد پھر [illegible] در پہلے سے [illegible] سے محسوس ہوگا وہ اس کھائی کی طرف دوڑ رہا ہو [illegible] ایک ہزار [illegible] اور کھیتوں کی حد بندی کی شکل میں کھود دی گئی تھی۔

کھائی میں گوبر بکھرا پڑا تھا۔ وہ پوری طرح دھوپ سے تپ رہی تھی۔ [illegible] چھپکلیاں سرپٹ زمین پر دوڑ رہی تھیں۔ گلزار سیدھی کھائی میں کھڑا ہوگیا۔ جھلسا دینے والی دھوپ میں اس نے اپنے آس پاس دیکھا اور سننے کی کوشش کی۔ کوئی نظر نہیں آر ہا تھا چمکتا ہوا سورج بے حساب [illegible] سے [illegible] رہا تھا۔

اس نے [illegible] اور [illegible] خالی کھلیانوں میں [illegible] وہ چیزیں بکھری تھیں [illegible] وقت کے لیے چاہیے تھیں اور

دو [illegible] ۔ ایسے جنوں سے والا ہے۔ گنے کے ٹکڑے کے کرد [illegible] ہوا تھوڑا سا دھاگا ایک سک آدھ [illegible] رنگوں کے کپڑوں کے کچھ ٹکڑے جیتھڑے۔ نمک اور [illegible] جہاں پر یہ چیزیں [illegible] کھیتوں کے کونوں [illegible] تھیں۔ اس نے سوچا کہ [illegible] آنکھوں میں [illegible] رنگ [illegible] اس کا جسم [illegible] اپنی [illegible] کوئی [illegible] اس نے ایک چیتھڑے کے ٹکڑے کے پیچھے [illegible] زمین پر بیٹھ گیا۔ دھاگے کو گنے سے اتارا اور کپڑوں کے دو ٹکڑے کیے۔ وہ گھٹنے ٹیکے والی تھی کہ اس نے اپنے پیچھے کسی کی [illegible] آواز سنی۔ ایک بڑا سا کتا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور اس کی طرف پھینکا۔ کتا ڈر کر بھاگ گیا لیکن وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔ وہ اپنی ناک سے ہوا کو سونگھتا ہوا انتظار کرتا رہا۔

گلزار [illegible] پریشان تھا۔ اس نے سوچا۔ اگر [illegible] پیدائش کے بعد وہ بے ہوش ہوگئی تو کتا بچے کے ٹکڑے کر دے گا۔ اسے گروری لڑکی فیروں کا واقعہ یاد تھا۔ اس کے بھی اسی طرح کھائی میں بچہ ہوا تھا اور وہ اپنے لہو میں نہا کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ جب اسے ہوش آیا اور اس نے آس پاس دیکھا تو بچہ کہیں نہیں تھا۔ اس نے اسے اونچی نیچی جگہوں پر تلاش کیا۔ آخرکار ایک جھاڑی کے نیچے [illegible] اپنے بچے کے ٹکڑے ملے جو ایک کتے نے کیے تھے۔

سرخ [illegible] ۔۔۔۔ اس نے کتے کو

اس کے نام سے پکارتے ہوئے کہا آنکھوں کی چمک ابھی نہیں ہے سر سے تباہ رہیے جا پریشان تھی کہ ہزار فٹ دور سے اپنی بیٹی کو کیسے بلائے ۔۔۔۔ جاؤ ۔ جاؤ دفعان ہو جاؤ گندے کتے دفعان ہو جاؤ

٥

"فرمو" عورتیں نے کہا "جاؤ اسے دیکھو۔ وہ کہیں مر ہی نہ جائے یا اسے کچھ اور نہ ہو جائے"

فرمو نے اٹھ کر کھائی کی طرف دیکھا جہاں اس کی بیوی بچہ جننے کی حالت میں تھی۔ اس نے اپنا سر ہلایا۔ گالی دی اور کام کرتا رہا۔ وہ اپنی بیوی پر اندر ہی اندر غصہ کھا رہا تھا۔ اس کے ماتھے کا ٹھنڈا پسینہ اس کی گہری جھاڑی نما بھوؤں سے ہوتا ہوا بہہ رہا تھا

"جاؤ بیٹے" نوریبی نے پھر کہا "جاؤ اور دیکھو کہ اس عورت پر کیا گذر رہی ہے تم نہیں جان سکتے۔"

فرمواز نے اپنا کھرپا ایک طرف پھینکا اور چل دیا۔ اس نے سوچا وہ اسے ایک ٹھوکر لگائے گا ۔۔۔۔ پھر ایک اور ٹھوکر ۔۔۔۔۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے اور اس نکمی عورت نے مجھے مشکل میں پھنسا دیا ہے۔

وہ کھائی کے اوپر کھڑا ہو گیا اور اس نے نیچے دیکھا۔ گلزار اپنے پہلوؤں پر گری ہوئی تھی خون بھرے چیتھڑوں کے بیچ ایک لوتھڑا سے پھڑپھڑا رہا تھا اور ایک بڑا سا کتا اسے کھینچ رہا تھا۔

وہ کھائی میں کود گیا۔ سے دیکھ کر کتا اپنا خون بھرا منہ چاٹتا ہوا بھاگ گیا۔

فرموازیر نے بھرے پروں والی ان مکھیوں کو جو اس کے بچے کے چہرے پر اکٹھا ہو گئی تھیں اڑا دیا۔ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی بند تھیں لیکن وہ حرکت کر رہا تھا۔ فرموازیر نے اس کپڑے کو کھولا جو بچے کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

"لڑکا" ! وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ ۳ لڑکیوں کے بعد ایک لڑکا !

فرموازیر ایک دم بدل گیا۔ اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا۔ اس نے کھردرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے بچے اور خون بھرے چیتھڑوں کو زمین سے اٹھا لیا۔

"میرا بیٹا" ! وہ چلایا

گلزار نے اپنے آدمی کو اپنے نزدیک محسوس کر کے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی خراب حالت کے باوجود اٹھنے کی کوشش کی۔

"تمھارے لیے اچھا ہوا" فرموازیر نے کہا۔ پھر اپنے بچے کو اپنی باہوں پر اٹھائے وہ کھائی سے تیزی سے نکلا۔ نورمین نے اسے پھٹی ہوئی سرخ زمین پر آتے دیکھا اور کہا "وہ دیکھو فرمو اس طرف آ رہا ہے"

لڑائی رک گئی۔ اپنے اپنے ہاتھ کھرپوں کے اوپر رکھے کسان فرموازیر کو آتے دیکھتے رہے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ چلّا رہا تھا "میرا بیٹا... میرے گھر بیٹا ہوا ہے"

اس نے خون بھرے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچے کو چھاتی سے لگا کر دبایا۔

احتیاط برتو..." نورمین نے کہا" اس کی حفاظت کرو.... اور اسے یوں دبا کر چھاتی سے نہ لگاؤ۔ تم اس سانس روک رہے ہو اب تم نیچے فارم ہاؤس میں چلے جاؤ۔ باورچی کو بتاؤ کہ میں نے تمھیں بھیجا ہے۔ اس سے کہو کہ وہ تمھیں کچھ تیل اور راب دے اور اپنی عورت کو کچھ یخنی وغیرہ بناؤ۔

فرموازیر سے کوئی تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا۔ گرمی اسے حیرت زدہ نہیں کر رہی تھی۔ اب وہ بیس سالہ نوجوان کی طرح جوان تھا اور خود کو چڑیوں جیسا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

وہ کچی مٹی کے بنے ہوئے جھونپڑوں کی طرف چل دیا جن کی گھاس پھونس کی چھتیں دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ کھیت کا بچہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

عماد لے لکھنوی :

قطعات

(ترکِ تعلق)

سوچتا ہوں کہ ترے خط تجھے واپس کر دوں
تجھ سے کہہ دوں کہ مرے خواب مجھے لوٹا دے
تجھ سے ان خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکتی
میرے راتوں کے یہ مہتاب مجھے لوٹا دے

یہ ترے خط یہ تری یادوں کے دھندلے سے نقوش
میرے زخموں کا مداوا تو نہیں بن سکتے
چند کاغذ کے حسیں ٹکڑوں پہ کل کے وعدے
یہ مرے غم کا ازالہ تو نہیں بن سکتے

[redacted]

منوچہر آرین پور
ترجمہ: ن، م، شیخ

جدید ایرانی ادبیات

ماضی پرستی اور عصری آگہی

اسلامی انقلاب سے قبل بیرونی دنیا سے ایران کے بڑھتے ہوئے روابط اس کے معاشی اور معاشرتی نظام میں بہت سی تبدیلیوں کا باعث ہو رہے تھے اور ان تبدیلیوں کے دور رس اثرات، اس کی تہذیب و ثقافت کے علاوہ ادبیات میں بھی اس قدر واضح اور نمایاں ہو چکے تھے کہ ایرانی خواص و عوام اس کے لیے "ثقافتی انقلاب" کی اصطلاح استعمال کرنے لگے تھے۔ جہاں تک ادبیات میں انقلاب کا تعلق ہے اس کا اثر نہ صرف "کمیت" پر پڑا ہے بلکہ "کیفیت" کے اعتبار سے بھی کثیر الابعاد کہا جا سکتا ہے اور اس کا بڑا سبب ایران میں خصوصاً بین الاقوامی اثرات کا نفوذ اور خود ایران کا ادبی ورثہ ہے۔

بین الاقوامی ادب اور جدید فارسی ادب کے درمیان تفعل و تاثر کی جو صورت رہی ہے وہ وہی ہے جو کم و بیش مشرق وسطیٰ کے تمام ترقی پذیر ممالک میں پائی جاتی ہے لیکن مغرب سے ایران کا حقیقی ادبی ربط اس وقت پیدا ہوا جب ۱۸۶۹ء میں حبیب اصفہانی نے مولیئر کے "لے مسانتھراپ" LE MISASTROP کا ترجمہ "مردم گریز" پیش کیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم تک اس ربط کا پھیلاؤ اور بھی بڑھ گیا یہاں تک کہ موجودہ دور میں ہزاروں کی تعداد میں مختلف کتابوں اور مضامین کے جو ترجمے ہوئے ہیں وہ نہ صرف اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے متعدد نئے خیالات اور اسالیب سے ایرانی ادبیات روشناس ہوئی بلکہ اس لیے بھی کہ ان میں بعض، مثلاً شجاع الدین شفا کے کیے ہوئے "لا ڈیوینا کامیڈیا" کے ترجمے کو مسی الہٰی کو شاہکار کا درجہ حاصل ہو گیا۔

ایران کا ادبی ورثہ بھی جو زرتشت کی گاتھاؤں سے لیکر فردوسی، نظامی، رومی، سعدی اور حافظ تک پھیلا ہوا ہے، جدید فارسی ادبیات کے ارتقا میں بہت

کچھ اثر انداز رہا اور اس عظیم مورخ کے ساتھ بین الاقوامی اور مقامی ادبی ارتباط نے نہایت شاندار نتائج پیدا کیے چنانچہ ایک طرف وہ اہل قلم رہے ہیں اور ہیں جنہوں نے بیرونی اصناف و اسالیب سے دور رہ کر فارسی کے روایتی پیرایۂ اظہار کو اپنائے رکھا لیکن قدامت پر جمے رہنے کے بجائے اپنے آپ کو زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا، اور دوسری طرف وہ فنکار ہیں جنھوں نے قدیم اور روایتی صیغۂ اظہار کو ترک کر کے اپنی پسند کے غیر ملکی ادبی کارناموں کو اپنے لیے نمونہ بنایا اور نئی ہیئتوں اور تکنیکوں کے تجربات کیے۔ ان دونوں گروہوں کا یہ فعل جو جدید فارسی ادبیات کی امتیازی خصوصیت ہے آج بھی قائم ہے لیکن عصری فارسی ادبیات کی ایک غیر محسوس رَو ایسے قلم کاروں سے تعلق رکھتی ہے اور جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، ان دونوں گروہوں سے الگ مقامی اور بیرونی ہیئت و اسلوب میں امتزاج پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی جدت پسندی کا یہ رجحان فارسی شعر و ادب کی طویل تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہے گویا کہا جا سکتا ہے کہ ایران میں ادبی فکر و تخلیق کے تین مختلف دھارے اپنی اپنی سمتوں میں رواں ہیں: ایک روایت پسند دیرینہ اہل قلم کا جن کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے، دوسرا غیر ملکی ادبیات سے وابستہ قلم کاروں کا جن کو "غرب زدہ" کہا جاتا ہے اور تیسرا جدیدیت پسندوں کا جن میں زیادہ تر جواں سال فنکار شامل ہیں اور عصری فارسی ادبیات کا بیشتر حصہ انہیں کے فکر و فن پر مشتمل ہے۔

قدیم فارسی ادب میں بیانیہ نثر کا کبھی قحط نہیں رہا لیکن مغربی طرز کے ناول اور افسانے تازہ وارد ہیں، ایران ان سے انیسویں صدی کی دہائیوں میں روشناس ہوا، اور یورپ سے بڑھتے ہوئے تعلقات نے فارسی نثر میں اصلاح و تجدید اور نئے اصناف اختیار کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ اس سلسلے میں مرزا حبیب اصفہانی جیمس جسٹینین موریر JAMES JUSTINIAN MORIER کی "ایڈونچرز آف حاجی بابا آف اصفہان" کا ترجمہ "حیات حاجی بابا اصفہانی" اور زین العابدین مراغہ ای کا "سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ" نثری تخلیقات کے پھیلاؤ میں زیادہ معاون ثابت ہوئے اور خاص طور پر محمد باقر خسروی، (شمس و طغرلی)، شیخ موسیٰ نثری (عشق و سلطنت") عبد الحسین صنعتی زادہ (داستان مانی نقاش) مرتضیٰ مشفق کاظمی (طہران مخوف") عباس خلیلی ("اسرار شب") اور محمد مسعود ("تفریحات شب") نے اپنے کارناموں سے بیانیہ نثر کے افق کو وسیع کر دیا اور اب ایران اور اسی کی ترقی پذیری کے دور سے گزرنے والے ممالک میں بھی وہ (نثر) ایسے ہی اسباب کی بنا پر آہستہ آہستہ لطیف خیالات کے اظہار میں شاعری کی جگہ لے رہی ہے۔

فارسی نثر نگاری میں تین ممتاز اور بزرگ سیاست کار خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں ایک علی دشتی ہے جو علمی اعتبار سے بلند مقام رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ ناول نویسی اور حصول علم، سیاست اور مجلس (ایرانی پارلیمان) کی رکنیت میں گزرا ہے "نقشی از حافظ"، "قلمرو سعدی" اور "دی بجیام" کی مشہور تنقیدی کتابیں ہیں جن میں اس نے فارسی ادب کے بارے میں اپنے وسیع علم اور مغربی حصول تحقیق و تنقید کو سمو دیا ہے جس کا نتیجہ اس کی تصانیف کا وہ سلسلہ ہے جس میں اس نے اپنے اوراق و بصیرت کو معقول دلائل کے ساتھ واضح فکر کے ذریعے لچکدار عبارت میں پیش کیا ہے دشتی کی فنکارانہ عظمت کا مدار بہت کچھ ناولوں پر ہے جن میں "فتنہ" "جادو" اور "ہندو" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے ناول زیادہ تر ایران کے اعلیٰ طبقے کے افراد،

خصوصیات، جو کہ بانی ادارہ عالمی شہرہ دانشوروں کی سرگرمیوں کے مرقعے ہیں ان کے کرداروں کی زندگیاں جذبات پرستی یا سیاسی انگیزی رومانیت تصنع بندی اور فریب فن و ثقافت (جس کی اصلیت حقیقی فن و ثقافت کی سطحی نقالی سے زیادہ نہیں) کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ بہرحال اس کی تحریر کی شگفتگی دروانی اور تخیل کی زرخیزی اس کی امتیازی خوبیاں ہیں۔

ایران کا دوسرا بزرگ سیاست کار اور سب سے زیادہ شہرت یافتہ ادیب محمد حجازی برسوں محکمۂ ڈاک و تار میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہا اور بعد میں مجلس کا رکن بھی ہوا اس نے بہت کچھ لکھا جس میں مضامین، ترجمے، ناول، افسانے سبھی کچھ شامل ہیں۔ اس کے بہترین ناولوں میں "ہما" کو خصوصیت حاصل ہے اس میں ایک خوبصورت دوشیزہ ایک نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اپنے سرپرست کی وجہ جس کی وہ بہت عزت کرتی ہے۔ اور جو خود اس سے محبت کرتا ہے مگر بڑھاپے کی وجہ سے اظہار نہیں کرتا۔ اور حل یہ نکالا کہ سرپرست کو روسی اغوا کر لے جاتے ہیں اور لڑکی اور نوجوان مل جاتے ہیں۔ حجازی کا دوسرا ناول "پریچہر" ایک آوارہ عورت کے چال چلن کی تصویر اور "زیبا" ایک حسین و با اثر عورت کی داستان ہے جو ایک معمولی آمدنی والے جوان کو پھانس کر بدی کی دنیا میں کھینچ لاتی ہے۔ ان کے علاوہ "پروانہ" اور "سرشک" بھی اسلوب مواد کے اعتبار سے مذکورہ ناولوں ہی کی طرح ہیں۔

حجازی نے افسانوں اور مضامین کے مجموعوں میں "آئینہ" "اندیشہ" اور "نسیم" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دشتی کی طرح حجازی کے موضوعات بھی عشق و محبت اور خانگی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ پھر جذباتیت کی طرف اس کا میلان، اور صوفی ناصحانہ انداز اس کے کارناموں کو خوبیوں کو عاری کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ ان کی عبارت کی سلاست روانی اور اثر انگیزی جدید فارسی نثر کے لئے نمونہ اور مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔

بزرگ علوی اس سلسلے کا تیسرا صاحب قلم ہے جس کی ادبی زندگی اس کے سیاسی نظریات و عمل سے بری طرح متاثر ہوئی۔ ایران میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علوی جرمنی گیا۔ جہاں وہ اشتراکی رجحانات رکھنے والے ایرانی طلبہ کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ پھر جب ۱۹۳۶ء میں ایران لوٹا۔ کمیونسٹ ہونے کے الزام میں باون دیگر افراد کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں رہائی کے بعد وہ اشتراکی تودہ پارٹی سے ڈاکٹر مصدق کے زوال اور اشتراکیوں پر مظالم کا سلسلہ شروع ہونے تک وابستہ رہا اور اس کے بعد مشرقی جرمنی میں معلمی اختیار کر لی۔

علوی کے افسانوں اور مضامین کے تین مجموعوں "چمدان" "ورق پارہ ہائے زندان" اور "نامہ ہا" کو امتیاز حاصل ہے ایک ناول "چشمہایش" ہے جس میں اس نے فرنگیس نامی ایک مالدار مگر بگڑی لڑکی کی تعلیم، معاشقوں اور انقلابی سرگرمیوں کی تصویر کشی کی ہے ایران میں اس کی فروخت پر پابندی ہے اور ایران کے باہر بھی اشتراکی حلقوں میں نظریاتی بنیاد پر اس کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ لیکن نظریات سے قطع نظر علوی یہ کارنامہ اس حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں اس نے وقت کے کرائس میں اس وقت کے معاشی حالات اور انسانی افعال کے نفسیاتی محرکات پر اپنی گہری بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ علوی صاحب سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں مگر اسے اپنے سیاسی رجحانات کی وجہ سے معتوب ہونے کے باعث [illegible] زندگی کو خیرآباد کہنا پڑا۔

جدید فارسی نثر میں نئے طرز اسلوب اختیار کرنے والوں میں جن کی تحریروں کی ہمہ جہت خوبیوں کے باعث نئے لکھنے والوں پر گہرا اثر پڑا ہے۔ صادق ہدایت اور محمد علی جمال زادہ نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں کی تعلیم بیرونی ممالک میں ہوئی دونوں یورپ خصوصاً فرانس کی ادبی روایات سے بہت زیادہ متاثر رہے ہیں۔ دونوں کے یہاں تکلف اور تصنع کے بجائے بول چال کی زبان کی سادگی اور بے ساختگی [illegible] کی حیثیت رکھتی ہے

اور کہ نگار نثر فارسی زبان ذہنی کیفیات اور نئے عہد کے مسائل سے آشنا اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی بلیغ کی جا سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ دونوں کی ادبی کاوشات خصوصاً جمال زادہ کی "یکی بود یکی نبود" اور ہدایت کی "بوف کور" کو فارسی ادبیات میں ادب عالیہ کی حیثیت حاصل ہے، نیز فارسی نثر پر ان کا وہی اثر ہے جو روسی ادب میں گوگول اور ترجنیف کا ہے اور جدید فارسی ادب کی رگوں میں ان کا حیات بخش فنکارانہ اظہار رواں خون کی طرح دوڑتا محسوس ہوتا ہے۔

صادق ہدایت کے قابل ذکر شاگردوں میں "دید و بازدید" اور "مدیر مدرسہ" کا مصنف جلال آل احمد نمایاں ہے۔ اس کی کتاب "غرب زدگی" جس پر کافی لے دے ہو چکی ہے۔ اور ایران میں دستیاب نہیں۔ اس نے مغرب کی اندھا دھند تقلید ہدف ملامت بنایا ہے۔ ہدایت کے ایک اور نامور شاگرد صادق چوبک ("خیمہ شب بازی"، "انتری کہ لوطیش مردہ") کو اپنے فطری انداز نگارش اور جزئیات پر خاص توجہ کے باعث ایران کی عصری زندگی کی تصویر کھینچنے میں کمال حاصل ہے۔

نئے ناول نگاروں میں جن کی ایک خاصی تعداد ہے۔ بہ آذین (محمد اعتماد زادہ: "دختر رعیت") تقی مدرسی ("یکلیا و تنہائی او") محمد علی افغانی ("شوہر آہو خانم") خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "شوہر آہو خانم" اس دور کا بہترین ناول کہا جا سکتا ہے۔ جو پلاٹ، کرداروں کی کثرت اور ایران کی عصری زندگی کی عمدہ تصویر کشی کی وجہ سے اس قدر جاذب توجہ ہے کہ قاری اس میں کھو جاتا ہے۔ ایک اور ناول نگار عبدالحکیم فر کے ناولوں خاص کر "لیلاج" کے مطالعے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس میں ناول نویسی کی عمدہ صلاحیت ہے۔ لیکن ادبی کاموں سے قلیل آمدنی نے بعض دوسرے قلمکاروں کی طرح اسے بھی فکر و فن کی دنیا سے دور کر دیا ہے۔

موجودہ ایران میں افسانے کی صنف بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ صادق ہدایت اور جمال زادہ کی مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایرانی افسانہ نگار زیادہ تر عوام کی زندگی اور ان کی بول چال کی زبان کی عکاسی کرتے ہیں اور قدیم کو جدید اور غریب کو امیر پر ترجیح دیتے ہیں۔ نیز زندگی کے مختلف پہلوؤں — رسم و رواج، عقاید اور لسانی خصوصیات — پر جن کو جدیدیت اور صنعتی ترقیوں سے بڑا خطرہ ہے، ان کی زیادہ توجہ ہے۔

ان افسانہ نگاروں میں شین پرتو ("دام پلید دوزخ") ابراہیم خواجہ نوری ("عقائد ملا آقا") کو ان کی واضح کردار نگاری اور نثری اسلوب میں صحت اظہار و کفایت الفاظ کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ محمود طیاری ("مار خانگی") بھی صلاحیت کا مالک ہے۔ مگر اس کے افسانوں میں غیر ضروری ابہام اور تصنع کا بڑا دخل ہے جنہیں اگر وہ ترک کر دے تو ترقی کے بڑے امکانات ہیں۔ مگر یہ اور اسی طرح کے دوسرے معائب آج کل کے اکثر لکھنے والوں میں عام ہیں۔ فریدون تنکابنی ("صورت حاجی فیروز را سیاہ کردہ") کے افسانے ہر چند کہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ مگر ان میں زندگی کے بارے میں ناپختگی اور جذباتیت زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہیں جن پر مغربی فنکاروں کی اندھی تقلید کا بھوت سوار ہے۔ مثلاً رحیم بابا مقدم کا افسانہ "مرزبان" بہت زیادہ کافکائی ہے اور بہمن بہرامی کے افسانوں خصوصاً "بازی مائر دسک" اور "باغ اندوہ" میں جائس اور پروست جھلکتے ہیں اور ایک خاتون افسانہ نگار کے بچپن کی دلآویز یادوں سے لبریز کہانیوں کو بے اثر بنا دیتے ہیں۔ ایک اور خرابی جو افسانہ نگاروں کا خاصہ بن گئی ہے۔ اور جس کی مثال احمد رضا احمدی کے یہاں ملتی ہے۔ حقیقت اور امکانات کے شائبے کی کمی ہے۔ مثلاً اس کی "شب دریا" ایک ایسی کہانی ہے جس میں سسپنس

(SUSPENSE) اینٹی کلائمکس (ANTI CLIMAX) ہو جاتا ہے۔ اور اس کے پلاٹ کے غیر حقیقی کردار اس کی فلسفیت کے بوجھ تلے بے دم ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسے فنکاروں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے جن کے یہاں یہ نمایاں خرابیاں نہیں پائی جاتیں۔ ان میں عباس پہلوان ("تاریک ویلیش")، جمال میر صادقی ("تجاوز") اور خاص طور پر غلام حسین ساعدی ("گوہر مراد") قابل ذکر ہیں۔ یہ ان چند فنکاروں میں سے ہیں، جنھوں نے اپنا ایک "طرز" بنا لیا ہے جو نہ تقلیدی ہے نہ مصنوعی بلکہ جو ان کے مزاج افسانے کے مزاج اور تقاضے کے مطابق ڈھل جاتا ہے اور یہ ان کی غیر معمولی پختگی اور بصیرت کی دلیل ہے۔ چنانچہ ساعدی کا افسانہ "قدرت جدید" اس کی عمدہ مثال ہے جس کی گٹھی ہوئی عبارت، واقعات کا دانستہ امتزاج اور مناظر اور کرداروں کے پیش کرنے کا حقیقت پسند انداز ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر جدید انسان پر نہایت عمدہ تبصرہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

نئے افسانہ نگاروں میں مراد کرمانی ("معصومہ") کی تخلیقات کو بڑی مقبولیت حاصل ہے اور امکان ہے کہ مستقبل میں اس کے افکار کا تذکرہ فارسی ادب کی تاریخ کے صفحات کی زینت بن جائے۔ بہرحال ان قلم کاروں کے باعث فارسی نثر کا "مابعد تیموری" اسلوب طویل نویسی عربیت پسندی اور تصنع بدل گیا ہے۔ اور اس کے صیغۂ اظہار میں نئے ابعاد کا اضافہ ہو رہا ہے۔

نثری اظہار و افکار کے مقابلے میں جدید فارسی شاعری کو جس دشواری کا سامنا کرنا پڑا وہ روایت پرستوں اور جدیدیت پسندوں کا باہمی اختلاف تھا۔ شعر میں کچھ تو قدیم فکری اور اظہاری رویہ کی فرسودگی اور خلاق اور کچھ ترقی پذیر معاشرے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے زیادہ موثر پیرایۂ اظہار کی ضرورت نے تشکیل نو کے لئے جس کا وقت آ چکا تھا، راستہ ہموار کیا۔ لیکن شاعری کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ نام نہاد "دورۂ بازگشت" "RETURN MOVEMENT" جو شاہان صفویہ کے عہد میں شروع ہوا تھا۔ اس کا مقصد قدیم شاعری کے احیا کے سوا کچھ نہ تھا اور وہ بھی رودکی و فردوسی اور حافظ و سعدی کی تقلید بلکہ نقالی کی حد تک۔ پھر ہر چند کہ عہد قاچار کے شعراء کے صیغہ ہائے اظہار بھی غزل، قصیدہ اور دوسری روایتی اصناف ہی رہے لیکن انھوں نے جدید احساسات اور ادراکات کو قدیم استعاروں اور اصطلاحوں کے ذریعے ہی بھی کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔

ان شعرا میں عارف قزوینی، ایرج مرزا، پروین اعتصامی اور خصوصاً ملک الشعراء محمد تقی بہار کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور ان کے کلام نے ثابت کر دیا کہ قدیم اصناف میں پیچیدہ سے پیچیدہ اور لطیف سے لطیف جدید خیالات کو پیش کرنے کی کافی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے ان شعرا کے خلاف جنھوں نے نیما یوشیج کی طرح متداول اوزان اور روایتی اصناف کو ترک کر کے جدید فکری و اظہاری رویہ اپنایا ایک محاذ کھڑا ہو گیا۔ اور ایک دوسرے کی تنقید و تنقیص کا سلسلہ جاری ہو گیا جس نے شعرا کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا: ایک وہ جو اوزان و بحور کی پابندی کے ساتھ "شعر" کہتے ہیں دوسرے وہ جو ان سے آزاد ہو کر شاعری کرتے ہیں۔ موخرالذکر کی تخلیقات کو "شعر نو" کہا جاتا ہے۔

روایتی شعرا میں ابوالقاسم لاہوتی، حبیب یغمائی، لطف علی صورت نگر، علی اصغر حریری اور رشید یاسمی اپنے کلام کی بعض غیر معمولی خوبیوں کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ملک الشعراء بہار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان شعراء نے اس بات کی کوشش کی کہ قدیم ہیئتوں (خصوصاً غزل) کو قائم رکھتے ہوئے نئی دنیا کے تقاضوں کو پورا کیا جائے یعنی سیاسی و سماجی ادراکات و احساسات

کی ترجمانی ہو اور اس میں انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے روایتی شعرا میں دو اور نام اپنی کثرت نویسی اور شہرت کی بنا پر قابلِ ذکر ہیں ـــ معیری (محمد حسن) اور شہریار (محمد حسین) ـــ معیری کی خوبی دستانوی عشقیہ شاعری میں مصرعوں کی روانی، فصاحت، بذلہ سنجی اور جذباتیت کی آمیزش میں مضمر ہے۔ جو سعدی کے سبکِ اشعار کی یاد دلاتی ہے۔

شہریار کے کلام میں جوش و ولولہ تندی و تیزی اور بحر و وزن کی ہمواری وہ خصوصیتیں ہیں جو اسے تمام ہمعصر شعرا میں ممتاز کرتی ہیں۔ اس کے یہاں عروضی یا اظہاری رویہ میں کوئی نیا پن نہیں لیکن اس کی خوبی جو اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ ہے۔ یہ ہے کہ اس کے پرانے سانچوں کو (خصوصاً حافظ کے) اس طرح برتا ہے کہ اس کے اشعار میں سوز و گداز، اثر اور نفسیاتی کیفیت کے ساتھ طرزِ ادا میں بھی ندرت پیدا ہو گئی ہے۔

جدید شعری یا شعر نو "ایران میں تازہ وارد اور نئے شعرا کی توجہ کا مرکز ہے جن کا خیال ہے۔ کہ قدیم ہیئتیں اور روایتیں پرانے اساتذہ ہی کے لئے مناسب تھیں۔ اور اب وہ جدید انسان کے بدلے ہوئے حالات کو اس موثر انداز میں جس کے وہ متقاضی ہیں۔ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مغرب کی شعری تحریکات و تجربات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کی رائے میں قدیم اصنافِ سخن جو متقدمین کے عہد و ضرورت کا تقاضا تھیں۔ انتہائی کمال کو پہونچ چکیں اور اب زمانہ نئے ضیعہلئے اظہار چاہتا ہے۔ اسی لئے انھوں نے نئی شعری ہیئتوں کے تجربات اپنائے ہیں جو قافیہ اور مسلم بحروں کی پابندی سے یکسر آزاد ہیں اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نظموں کے مصرعے نہ صرف چھوٹے بڑے بلکہ ان کے افکار گوناگوں اور وسیع تر موضوعات اپنے دامن میں لئے ہوتے ہیں اور موجودہ معاشرہ اور صعوبت زدہ انسان کو ان کے یہاں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ پھر قدیم پھر قدیم شعرا دائمی مسائل سے جو دلچسپی رکھتے تھے جدید فنکار ان سے لاتعلق نہیں ہیں۔ لیکن ان کی انفرادیت روایتی شعری پیکروں اور اسالیب سے ان کی بے نیازی غیر ملکی ہیئتوں کی طرف ان کا میلان نیز قدیم علوم ـــ اور کچھ قدیم فلسفوں سے ان کی لاعلمی یہ سب مل کر ایک ایسی فضا بناتے ہیں کہ کلاسیکی شعری سے اوسط درجہ کی دلچسپی رکھنے والے کو ان کے شعر کہنے کا عمل آسان، ریاض و مشقت سے عاری اور ان کی شاعری اتھلی نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

ایران میں" شعر نو" کی تحریک شروع کرنے کا سہرا نیما یوشیج (علی اسفندیاری) کے سر ہے۔ وہ ... کے ایک دور افتادہ دیہات یوش میں پیدا ہوا جہاں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ ... کے لئے تہران آ گیا یہاں اس نے فرانسیسی زبان پر مہارت حاصل کی اور اس کے ذریعے یورپ کے شعرا سے متعارف ہوا اور یہی چیز اس کے خیال کو تقویت پہونچانے کا باعث ہوئی کہ فارسی شاعری میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نے "شعر نو" کی بنیاد ڈالی جو اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ نیما نے جس بات پر زور دیا وہ یہ کہ شاعر کے جذبات و احساسات کو وزن قافیہ کا پابند نہیں ہونا چاہیئے۔ اور ہر چند کہ جدید شعرا کے یہاں ہر مصرعہ وزن کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوتا۔ لیکن نظم کسی نہ کسی بحر میں لازماً ہوتا ہے۔ اور قافیئے کا التزام خود بہ خود ہو جائے تو اس سے صرف نظر بھی نہیں کیا جاتا معلوم ہوتا ہے کہ نیما شاعری میں نغمگی کا ہونا جو اس کا امتیازی نشان ہے، قائل تھا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کے "شعر نو" کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ اور اس نے فن شعر کی

پر کئی کتابیں اور فارسی عروض کی تشکیل نو پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔

نیما نے جس سادہ پُرکار زبان میں لکھا اس میں جنگلوں پہاڑوں کی سادگی اور پُرکاری ہے اگرچہ اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے لیکن اس کے بہترین جوہر ان نظموں میں کھلتے ہیں جن میں وہ فطرت کے بیان سے زندگی اور موت کے مسائل سامنے لاتا ہے۔ نیز اس کے عشق و محبت کے اشعار میں غیر معمولی حسن و کیف ہے۔

یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ "شعر نو" کے ارتقا میں نیما کا کتنا دخل و اثر ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ نئے شعرا کی ایک بڑی تعداد روایتی شعری سے اپنا رشتہ توڑ کر نیما سے بصیرت و فیضان حاصل کرتی ہے۔ پھر اگرچہ تمام لکھنے والے انہیں راہوں پر گامزن نہیں جو نیما نے بنائی ہیں لیکن نئی ہیئتوں کی تشکیل و توسیع میں اس کی جرأت و استقلال شمع راہ ضرور رہے۔ اور دور تعمیر کہ "شعر نو" کے فنکار اسے جدید شعری کا مقتدی تسلیم کرتے ہیں۔

بامداد (احمد شاملو) جدید شاعری جس کے ورثے میں آئی ہے نو عمری میں ہی شعر کہنے لگا تھا۔ اس کا پہلا مجموعہ بائیس سال کی عمر میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے متعدد مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور اب بھی اس کی شعری تخلیقات جاری ہیں۔ بامداد کی شاعری غنائی اور بچی تلی ہوتی ہے۔ اور عموماً معاشرتی مسائل اس کا موضوع ہیں۔ اس کی نصف سے زیادہ نظمیں نیما کے انداز میں غیر مقفیٰ ہیں لیکن بعض روایتی اسلوب میں بھی ملتی ہیں اور کچھ کا تعلق اس مخصوص صنف سے ہے جو "شعر سپید" (نظم آزاد) کہلاتی ہے۔

ایران کی جدید شاعری کے افق پر ایک روشن ستارہ سہراب سپہری کی شکل نمودار ہوا۔ سپہری تہران اسکول آف فائن آرٹس کا فارغ التحصیل ہے اور اس کے کارناموں کو نہ صرف ایران بلکہ بیرونی ممالک میں بھی سراہا جاتا ہے۔ اس کے فکر و فن کی جڑیں وجودیت سے لیکر بدھمت اور جاپانی مصوری کی روایات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی مصوری اور شاعری دونوں اظہاری ہیں۔ اور پرواز تخیل اور لطافت کے اعتبار سے جاپانی مصوری اور ہائیکو (جاپانی نظم) کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس کی تخلیقات میں جہاں یورپ اور مشرق بعید کے فکری و فنی رجحانات پائے جاتے ہیں وہیں مولانا روم کا بھی بڑا مداح ہے اور اس نے اپنی بعض نظموں میں اس بزرگ شاعر کی غنائیت اور عرفانی دلاویزی کی باز آفرینی کی کامیاب کوشش کی ہے۔ سپہری کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس میں "مرگ رنگ" اور "حجم سبز" بہترین شمار کئے جاتے ہیں۔

جدید فارسی شاعری میں نادر نادرپور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ یورپی اور خاص کر فرانسیسی اور اطالوی ادبیات سے اچھی طرح آشنا ہے جس کی وجہ سے اس نے ان زبانوں سے نہایت عمدہ ترجمے اور اخذ و ماخوذ (ADAPTATIONS) فارسی میں پیش کئے ہیں۔ اس کے کلام کے کئی مجموعے نکل چکے ہیں جن میں "سرمۂ خورشید" زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اس کے کلام کا زیادہ تر حصہ خارجی مشاہدے اور عشقیہ بیان پر مبنی ہے لوچدار اور پُر تاثیر زبان اور رنگا رنگ قوافی کے استعمال کی وجہ سے اس کے اشعار ان لوگوں میں جو جدید شاعری میں کلاسیکی خوبیاں تلاش کرتے ہیں، بے حد مقبول ہیں۔ "بت تراش" "ہوس ها" اور "گل شب" اس کی زیادہ مشہور نظمیں ہیں۔

جدید فارسی شاعری میں فریدون توللی اپنی ہمہ گیری کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ تہران یونیورسٹی کا اسکول آرکیولوجی کا گریجویٹ ہونے کے باعث محکمۂ آثار قدیمہ میں کئی برس خدمات انجام دینے کے بعد اپنی جائے پیدائش

شیراز کے کتب خانہ پہلوی دالبستہ ہو گیا تو للّی کی ابتدائی شاعری پر قدیم اساتذہ کا گہرا اثر ہے اس کی نثری وشعری کاوشوں کا پہلا مجموعہ " التفاصیل " کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد " کارواں " لیکن شعری تجربات اور نیما یوشیج کے اثرات نے اس کا رخ " شعر نو " کی طرف پھیر دیا۔ اسکی جدید شاعری کا پہلا مجموعہ " رہا " کے نام سے منشہ کی درمیانی دہائی میں منظر عام پر آیا۔ اور چونکہ وہ اب تک قدیم مکتبۂ فکر کا شاعر مانا جاتا تھا۔ اس لئے تہران کے حلقۂ شعر و سخن میں اس پر بڑی شورش برپا ہوئی۔ اس نے کہا کہ وہ قدیم روایات و اسالیب کے مسترد کرنے کا مخالف نہیں لیکن اس بات کا مخالف ہے کہ بعض جدید شعرا زبان قواعد کے اصولوں کو بے جا طور پر نظر انداز اور مصرعوں کو غیر ضروری طور پر طویل اور مختصر کر دیتے ہیں۔ اور کہتا ہے " شعر نو " درکِ نو اور جدید احساسات کی شاعری ہے لیکن اسے شاعری کے مسلم اصولوں کا پابند ہونا چاہیئے۔ ہاں اگر نئے ادراک کے ساتھ روایتی شاعری نہ دے سکے تو شعر نو کا صیغۂ اظہار ضرور اختیار کرے۔

مذکورہ شعرا کے علاوہ جدید فارسی شاعری کی آبیاری اور ارتقا میں جن شاعروں کا بڑا حصہ ہے۔ ان میں ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری، م۔ امید (مہدی اخوان ثالث)، منوچہر آتشی، ہوشنگ ابتہاج سایہ، منوچہر شیبانی، سیاوش کسرائی (کولی) محمود کیانوش، فریدون مشیری، مفتون امینی، م۔ آزادہ (خلیل ملکی) حسن ہنرمندی اور فروغ فرخ زاد — فارسی بزم شاعری کی وہ شمع روشن جسے موت کے تند کے جھونکے نے بہت جلد خاموش کر دیا۔ — بھی ہیں اور دوسرے بہت سے شعرا ہیں جو فارسی شاعری کے سفر میں اپنے کارناموں کے اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض وہ ہیں جنھوں نے جدیدیت کو اپنے فکر و فن کا نصب العین بنا لیا بعض روایت سے جدیدیت کی طرف بڑھے اور بعض روایت سے جدیدیت کی طرف بڑھے۔ اور بعض روایت کی اہمیت اور جدیدیت کی بے راہ روی سے بیزار مگر اس کی ضرورت کے احساس کے ساتھ اعتدال پسندی کی راہ اختیار کی اور " شعر نو میانہ رو " کی تحریک شروع کی۔

بہر حال فارسی شاعری فارسی نثر کی طرح بڑے تغیرات سے گذر رہی ہے۔ اور شعرا ان تغیرات کو بروئے کار لانے میں اہم کردار ادا کر دار ادا کر رہے ہیں۔

ملے " شعر نو " کے بعد ایک اور تحریک " شعر موج نو " کے نام سے سامنے آئی: شعر نو " ایک کامیاب شعری تحریک تھی جس میں بحر و وزن کو یکسر خیرباد نہیں کیا گیا۔ اور قوافی کا استعمال بھی موقع کے لحاظ سے جائز رکھا گیا۔ بعض تحریک کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکے اور ایسی شاعری کہ جس میں کسی اصول و ضابطے کی پابندی نہیں تھی۔ یہی شاعری " شعر موج نو " کہلائی۔ بحوالہ جدید فارسی شاعری: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی)

پرتو روہیلہ

جدید ایرانی شاعری

اسلامی انقلاب کے بعد

ایران کا انقلاب دورِ حاضر کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ آئندہ تاریخ میں اس کو بھی وہی مقام ہوگا جو انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کا ہے۔ یا ممکن ہے کہ یہ انقلاب اس سے بھی اہم تر قرار پائے کہ اس کے اثرات اس کے وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایران سے باہر ہمسایہ ممالک پر بھی پڑتے محسوس ہو رہے ہیں، جب کہ مندرجہ بالا انقلابات کا حیطۂ اثر اپنے ملک سے باہر اتنی سرعت اور شدت سے شاید نہ محسوس کیا گیا ہو۔ بہرحال ان عوامل و محرکات کا جنہوں نے انقلابِ ایران کو ممکن بنایا اگر بہ نظرِ غائر تجزیہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی ابتدا ایک زبردست فعال مذہبی تحریک کی صورت میں ہوئی اور ہر تحریک کی طرح یہ بھی ایک خاص فلسفے پر مبنی تھی۔ چونکہ یہ ایک دینی تحریک تھی۔ اس لیے اس کا فلسفہ بھی دینی عقائد و نظریات پر مبنی تھا۔ ان عقائد میں ظہورِ مہدی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو دنیا کے نجات دہندہ کا تصور ادیان ہی میں نہیں چھوٹے چھوٹے مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے لیکن جس شدت سے یقین اور انتہائی امید کے ساتھ ظہورِ امام کا تصور اس دور کی انقلابی شاعری میں ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام میں اس عقیدے کی کیا کیفیت ہوگی۔

طاہرہ صفار زادہ

ترجمہ پرتو روہیلہ

انتظار

میں ہمیشہ سے تیری منتظر ہوں
باوجود اس کے کہ صرف بیٹھی ہوتی ہوں
(پھر بھی) ہمیشہ تیری منتظر ہوں
اور جب ہمیشہ میں راستے میں سوتی ہوں
ہمیشہ حرکت میں ہوتی ہوں
مصروف جہد ہوتی ہوں
تو چاند ستارے اور سورج کی طرح موجود ہوتا ہے
اور مقام بدر سے چمکتا ہے
تو کعبے اور کوفے سے پہونچے گا
اور اسی تہران میں پہلی بار رونما ہوگا
اپنی ذو الفقار کو بے نیام کرے گا
اور ظلم کا خاتمہ کر دے گا
میں ہمیشہ سے تیری منتظر ہوں
اے عدل معبود
یہ گلی، یہ سڑک، یہ تاریخ جن پر تیرے انتظار کی نشانیاں ہیں، تیرے انتظار میں معدوم ہو چکے ہیں
تو سب کچھ دیکھ رہا ہے
تو سب کچھ سمجھتا ہے
رُونما ہو۔ رونما ہو کہ مجھے انتظار ہے
رُونما ہو۔ رونما ہو کہ مجھے انتظار ہے

حمید سبزواری
پرتو روہیلہ:

لو (واپس) آکہ عشق جاں گزیں ہو

ھشیار کہ رات سیلاب کی طرح ہوا کی رگ تشنہ میں جاری ہے۔ ہشیار کہ رات
کے شکستہ سینے میں ستاروں کا خون بہہ رہا ہے
میرے اندر ایک عقیدے کا گونگا احساس آہستہ آہستہ رنگ پکڑتا جا رہا ہے
اور اس آغاز کی مٹھاس نے تمام بدذائقہ فضولیات کی جگہ لے لی ہے
آہ۔ اب تو واپس آجا یقین کر کہ رات دن کے تیوروں سے ہراساں ہے
ہر سپیدۂ صبح کے پیچھے سیاہ شام کا دل لرزتا نظر آتا ہے
اے امید کی پیاری سحر، زیبائی کی دلفروز مشعل، دریا اور ستاروں کی روح
غمِ شیدائی کے دلوں کے کعبے
میں اس غم میں پریشان، خستہ حال کس بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ (اور) ان
وحشت انگیز سیاہ راتوں میں تیرے انتظار میں ایک ایک لمحہ شمار کر رہا ہوں
میرا ذوق و شوق انتہا کو پہونچ چکا ہے۔ (لیکن) تو (اب بھی) خواب کے چاند کی مسکراہٹ
کی طرح ہے۔ میں تیری قدمبوسی کو پلکوں کے بل دوڑ کر پہونچوں کہ تو بہت دور سے آ رہا ہے
للہ اب تو آجا کہ تیرے چہرے کا نور ہماری شب کو سحر کر دے۔ ورنہ اے ہمارے مشفق
مہدی تیرے بغیر تو ہر لمحہ تاریک تر ہوتا جا رہا ہے
اگر تو آجائے تو شورہ زار زبوں، پیار اور روشنی کے جنگل میں تبدیل ہو جائے
اور تیرے پائے باعظمت کے نیچے کنویں بھی ہموار راستے بن جائیں
اگر تو آجائے تو صبح کے ستارے رنگ کھیلیں اور امید کے کبوتر دوبارہ اپنا آشیانہ بنائیں
ہائے شوق بے حد۔ (کیا کروں) اے (مخاطب) تو آجائے کہ عشق جاں گزیں ہو اور
صبر کی آہنی زنجیر کے نیچے میرے دل کو قرار آئے۔

••

تھائی کہانی

تھائی کہانی

پرنومرتھ زینگ

ترجمہ — نہال الدین عثمانی

تھائی لینڈ کے سوانگ قصبہ کے ایک شمالی گاؤں کے ہمارے گھر میں ایک بلی تھی۔ اس کا نام تھا سائی سوارڈ۔ یہ میرے والد کے ایک دوست نے مجھے تحفہ میں دی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں اور گہرے بھورے ملائم بالوں پر میں عاشق تھا اسے ہمارے گھر کے سبھی لوگ پیار کرتے تھے لیکن ابھی تو اسے پورے ضلع میں شہرت حاصل کرنا تھی۔

۱۹۲۵ کی خشک سالی کی تو سائی سوارڈ ہی ہیروئن تھی۔ اسے بارش کی رانی منتخب ہونے کا اعزاز جو حاصل ہوا تھا۔

اس سال گرمیوں میں تین مہینے تک تو ایک انچ بھی بارش نہیں ہوئی۔ شدت کی گرمی تھی۔ تالاب سوکھ کر کیچڑ ہو رہے تھے اور ندیوں میں پانی کے محض نشانات باقی تھے۔ جب ہمارے مویشی مرنے لگے تو ہم انھیں خیال میں لیں ندی کے کنارے لے گئے۔ لگتا تھا اس سال کھیتی کرنا ممکن نہ ہوگا۔

کسی نے مشورہ دیا کہ ہمیں نانگ سلوٗ یعنی برکھا رانی تقریب منانا چاہیے۔ اور ایک دن ایک بڑھیا اس کام میں مدد مانگنے میرے والد کے پاس آئی۔

اس دن والد صاحب میرے پاس آئے تو بہت سنجیدہ تھے، انھوں نے آہستہ سے سائی سوارڈ کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور مجھ سے کہنے لگے "آئی نو (میرے پیارے ننھے چوہے) گاؤں والوں نے جشن باراں منانے کے لیے مجھ سے مدد مانگی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ ہماری بلی۔ سائی سوارڈ کو لے جا سکتے ہیں۔

میں دنگ رہ گیا۔ وہ ہماری بلی کیسے لے جا سکتے ہیں۔ میرے دماغ میں چینیوں کی وہ سالانہ تقریبات گھومنے لگیں جب وہ اپنے بزرگوں کی یاد میں مرغ کاٹ کر ابالا کرتے تھے۔ تو کیا وہ میری بلی بھی کاٹ کر ابالیں گے۔ ؟ کبھی نہیں !

میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "بالکل نہیں" میں کسی کو بھی اپنی سائی سوارڈ کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گا چاہے بارش ہو یا نہ ہو"

والد صاحب نے کہا "بیٹے! کوئی تمھاری سائی سوارڈ کو مارنے تو نہیں جا رہا ہے۔ ہماری بلی تو گاؤں کی سب سے خوبصورت اور صاف ستھری بلی ہے اس لیے اسے منتخب کیا گیا ہے۔

میں اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ آخر میں والد صاحب نے کہا "جیسے ہی یہ جشن ختم ہوگا تم اپنی بلی لے آنا۔"

اسی شام مندر کے احاطے میں گاؤں کے بوڑھے مکھیا نے اعلان کیا کہ کل دوپہر بعد نانگ ماؤ جشن شروع ہوگا۔

دوسرے دن صبح گاؤں کے سبھی لوگ مندر کے احاطے میں جمع ہوئے۔ سبھی چھوٹے بڑے نئے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دو کاریگروں نے بانس کا ایک بڑا سا پنجرہ بنایا تھا جسے پھولوں اور پتوں سے اس طرح سجا دیا گیا تھا کہ ایک چھوٹا سا محل لگنے لگا تھا۔

کچھ بوڑھی عورتوں نے سائی سوارڈ کے کنگھی کی اور اس کے سر پر عطر چھڑکا۔ وہ مر گئے کے لیے بہت چھٹپٹائی لیکن پنجرہ میں جاتے ہی خاموش ہوگئی جیسے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہوگئی ہو۔ پھر پیروں کے بیچ میں سر ڈال کر سو گئی۔ پنڈت نے آکر اس کے سر پر پانی کے چھینٹے ڈالے لیکن وہ اسی طرح سوتی رہی۔

جھلسا دینے والی گرمی کے باوجود لوگ وہاں بارش کی رانی سائی سوارڈ کو دیکھنے اور بارش کے لیے دعا مانگنے جمع ہو گئے تھے۔ جیسے ہی بڑے پجاری نے پنجرہ کے پاس ایک موم بتی جلا کر پالی زبان میں بارش کی دعا کرنی شروع کر دی۔ پجاری سائی سوارڈ پر پوتر جل چھڑکا جانے لگا۔ عوام نانگ ماؤ گیت گانے لگے پہلے دھیرے۔ دھیرے۔ پھر آواز تیز ہوئی تھی اور پھر جیسے ہر شخص چیخ رہا ہو۔ لوگ گانے کے ساتھ ساتھ رقص کرنے لگے۔

اس تقریب کو دیکھتے ہوئے رانی کی طاقت پر جیسے مجھے اعتماد ہوتا جا رہا تھا سائی سوارڈ اپنے پنجرہ میں ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ اس شور و غل سے اسے کوئی مطلب ہی نہ تھا۔ تبھی دو لوگوں نے اس کا وہ چھوٹا سا محل کندھوں پر اٹھایا اور باہر نکل گئے۔ ان کے پیچھے ساری بھیڑ بھی باہر آگئی۔ اب باقاعدہ ایک جلوس بن گیا تھا جس کے آگے آگے ڈھول والے زور زور سے ڈھول پیٹتے ہوئے چل رہے تھے۔

یہ جلوس جب بازار کی طرف چلا تو کافی لوگ ساتھ آچکے تھے۔ سبھی نانگ ماؤ گیت گا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے بارش کی رانی کو اٹھانے والے ان دو کہاروں کو چاول اور شراب پیش کی۔

سائی سوارڈ راستہ بھر سوتی رہی۔

جب ہم کھلے بازار میں پہنچے تو وہاں کافی شور تھا۔ کچھ لوگ آتش بازی اور پٹاخے چھوڑ رہے تھے۔ کچھ عورتوں نے سائی سوارڈ پر پیالہ بھر عطر اور پھول ڈال دیئے۔ اس شور و غل و عطر کے چھڑکاؤ کی تو انتہا ہو رہی... لوگ تھے کہ عطر چھڑکتے ہی جا رہے تھے۔ اب تو سائی سوارڈ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے لوگوں کو گھورنے لگی۔ اس کے ملائم جھبرے بال بری طرح بھیگ گئے تھے۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی اور پنجرہ سے نکل بھاگنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

صورتحال مزید نازک ہوتے دیکھ کر میں تقریباً چیختا ہوا والد صاحب کے پاس پہونچا اور بلی کو بچانے کے لیے کہا۔ والد صاحب نے سمجھایا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا تھوڑی دیر میں عطر چھڑکنے کا کام ختم ہو گیا اور سبھی لوگ خاموش ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی سائی سوارڈ بھی خاموش ہوگئی۔ وہ بری طرح بھیگی ہوئی تھی اور کانپ رہی تھی۔

اب یہ جلوس مندر کی طرف واپس جانے لگا۔ لوگ دھیمی آواز میں گا رہے تھے۔ ڈھولکیے بھی اب دھیرے دھیرے ڈھول بجا رہے تھے۔ واپسی کے پورے راستے بھر بلی کی دلدوز چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ چپ چاپ جلوس کے ساتھ چلتا رہا۔

لوگوں نے پنجرہ کو مندر کے سامنے رکھ دیا اور دعا کرنے کے لیے مندر کے اندر چلے گئے۔ سائی سوارڈ کے لیے کچھ کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے چپ چاپ اسے پنجرہ سے نکالا اور گھر کی طرف بھاگا۔

اسی رات دس بجے گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سائی سوارڈ اب خاموش تھی۔

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

(بنگلہ دیش کی کہانی)

بگولا

معین الدین

ترجمہ

نہال الدین عثمانی

"بنگال کی ہریالی اور ندی نالوں سے گھرا ہوا یہ گاؤں نئی نگر کے نام سے مشہور تھا۔ جناب علی اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ کھاتے پیتے گھروں میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا۔ دن بھر کی محنت کے بعد کھانا اور ایک آدھ روپیہ نقد مل جاتا تو پھولا نہ سماتا۔ گھر میں کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ شادی بیاہ کا سوال ہی نہ تھا۔ اسے بھلا کون اپنی لڑکی دیتا۔"

ایک دن وہ خان صاحب کے گھر گیا۔ خان صاحب کے باورچی خانہ کا چھپر کھسک گیا تھا۔ اسے پھر سے باندھنے کی مزدوری ملی تھی جناب علی کے سوا سستی مزدوری کام پر کوئی تیار نہ ہوا۔ وہ صبح صبح ہی کام پر جا لگا۔ ایک پہر دن چڑھنے تک اچھا خاصا کام کر چکا تھا اور بھوک بھی زور سے لگی تھی۔ وہ چھت سے اترا اور ناشتہ مانگا۔ گھر کی مالکن نے اپنی بچی سے کہا "امینہ! میرا ہاتھ آٹے میں پھنسا ہوا ہے۔ جاؤ ذرا جناب علی کو رات کا بچا ہوا چاول دے آ۔ اور سن، ایک پیاز اور دو ہری مرچیں بھی دے آنا۔"

امینہ کی عمر ہی ایسی تھی کہ وہ کچھ شرماتی ہوئی آئی اور کالے کی تھالی میں چاول اور ایک میلے کچیلے گلاس میں پانی رکھ دیا۔ اس نے کہا "آیا آکیا رات کا ہوا سالن بھی مل جائے گا!"

امینہ چپ رہی لیکن اس کی ماں نے باورچی خانے سے ہی کہا "سالن تو نہیں ہے۔ اسی طرح کھا لے۔"

جناب علی چپ چاپ کھانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جناب علی نے قدموں کی آہٹ سنی۔ امینہ نے ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں مچھلی اور بینگن کا سالن تھا۔۔۔۔

جناب علی نے امینہ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ کتنی اچھی تھی امینہ کیسی موہنی سی، کتنی ہمدرد! اس کے اندھیرے دل میں پیار اور لگن کی جوت جل اٹھی۔ دوپہر تک وہ کام کرتا رہا۔ پھر اسے گرمی محسوس ہوئی اور وہ نہانے کے لیے ندی پر جانے لگا۔ امینہ

کی ماں نے کہا۔ "اے جناب علی، گھڑا لیتا جا اور پانی بھر لا۔ آٹھ پانی کی کمی ہے۔ اور امینہ کو نہانا ہے۔"

جناب علی ہنس دیا۔ وہ ہر بات پر ہنس پڑتا ہے۔ یہ ہنسی اس کا سب سے بڑا سہارا تھی۔ بچپن سے اب تک پیار سے محروم ایک اکیلے انسان کے لیے یہ دکھوں کو چھپانے کا سب سے بڑا سہارا۔ اگر وہ بات بات پر ہنستا نہیں تو شاید اب تک پاگل ہو چکا ہوتا۔

اس نے ایک کے بجائے دو گھڑے اٹھائے اور ندی کی طرف چل دیا آدھے گھنٹے بعد واپس ہوا تو ایک گھڑا کندھے پر تھا اور دوسرا ہاتھ میں۔ امینہ کی ماں بولی:

"جناب علی! تو بھی کیا پاگل ہے۔ ندی پاس ہی تو ہے۔ دو پھیرے کر لیتا۔ ایک ہی بار دو گھڑے لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

جناب علی شرمندہ سا ہو گیا۔

دوسرے دن وہ چھت پر کام میں لگا ہوا تھا۔ سُتلی کا گولا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ امینہ آنگن میں بیٹھی تھی۔ جناب علی نے کہا "آپا! ذرا یہ سُتلی اٹھا دو۔"

امینہ مسکرائی اور سُتلی کا گولا اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔ کلائیوں کی چوڑیاں کھنک اٹھیں اور آنچل سرکنے سے سڈول بانہہ ننگی ہو گئی۔

جناب علی اسے دیکھ کر ٹھٹکا سا رہ گیا۔ امینہ بھی شرما گئی اور جلدی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

تیسرے دن جناب علی نے کام ختم کر لیا مزدوری کے پیسے لیکر جانے لگا تو امینہ نے کہا۔

"جناب علی ٹھہرو۔ یہ گڑ لیتے جاؤ۔" جناب علی خوشی سے جھوم اٹھا۔

امینہ کے والد شہر میں نوکری کرتے تھے۔ ہر ماہ کچھ روپے بھیجتے تھے۔ تھوڑی سی زمین بھی تھی، جو بٹائی پر دے رکھی تھی کبھی بٹائی والے اناج بھیجنے میں دیر کرتے تو جناب علی کو ہی ان کے پاس بھیجا جاتا۔ ان ہی دنوں امینہ کے یہاں چاول ختم ہو گیا۔ اس بار بھی جناب علی کو بلوایا گیا۔ اور بٹائی والوں سے چاول لانے کے لیے کہا گیا۔

کوئی دو گھنٹے بعد جناب علی ہانپتا کانپتا کندھے پر بورا رکھے واپس آ گیا امینہ نے اسے پسینہ سے تر دیکھا تو بولی۔

"جناب بھائی پانی لاؤں؟"

جناب علی کی ساری تھکان جیسے غائب ہو گئی۔ وہ ہنس پڑا۔ مٹی کے گھڑے سے شیشے کے گلاس میں پانی انڈیلتی ہوئی امینہ کو محسوس ہوا کہ ماں سر پر کھڑی ہے۔ اس نے سر اٹھایا۔ ماں کہہ رہی تھی "لڑکی! پاگل ہو گئی ہے کیا! جناب علی کو اس گلاس میں پانی دے گی؟"

جناب علی جیسے غریب انسان کے لیے امینہ کی ہمدردی کو اس کی ماں نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور اسی جمعہ کو امینہ کے والد آئے تو ان پر زور دیا کہ بیٹی کی شادی جلدی ہونا چاہیے بہت دیکھ بھال کے بعد عظیم نگر کے چودھری گھرانے کا لڑکا پسند آیا۔ شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

شادی سے کچھ دن قبل جناب علی کو کام کاج کے لیے بلوا لیا گیا۔ اس نے ایک خشک درخت کاٹا۔ گاؤں کی لڑکیوں کو چاول کی سوئیاں تیار کرنے میں مدد دی۔ سوکھی ہوئی روٹیاں کوٹ کر لڈو بنائے گئے اور لڑکیاں عورتیں سب مل کر گانے بجانے لگیں۔ خان صاحب نے کہا۔

"جناب علی سارے کام ہو گئے۔ آج دن بھر پانی بھر لو تاکہ شادی کے دن پریشانی نہ ہو۔"

جناب علی نے گھڑے اٹھائے اور پانی لانے کیلئے چل دیا لیکن نہ جانے کیوں آج اس کے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پچھلے کئی دن سے کام کرتے کرتے وہ تھکا تو نہیں تھا، لیکن بجھ سا ضرور گیا تھا۔

صبح سے شام تک جناب علی پانی بھرتا رہا۔ سارے برتن بھر دیئے۔ پھر وہ پانی لا کر چھڑکاؤ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ آنگن کیچڑ بن گیا اور خاں صاحب نے ڈانٹ کر کہا "جناب علی! شام ہونے کو ہے۔ اب کوئی دوسرا کام دیکھ لو۔"

دوسرے دن وہ صبح سارے کام نپٹا کر چلنے پینے لگا۔ اتنے میں پٹاخہ چھوٹنے کی آواز آئی۔ کسی نے کہا "لو، بارات آگئی۔" دیکھتے ہی دیکھتے دولہا کی پالکی آنگن میں آگئی۔۔۔ لڑکیاں اندر سے نکل آئیں۔ جناب علی نے بھی دولہا کو دیکھا اور پھر دوڑتا ہوا اندر گیا۔ شائد امینہ کو بتانا چاہتا تھا۔

لیکن امینہ کو نہ جانے کس کونے میں چھپا دیا گیا تھا۔ کمرے میں عورتیں بھری تھیں۔ اچانک امینہ کی ماں باہر آئیں۔۔۔ جناب علی نے جوش کے مارے ان کا راستہ روک لیا اور بولا "ماں جی! مبارک ہو۔۔۔!"

امینہ کی ماں دولہا کا استقبال کرنے جا رہی تھیں۔ جناب علی کو اس طرح راستے روکتے دیکھ کر انھیں غصہ آگیا سمجھیں انعام لینا چاہتا ہے۔ جھڑک کر بولیں "دفع ہو جا مجھے اپنا کام کرنے دے۔۔۔ پاگل"

جناب علی حیران رہ گیا۔ اس نے کیا قصور کیا تھا جو یوں ڈانٹ پڑی۔ چپ چاپ ایک طرف ہٹ گیا۔ آنگن سے ہی نہیں گھر سے بھی۔ اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ بس، اپنی جھونپڑی میں جا کر لیٹ گیا۔ شادی کے دوران کسی نے اسے نہیں دیکھا اور پھر وہ کسی کو یاد بھی کیوں آتا؟ سارا کام تو ہو چکا تھا۔ کھانا پک چکا تھا۔ لکڑی بھی کافی تھی۔ پانی ختم نہ ہونے میں نہ آتا تھا۔

کئی ماہ گزر گئے۔ جناب علی اسی طرح محنت مزدوری کرتا رہا۔ ایک دن امینہ کی ماں نے اسے بلوایا اور کچھ چیزیں دے کر امینہ کی سسرال امین نگر بھیجا۔ بارہ کوس کا فاصلہ تھا۔ جناب علی وہاں پہونچا تو سر سے پیر تک پسینہ سے تر تھا۔

اتفاق سے امینہ کا شوہر بیمار تھا۔ شہر سے ڈاکٹر بھی دیکھ گیا تھا۔ جناب علی سلام دعا کے بعد آنگن میں ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں امینہ کا دیور آیا اور بولا۔

"بھابی! بازار میں ڈاب تو ملا نہیں۔ گھر کے پاس ناریل کا جو پیڑ ہے اس پر ڈاب تو موجود ہے لیکن کوئی آدمی نہیں مل رہا ہے جو درخت پر چڑھ سکے۔"

ڈاکٹر نے امینہ کے شوہر کے لیے ڈاب کا پانی بتایا تھا جناب علی فوراً بولا "آپا میں کوشش کرتا ہوں۔" امینہ بولی جناب علی تم سیڑھی کے بغیر اتنے اونچے درخت پر چڑھو گے کیسے؟"

جناب علی ہنسا "تم گھبرائی کیوں ہو آپا! بس ایک رسی لا دو۔" اس سے پہلے کہ امینہ جواب دے، اس کا دیور اندر سے رسی کا گچھا لے آیا۔ جناب علی نے رسی کو دہرا کیا۔ داؤ بنا کر دونوں طرف گانٹھ لگائی اور آنگن سے نکل آیا۔ امینہ اور اس کا دیور بھی اس کے پیچھے تھے۔ جناب علی نے درخت کے تنے کے گرد داؤ باندھ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پیڑ پر چڑھ گیا۔ چاقو سے ڈاب کا گچھا کاٹ کر زمین پر پھینک دیا اور امینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بہت نیچے تھی لیکن اس کا دمکتا ہوا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جناب علی کو لگا جیسے چوڑیاں کھنک رہی ہیں۔

ایک لمحہ کے لیے وہ فضا میں تیر گیا اور شائد اسی لمحہ اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے داؤ پر زور لگا کر رکنے کی کوشش کی۔ لیکن رسی اتنا بار برداشت نہ کر سکی اور ٹوٹ گئی۔ جناب علی تیس فٹ کی بلندی سے زمین پر آ گرا۔

اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود وہ مرا نہیں لیکن اسے ایسی اندرونی چوٹ آگئی کہ منہ سے خون جاری ہو گیا۔ امینہ گھر کے دیگر افراد کو جمع ہوتے دیکھ کر بولی "پاگل کہیں کا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اتنے اونچے پیڑ پر نہ چڑھو، لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔"

کچھ لوگوں نے مل کر جناب علی کو اٹھایا اور امینہ کے گھر کے پچھواڑے ایک جھونپڑے میں ڈال دیا۔ جناب علی نے دو ایک بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہائے ہائے کرنے لگا۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

بنگلہ دیش کی ایک نظم

شمس الرحمان

ترجمہ: شاہ نواز قریشی

بنگلہ دیش کے مشہور و معروف شاعر شمس الرحمان نے یہ نظم اس زمانے میں لکھی تھی، جب بنگلہ دیش ۱۹۷۱ء میں قربانیوں کی راہ پر قدم رکھ چکا تھا اور اپنی آزادی کے لیے نبرد آزما تھا

رہتی تھی وہ دور\
اپنے پر سکون اک گاؤں میں\
کھوئی ہوئی اپنے گھریلو کاموں میں\
آسمان پہ دھڑکتے سورج\
یا بادل کی رواں کشتی سے\
اس کی توجہ کا رشتہ کچھ کچا تھا\
وقت تھا کہ اس کی توجہ سے غافل\
پر لگا کر اڑتا رہا

بے حد جانا پہچانا تھا سارا منظر
اُبلتے چاول چولہے پر
دو۔ ایک مچھلیاں، کچھ پالک کا ساگ
سب کچھ یہ شوہر کیلئے تھا
جو ٹیچر اک چھوٹے سے اسکول میں تھا

اٹھائیں اس نے نظریں
اور پھر نیچی کر لیں
نیچے باڑھ پہ لوکی کی بیلوں کی سرسر تھی
کٹھل کے پیڑ کی شاخ پہ بیٹھی
زرد چڑیا نے رکے بنا دُم اپنی ہلائی
لمحے تھے کہ گذرتے رہے

کنویں کے پانی سے نہا کر
کنگھی اس نے کی بالوں میں
ہلکی لمبی مانگ نکالی
اور خیال آیا پھر اس کو اپنے چھوٹے بچے کا
جو ایک مقامی اسکول میں سیکھ رہا تھا
رٹ کے ضرب کا قاعدہ

پھر اس نے اک بیل۔ بوٹوں والے مرتبان میں
گھر کے بنے کچھ کیک رکھے
اور خیال آیا پھر اسکو اپنے بڑے لڑکے کا
آنکھیں جس کی سدا چمکتی رہتی تھیں
جو دور شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا
ہمت اس کی کم ہی ہوئی تھی
اپنے چھوٹے گھر سے باہر جانیکی
جیون اس کا سادہ، شانت اور
گم نام سا تھا
صرف والدین کی یادیں ہی
جو کافی پہلے مر چکے تھے
اکثر اس کے دل کو اک درد دے جاتی تھیں

اور ہل اٹھا پھر سارا ملک
اک بگڑے دیوتا کی مانند
آئیں خبریں بہتی ہوئی ہر چپے سے
قربانیوں نے جیسے اک اوتار لیا
خون میں لت، پت کپڑے اس کے بیٹے کے
گاؤں میں رہنے والی ماں کو کھینچ لائے

بیرحمی سے
بھری لوکیاں، ندی، چراگاہ
کلائی کا میدان اور اس کا
پرانا جانا۔ پہچانا تالاب
سب کچھ، دور پیچھے چھوٹ گیا تھا

آج کسی نے پائے اس کے نقشِ قدم
شہر کی تنگ اور چوڑی سڑکوں پر
لمبے۔ لمبے راستوں پر، گلیوں میں
کھو کر اپنے بیٹے کو
ماں اب اپنے چوٹ کھائے
دل کے چمکیلے اشکوں کو
ڈھال چکی ہے
گونجتے نعروں میں

○ ○

سوال

نیپالی کہانی

وی۔ پی کوئرالا

ترجمہ — نہال الدین عثمانی

ککّک بہادر نے ۱۴ سالہ لڑکی سے شادی کی اور اسے گھر لے آیا۔

صوبیدار ککّک بہادر ادھیڑ عمر ہے۔ ویسے بھی میں نے کسی صوبیدار کو کم عمر نہیں دیکھا۔ یہ صوبیدار کی دوسری شادی ہے۔ میرا خیال ہے کہ صوبیدار کے سرکاری مسائل اتنے ہوں گے کہ اس نے اپنا دل بہلانے کے لیے اس لڑکی سے شادی کی ہوگی۔ مجھے اس بھولی بھالی لڑکی پر ترس آرہا تھا جو ابھی شادی کا مطلب بھی نہیں سمجھتی ہوگی۔

میں نے پہلے بھی ایک ایسی شادی دیکھی ہے۔ دولہا کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن میں ایک بیس بائیس سالہ نوجوان کا چہرہ ابھرتا ہے۔ شاید سب گاؤں والیاں بھی یہی سمجھ رہی تھیں۔ کافی دیر بعد شور مچا "دولہا آرہا ہے... دولہا آرہا ہے" تو سب دروازہ کی طرف دوڑ پڑے۔

آنے والے سبھی ادھیڑ عمر تھے۔ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ ان میں سے دولہا کون ہو سکتا ہے۔

کالا کوٹ ڈالے ہوئے ایک حضرت سب سے الگ نظر آرہے تھے۔ میں نے سوچا یہی دولہا ہوگا..... اور واقعی وہ دولہا ہی تھا۔

میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا "یہ ان کی پہلی شادی ہے؟"

"نہیں! اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ اس شخص نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "مجبوراً اسے دوسری شادی کرنا پڑی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ کوئی بھی مرد نہ گھر کی دیکھ بھال کر سکتا ہے نہ بچوں کی پرورش"

میں نے سوچا کہ دلہن بھی ادھیڑ عمر کی ہوگی۔ تبھی تو وہ گھر گرہستی بھی کرے گی اور بچوں کی پرورش بھی۔ لیکن میرا خیال اس وقت غلط ثابت ہوا جب دلہن منڈپ میں لائی گئی۔ وہ مشکل سے چودہ سال کی تھی جبکہ چالیس سال کے مرد سے بیاہی جا رہی تھی۔

سارا قصہ میرے پہنچنے سے پہلے ہو چکا تھا

صوبیدار ککّک بہادر کے بارے میں [illegible] [illegible]

نیپالی کہانی

مشورہ

کشور پہاڑی

ترجمہ ـــــــ نہال الدین عثمانی

بس اسٹاپ تھا۔ بس اسٹاپ میں بھی لوگ تھے۔ اسی بس میں تم نے قدم رکھا پہلے لوگوں کے چہرہ پر نظر جائی اور اس کے بعد پوچھا "یہ بس کہاں جا رہی ہے؟"
سب خاموش اپنے آپ میں ہی مگن تھے۔ اسکے لیے کہیں سے بھی جواب نہ ملا۔
"یہ بس کدھر جائے گی؟" تم نے ذرا زور سے پوچھا۔
پھر بھی کوئی نہیں بولا تم کچھ حیران ہوئے۔ کچھ ناراض ہوئے۔ تم نے دانت پیسے اور زور سے چلائے۔
"یہ بس کیرتی پور جائے گی کیا؟"
پھر بھی کہیں سے کوئی جواب نہ آیا
اس بار تم بہت ہی حیران ہوئے۔
بہت ہی ناراض ہوئے بہت دانت کٹکٹائے اور بڑبڑائے۔
"کیسے لوگ ہیں یہ!
بہرے ہی شاید!" اور جس طرح آئے تھے لاچار ہوکر چپ چاپ اسی طرح واپس ہو گئے۔ بس کے باہر آتے ہی تمہیں محسوس ہوا کہ زیادہ چیخنے سے تمہارا گلا خشک ہو گیا ہے۔ سوکھے ہوئے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تم نے سوچا "اتنا زیادہ میں چیخا، چلایا۔ ... لیکن کوئی ردعمل نہ ہوا ... کیوں؟"
لیکن مسٹر! تم جتنی زور سے چلائے تھے نا وہ تو اس ملک کے لوگوں کے لیے ... کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس طرح چلانا ملک میں تو کیا بس میں بھی کوئی ردعمل پیدا نہیں کر سکتا۔ یہاں سبھی لوگ بہرے رہنے کے عادی ہیں۔ یہ بات تمہیں شاید معلوم نہیں۔

ہم اس ملک کے شہری ہیں۔ اس لیے آؤ ہم بھی اپنے اپنے کانوں کو حالات کی تہہ میں دبا دیں اور زبان کہیں لیجا کر گروی رکھ دیں۔

تمہاری کہانی

(باقی صفحہ ۶۴ سے آگے)

جیسے دن کے واقعہ کو فراموش کر چکی ہو۔ وہ میرے بستر میں گھس کر گہری نیند سو رہی تھی۔ میرے والدین ابھی تک مندر سے نہیں واپس ہوئے تھے۔ میں بہت تھکا ہوا تھا مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب مجھے نیند آگئی۔
صبح کے تین بجے ہوں گے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی ریل گاڑی دھڑ دھڑاتی ہوئی آ رہی ہو۔ پھر بجلی کڑکنے کی آواز سنائی دی۔ اور کچھ ہی لمحوں میں پھوار پڑنے لگی۔ گاؤں کے سبھی لوگ بستروں سے اچھل کر باہر آگئے۔ سب خوش تھے تین دن اور تین رات مسلسل بارش ہوتی رہی ایسا لگتا تھا کہ جب تک بادلوں سے پانی کی ایک ایک بوند نچڑ نہیں جائے گی، بارش بند نہیں ہوگی۔ ہماری فصلیں برباد ہونے سے بچ گئیں۔ لیکن سائی سوارڈ کو اس بارش سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تین دن آرام سے سوتی رہی۔ بعد میں کسان اسے دیکھنے آتے رہے وہ اسے کھانے کے لیے مچھلی اور گوشت دیتے۔ کسان کو یہی سو رہے تھے کہ اس سے سائی سوارڈ نے ان کی فصلوں کو تباہی سے بچایا۔

شری لنکا کی کہانی

سیلاب

ترجمہ نہال الدین عثمانی

اچانک خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں بھاگتا ہوا فیلڈ آپریشن کمانڈر کے دفتر میں پہونچا۔

"پلاٹون نمبر ایک!" آپریشن کمانڈر نے میری طرف اشارہ کیا۔ "ٹرک، ربڑ کی کشتیوں اور دیگر حفاظتی سامان کے ساتھ اپنے دستے کو لیکر فوراً اس جگہ پہونچو۔" اس نے دیوار پر ٹنگے نقشہ پر کولمبو سے ۳۰ میل شمال میں واقع ایک گاؤں کے گرد لال دائرہ بنا دیا۔ یہ گاؤں ایک دریا کے کنارے واقع تھا اور دریا میں بتدریج بڑھتا ہوا پانی کسی بھی لمحہ سینچائی کے تالاب کا بندھ توڑ کر بستیوں کا نام و نشان مٹا سکتا تھا۔

ہم نے جلد ہی راحت رسانی کی تیاری کرلی۔ ٹرک حرکت میں آگئے اور ہم شہر کے سناٹے کو چیرتے ہوئے اپنی منزل پر روانہ ہوئے۔ ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت تھی۔ کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا آنے والا ہے۔ راستہ انتہائی دشوار تھا سڑکوں پر پانی بھرا ہوا تھا۔ اپنی منزل پر پہونچکر ہم نے ایک نسبتاً اونچی جگہ پر کیمپ لگایا۔ دور پر مکانوں کی چھتیں اور چھپر نظر آرہے تھے۔ دریا کی باڑھ کا پہلا نشانہ یہی گاؤں بننے والا تھا۔

ہمارے پاس ربڑ کی دو کشتیاں تھیں۔ میں نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گاؤں سے باہر نکالنے کا کام فوراً شروع کردیں۔ میں ایک ملاح کارینیڈی کے ساتھ کشتی میں سوار ہوکر گاؤں کی طرف چلا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم صحیح وقت پر پہنچ گئے۔ پانی ابھی ابھی گاؤں میں داخل ہوا تھا بچے چھینٹے اڑاتے گلیوں میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ لوگ گھروں کا سامان چھتوں اور درختوں پر رکھنے میں لگے ہوئے تھے کئی جگہوں پر لکڑی کے تختے جوڑ، جوڑ کر اونچے اونچے چبوترے بنالیے گئے تھے جن پر بوڑھے بچے اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی بلند آواز میں کہا "بھائیو! پانی برابر بڑھ رہا ہے۔ آپ کی یہ تدبیریں کسی کام نہ آئیں گی۔ ہم آپ کو گاؤں سے نکال کر محفوظ مقام پر پہونچانے آئے ہیں۔ حکومت کھانے پینے اور سیلاب ختم ہونے کے بعد آبادکاری کا بندوبست کرے گی۔"

سب لوگ اپنا کام چھوڑ کر ہماری بات سننے لگے تھے۔ جب ہم اپنی بات پوری کر چکے تو وہ دوبارہ کام میں لگ گیے۔ میں بار بار اپنی بات دہرا رہا تھا۔ ہر بار میری آواز پانی کی لہروں سے ٹکرا کر رہ جاتی یا پھر جواب میں کچھ لوگ گھورنے لگتے۔

سامنے بانس کی سیڑھیوں سے ایک بوڑھی عورت چھپر پر چڑھ رہی تھی۔ میں نے آواز دی۔

"ماں!" ادھر ناؤ میں کیوں نہیں آجاتیں؟"

"کہاں چلوں؟" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "کس کا ہے کو چلوں؟ ہم تو یہیں ٹھہریں گے اور جو تھوڑا بہت ہے اس کی حفاظت کریں گے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اس سے

بھی ہاتھ دھولیں۔"

"لیکن ماں، تمھارا نقصان حکومت پورا کر دے گی۔"

"حکومت..... حکومت.....

ہونہہ۔ خدا ہی سب کچھ تباہ کرتا ہے۔ وہی دوبارہ دیتا بھی ہے..... حکومت کیا دے گی بھلا۔ پچھلی بار سیلاب میں میری جوان بیٹی ڈوب کر مرگئی۔ کیا حکومت واپس لا سکتی ہے میری جوان بیٹی کو؟" بڑھیا پھر پلٹ کر ہماری طرف منہ کر کے چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی

"یا اللہ! تو دیکھتا نہیں ہم ساری عمر دھان کی کاشت کرتے ہیں۔ اس کے اردگرد باڑ لگاتے ہیں۔ پھر باڑ آگے بڑھ کر ہمارے کھیتوں کو کھا جاتی ہے۔ آہ! ہم کر بھی کیا سکتے ہیں..... ہم کہاں چلے جائیں!"

میں نے مناسب موقع دیکھ کر دوبارہ کہا "ماں..... ! تو پھر ہمارا کہنا مانو۔ ہم تمھیں محفوظ مقام پر پہونچا دیں گے۔"

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ہم مایوس ہو کر آگے بڑھے۔ ایک جگہ بہت سے آدمی جمع تھے میں نے انھیں تلخ لہجہ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم عورتوں اور بچوں کو گاؤں خالی کرنے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ کیا اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبنے پر تلے ہوئے ہو؟" "کیا تم ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہتے ہو۔ .... بالکل الگ..

جواب ملا۔"

مجھے ان لوگوں کو یہاں سے زبردستی نکالنا پڑے گا۔ پانی کی سطح تشویشناک حد تک بلند ہو چکی ہے!" میں نے فیصلہ کن لہجہ میں ملاح سے کہا۔

"لیکن آپ انھیں مجبور نہیں کر سکتے" کاربینیڈی نے جواب دیا۔ "یہ گاؤں والے یہیں پلے بڑھے ہیں۔ آپ کی بات ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔"

"ہمیں حالات کی نزاکت سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔" میں نے ذرا فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"اب آئے ہیں آپ راستے پر" کاربینیڈی نے پیٹھ ٹھونکی اور کہا بھلا اس سیلاب کا آپ کیا سبب سمجھائیں گے۔"

اچانک اس سوال سے میں بوکھلا سا گیا۔ فلسفیانہ بحث کا یہ کون سا موقع تھا۔

میرے منہ سے بے اختیار نکلا"

"خدا کی مرضی"

اور اس لفظ نے تمام صورتحال واضح کر دی۔ گاؤں والوں کا رویہ بالکل فطری لگنے لگا۔ مجھے اپنا مشن ناکام ہوتا نظر آیا تھا۔ کوئی بھی ہماری مدد قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اچانک ایک زبردست دھماکہ کے ساتھ باندھ ٹوٹ گیا۔ پانی کا ایک ریلا آیا اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ آیا۔

نہ جانے کب تک میں لہروں کے تھپیڑے کھاتا رہا۔ آخر پانی کی سطح پر ابھر تو مجھے اپنے وجود کا احساس ہوا۔ لیکن اس وقت میں کہاں تھا، مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ میرے کپڑے کا بھر کم ملٹری بورڈ اور وردی پانی میں بھیگ کر وزنی ہو چکے تھے۔ "زندگی چاہتے ہو تو اس لباس سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لو۔" یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی وردی اتار دی۔ میرے جسم پر بنیائن اور نیکر باقی رہ گئی۔

کافی دیر تک ہاتھ پیر مارتے رہنے کے بعد دور پر روشنی نظر آئی جو کسی پختہ مکان کی کھڑکی سے چھن کر آ رہی تھی۔ یہ روشنی میرے لیے لائٹ ہاؤس کی حیثیت رکھتی تھی۔ مسلسل بارش اور طوفانی ہوا سے میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ مکان تک پہونچنے کے لیے خاصی ہمت کی ضرورت تھی جو جواب دے چکی تھی پھر بھی زندہ رہنے کی امنگ نے سہارا دیا اور میں تیرتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی پانی کی سطح سے ذرا اوپر تھی۔ شائد یہ دوسری منزل کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ میں نے گھونسہ مار کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ کسی نے بندوق کی نال میری گردن پر رکھدی۔

"خبردار! گولی مار دوں گا"

ایک کمزور لیکن آواز رعب دار آواز آئی۔

"میں پناہ چاہتا ہوں"

"نہیں تم لٹیرے ہو، میں اپنے خزانہ کی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔"

میں نے دوبارہ التجا کی۔ ایک لڑکی کھڑکی سے جھانکی۔ "یہ کوئی قسمت کا مارا ہے۔ سیلاب میں بہہ کر آیا ہے۔"
اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

میری گردن سے بندوق کی نلی ہٹا لی گئی۔ میں چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہوا۔ اندر لیمپ جل رہا تھا۔ ایک طرف آرام کرسی پر ایک بوڑھا نیم دراز تھا۔ پچکے ہوئے گال۔ ابھری ہوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ، گنجا سر۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ بید بھیانک چہرہ تھا۔ ہاتھ میں بندوق تھی کی خاموشی سے کھڑکی ہوئی تھیں۔ یہ کسی ڈرامہ کا منظر ہو سکتا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"تم صبح تک یہاں ٹھہر سکتے ہو۔"
کمرے کا سکوت ٹوٹا۔ آواز کسی قبر کی گہرائی سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ "میرا یہاں خزانہ ہے۔ دیکھو یہ زنجیر میری کمر سے بندھی ہوئی ہے اور یہ رہی بندوق۔" اس نے نلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے خزانے کی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔"

"سیلاب بہت شدید ہے تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"سیلاب ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا" بوڑھے نے بے فکری سے کہا۔ "میں نے یہ مکان سیمنٹ، بجری اور لوہے سے تیار کرایا ہے۔ ٹھیکیدار کا کہنا ہے کہ بڑا سے بڑا سیلاب بھی اوپری منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔"

مجھ میں زیادہ بات کرنے کی قوت نہ تھی۔ دانت بج رہے تھے۔ تمام جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میری حالت دیکھ کر مجھے ایک کمبل دے دیا گیا۔ میں نے خود کو اس میں لپیٹ لیا۔ لڑکی نے چائے تیار کی چائے پی کر جان میں جان آئی۔ اب مجھ پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ اچانک ایک دھماکے سے میں چونک پڑا۔

اُف! بیچ کا فرش ٹوٹ کر پانی میں جا گرا تھا۔ اب ایک طرف میں رہ گیا اور دوسری طرف وہ بوڑھا اور لڑکی لڑکی سہم کر کونے میں کھڑی ہو گئی۔

"مکار! دھاندباز ٹھیکیدار! میں تجھے دیکھ لوں گا۔ اتنے پیسے خرچ ہو گئے لیکن مکان۔ ۔ !"

ایک دھماکہ اور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ حصہ بھی ٹوٹ گیا جہاں بوڑھا بیٹھا ہوا تھا ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پانی میں گرا اور اس کے بعد اس کا کوئی نشان نہ ملا

کمرے میں مٹی کے تیل کا لیمپ بھی بجھ چکا تھا۔ لڑکی کی موجودگی کا احساس صرف اس کی آہوں سے ہوتا تھا۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ صبح ہونے کا انتظار کریں۔ ہو سکتا ہے میری گمشدگی کی اطلاع پا کر کوئی پارٹی میری تلاش میں نکلے۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی سیلاب کی شدت کچھ کم ہو گئی میں نے کھڑکی جھانکتے ہوئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ حد نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ اتنے میں فضا میں گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ فوج کا ایک ہیلی کاپٹر قریب ہی پرواز کر رہا تھا میں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

میں نے دیکھا وہ ہمارے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید کسی نے مجھے دیکھ لیا تھا مکان کے اوپر پہونچکر ہیلی کاپٹر رک گیا سیڑھی نیچے پھینکی گئی۔ پہلے لڑکی اوپر چڑھی۔ اس کے بعد میں ہیلی کاپٹر میں گھسا ہوا اندر کار ریسٹی جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔

"مجھے پتہ تھا آپ ضرور کسی نہ کسی محفوظ مقام پر ہوں گے۔" کار ریسٹی کے لہجے میں شاید طنز تھا۔

ہیلی کاپٹر ایک جگہ نیچے اترا۔ یہ سیلاب زدگان کا کیمپ تھا۔ بچے کچھے دیہی باشندے یہاں پناہ لیے ہوئے تھے کیمپ میں فوجی افسر بھی موجود تھے سب نے مجھے گھیر لیا اور میری کہانی سننے لگے

"میں نے لڑکی سے پوچھا" اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ... میں؟ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر دوڑ کر گاؤں کی بھیڑ میں چلی گئی۔" میں پانی اترنے پر واپس اپنے گھر چلی جاؤں گی سیلاب اور طوفان تو آتے ہی رہتے ہیں ہم اپنا گھر تو نہیں چھوڑ سکتے ـ ـ ـ

دل اور دماغ

ایڈتھ سٹ ویل
محمد سلیم الرحمان

شیر نے شیرنی سے کہا "جب تم عنبریں خاک ہو جاؤ گی
سورج کی حدت کی طرح دھڑ دھڑ جلتی آگ نہیں رہو گی
(چاہت نہیں بلکہ ہنٹ ہوس)
اس وقت بھی عنبریں لہو اور ہاڑ کا پھولنا پھلنا یاد رکھنا
چمکیلے رگ پٹھوں کا سمندر کی طرح ہلکورے لینا
چمکیلے پنجوں کے گلگوں خارچے یاد رکھنا
گو ہم اب ہرگز جفت نہ ہوں گے
تا وقتیکہ اس سورج دل اور چاند جیسی ٹھنڈی ہڈی کی آگ یک جان نہ ہو جائے"

وقت کے رستے میں پڑے ڈھانچے نے کہا
"یہ عظیم زریں سیارہ جو سورج کی باقی حدت ہے
تمام سونے سے زیادہ عظیم ہے، اس گیہواں شیر
کے بدن سے زیادہ زور آور ہے جسے آگ نے بھسم کر دیا ہے
جیسے وہ ہر اگنے اور کلیلیں بھرنے والی چیز کو بھسم کر دیتی ہے ..... اسی طرح دل بھی
تمام مٹی سے زیادہ زور آور ہے، کبھی میں ہرکولیز تھا
یا سیمسن، سمندر کے ستونوں جتنا مضبوط!
مگر دل کے شعلوں نے مجھے بھسم کر دیا اور دماغ تو
محض ایک باؤلی ہوا ہے"

سورج نے چاند سے کہا "جب تم بس ایک تنہا سفید ڈھڈو بن کر رہ جاؤ گے
اور میں اندھیرے جنگل میں کہیں پر ایک مردہ بادشاہ اپنی سنہری زرہ بکتر ڈالے
تو ہماری اس ترا س محبت کے بارے میں بس اتنا یاد رکھنا
کہ دل کی آگ اور دماغ کی آگ ہرگز یک جان نہ ہو گی
جب تک کہ خود وقت ہی ختم نہ ہو جائے"

رابنسن جیفرز
محمد سلیم الرحمان

سنگ تراشوں کے نام

سنگ تراش، مرمر اٹھائے وقت سے جنگ کرتے ہوئے
اے نسیان کو للکارنے والو، جو پہلے ہی بازی ہار چکے ہو
تم جلی بھنی کملیاں کھاتے ہو کہ یہ جانتے ہو
کہ پتھر تڑخ جائے گا، آثار ڈھے جائیں گے
جو کھونٹے رومی حروف برف پگھلنے کی رت میں
پتری پتری ہو کے جھڑ جائیں گے، بارش سے گھس لپس کر اُڑ جائیں گے
اسی طرح شاعر بھی استہزا بھرے انداز میں اپنی یادگار تعمیر کرتا ہے
کیونکہ انسان تلپٹ ہو جائے گا، یہ ہشاش بشاش دنیا مٹ جائے گی
بہادر سورج، اپنے دل تک کوئلہ ہو کر
اپنا نور گنوا کر، مر جائے گا
پھر بھی پتھر ہزار ہزار برس تک کھڑے رہے ہیں
اور دکھی سوچوں کو پرانی نظموں میں امن چین کا شہد ملا ہے۔

پشتو شاعر

خوشحال خاں خٹک

منظومات

بڑھ کے عنبر سے ہے یہ خاک وطن — گرم پانی بھی ہے اس کا خوشگوار
عود و صندل اس کے بوٹے ہیں مجھے — خشک مٹی اس کی ہے مشک تتار
لوگ کہتے ہیں جنھیں پتھر فقط — میری نظروں میں ہیں در شہوار
سب سے اچھی ہے پشاور کی زمیں — بس رہے ہیں جس میں میرے دوست یار
گرچہ بھارت کی چنبیلی خوب ہے — مجھ کو پیارے ہیں وطن اپنے کے خار

قدر کیا جانے اکوڑے کی کوئی
مجھ کو ہے فرخار[1] پہ اپنا دریا

○

میں ہوں شہباز کوہستان روہ[2] کا — اڑانیں میری لا حاصل نہیں ہیں
میں اپنے صید پر جھپٹوں گا جس دم — اچک لوں گا اسے شہباز بن کر
اڑوں گا اور اوپر اور اوپر — جھپٹتا اور اڑتا ہی رہوں گا

---

[1] ترکستان کا ایک حسن خیز شہر [2] روہیلوں یعنی پٹھانوں کا وطن

سوالی

(صفحہ ۲۷ سے آگے)

کرامت نے چودہ سالہ لڑکی مہر منی کو بیوی بنا لیا ہے تو اس پرانی شادی کی یاد تازہ ہو گئی۔

میں یونہی اسد کے بارے میں سوچتا چلا گیا۔ اس چھوٹی سی لڑکی نے جب اپنی شادی کے بارے میں سوچا ہوگا تو کیسے اس کے تن من میں پھلجھڑیاں سی چھوٹی ہوں گی۔ سکھیاں، سہیلیاں اسے چھیڑتی ہوں گی۔ تو وہ شرم سے دوہری ہو جاتی ہوگی۔ اس کے ذہن میں شوہر کا تصور کیا ہوگا ــــ ایک نوجوان، بانکا۔ سجیلا سا مالک کار، یا پھر بلا ادھیڑ عمر انسان! یقیناً اس کے سپنے کچھ اور ہی ہوں گے۔ اس نے پریم کے، تارگی اور سکھ کے سپنے دیکھے ہوں گے

میں نے مہر منی کے بارے میں سوچا۔ وہ سہاگ رات کے اپنے کمرے میں جب اپنے دولہا کو دیکھے گی تو اس پر کیا بیتے گی! کنک بہار اور مہر منی کیا بات کریں گے۔ میں نے اپنے آپ ہی مہر منی کے سوال کی تعبیر ڈھونڈھنا شروع کی۔ تصور میں ہم نے صوبیدار کو اپنی دلہن سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔ کنک بہار نے کتنے ملتجیانہ لہجہ میں کہا "میری رانی!"... اور مہر منی کے ذہن میں بچپن کی یادیں کوندھ گئیں۔ ریت کے گھروندے بنائے اور کھیلتے کھیلتے اسے پردیسی کے لڑکے نے رانی کہا تھا اور وہ خود راجہ بنا تھا۔ وہ کھیل کتنا پیارا تھا اور وہ لہجہ کتنا نرم تھا... لیکن اس وقت ایک بوڑھے کا کھیل اسے قطعی اجپاز لگا۔

پگلا

(صفحہ ۶۶ سے آگے)

گاؤں والے تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھے پھر گرم دودھ کا پیالہ دے کر چلے گئے۔ امینہ گھر کے کام میں الجھی ہوئی تھی۔ گڈاسے پانی نکال کر شوہر کو پلا رہی تھی۔ دوسرے دن دوپہر تک وہ ادھر جا ہی نہ سکی اور نہ کسی نے جناب علی کا حال پوچھا۔ اسے تو اتنا بھی یاد نہ رہا کہ جوڈ اکثر اس کے شوہر کو دیکھنے آیا تھا اسے جناب علی کی طرف بھیج دے۔

ایک ۔ت اور ایک دن اسی جگہ پڑے جناب علی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یوں تو ہر آدمی اس دنیا میں اکیلا آتا ہے اور اکیلا چلا جاتا ہے لیکن جناب علی تو یہاں رہا بھی اکیلا ہی۔

جب اس کے مرنے کی خبر امینہ کے سسرال والوں کو ہوئی تو سبھی نے کہا اس آدمی نے خواہ مخواہ جان دی۔ امینہ کے شوہر کی حالت سنبھل چلی تھی۔ اس نے بھی سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ اس نے کہا "اگر اس کا کوئی نہیں ہے تو لاش گاؤں بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں کسی کو چار پانچ روپے دے دیتے ہیں، دفنا دے گا۔"

امینہ کے شوہر نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے نقیرہ بھائی کو جو اس گاؤں کا ایک مزدور تھا، پورے پانچ روپے دے دیئے۔ حالانکہ جو داب جناب علی نے ناریل کے درخت سے آنے سے تھے ان کی مزدوری پانچ آنا بھی نہ تھی۔

••

Monthly News Magazine
Mu'allim E-Urdu
A Journalist Publication's

Sep. 1983
V No. II—S No. 10
Regd L N L. W./N.P.—367

Registerd with the Registrar of News papers for India at R. N. 38959/81

Published by Izhar Ahmad, Editor, Printer, Publisher and Prop. at the Nami Press, Lucknow, and distributed from Journalists Publications, 300/19 Ramadhin Singh Road Lucknow-7 Phone 33609

only cover Printed at Chowdhry Press Gwynne Road, Lucknow Phone : 47786

PRICE Per copy Rs. 2-00 Annual : Rs. 20-00